باتیں ملاقاتیں

ناول

مکمل ناول

افسانے

ناولٹ

افسانے

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری
پاکستان (سالانہ)......720 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ......5000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا......6000 روپے

انتخابِ خاص

رنگِ کائنات

دوشیزہ میگزین

پبلشر: منزہ سہام نے سٹی پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: سٹی OB-7 تالپور روڈ۔ کراچی
Phone : 021-35893121 - 35893122
Email : pearlpublications@hotmail.com

بلیک ڈے

سال جب اپنا دامن سمیٹتا ہے تو یادیں اپنے پنکھ پھیلا لیتی ہیں۔
دھیمی دھیمی، خنک ہوائیں، گلابی جاڑے......
جی چاہتا ہے کہ گرم بلینکٹ، لحاف، دُلائیاں، کھیس ہوں۔ مونگ پھلیاں، چلغوزے، کاجو سامنے دھرے ہوں اور موسم کا لطف لیا جائے۔
ایسے میں اگر سردیاں ہوں اور وہ بھی Interior کی...... مگر ابھی اسکول بند نہیں ہوئے تھے۔ موسم سرما کی تعطیلات تو 20 دسمبر سے ہی ہونا تھیں۔ فقط چار ہی دن تو باقی تھے۔
16 دسمبر کا سورج طلوع ہوا......
میرے ملک کے خوبصورت ترین لوگ اس سرزمین (پشاور) کے باسی ہیں۔ ننھے ننھے معصوم گل، خستہ گل (گلاب کے پھول) ننھے ننھے قدموں سے آرمی پبلک اسکول کا رستہ ناپتے رواں دواں تھے۔ تازہ تازہ مسیں بھیگتے معصوم بھی اور ذمہ دار اساتذہ مع مکمل عملہ، اسکول کو رونق بخش چکے تھے۔ معمول کے عین مطابق سب کچھ چل رہا تھا کہ اچانک......
اس سے آگے لکھتے ہوئے قلم تک کانپ رہا ہے، میں تو بہت کم حوصلہ انسان ہوں۔
16 دسمبر کا دن، پاکستان ہی نہیں پوری دنیا کے ماتھے پر Black Day کا جھومر سجا گیا۔ اس عظیم سانحے پر صرف ایک شعر میرے جذبات کا امین ہے۔

ظالمو! کچھ تو فرق رہنے دو
درس گاہوں میں قتل گاہوں میں

کاشی چوہان

زادِ راہ

لاتعداد آیات ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ انسان اولاد کی محبت میں احکاماتِ الٰہی اور صالح اعمال کی طرف سے غافل ہو جاتا ہے جو مالکِ حقیقی سے دوری کا سبب بھی بن سکتا ہے اور عام طور پر دنیا کے حالات پر نظر ڈال کر بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ......

زندگی کو آسان' باعمل اور ایمان افروز بنانے کا روشن سلسلہ

ہر انسان کی زندگی میں ایک وقت ایسا آتا ہے جب مالک حقیقی اس کے ہاتھ میں قلم دے کر فرما دیتا ہے کہ تو خود اپنے صفحہ تقدیر پر جو دل چاہے' رقم کرلے اور یہ وقت وہ ہوتا ہے جب اس کے والدین یا ان دونوں میں سے کوئی ایک ضعیفی کی عمر کو پہنچ کر اس کے ساتھ ہوتے ہیں اور وہ محبت اور شفقت کے ساتھ انہیں وہ سب لوٹاتا ہے جو خود اپنی مجبوری' لاچاری اور کم سنی کی عمر میں ان سے پا چکا ہوتا ہے۔ بالفاظ دیگر ایک بچے کو باشعور انسان بنانے کا مشکل ترین کام والدین ہی سرانجام دیتے ہیں اور یہ عمر اس انسان کی انتہائی مجبوری و بے بسی کی عمر ہوتی ہے' جب بچہ اپنی تکلیف بتا نہیں سکتا' اپنی کسی بھی ضرورت کا اظہار نہیں کر سکتا' ایسے میں صرف ماں اور باپ ہی وہ رشتہ ہوتے ہیں جو اس کی ہر کیفیت کو محسوس کر لیتے ہیں' بچہ اپنی بھوک پیاس کا اظہار نہیں کر سکتا مگر اسے وقت پر غذا ملتی ہے' وہ سردی یا گرمی کی شکایت کرنے کے قابل نہیں ہوتا مگر اسے ہر موسم میں موسم کی شدت سے بچایا جاتا ہے' وہ خطرے کو محسوس کرنے کے قابل نہیں ہوتا مگر اس کے والدین خود کو ہر خطرے میں ڈال کر اس کی حفاظت کرتے ہیں۔ بچہ اپنے حال اور مستقبل سے بے خبر و لاعلم ہوتا ہے لیکن والدین اس کے حال کو بہتر بنانے کے لیے اپنا حال خراب کر لیتے ہیں اور صرف اس کا مستقبل سنوارنے کے لیے اپنی ہر خواہش کو دبا دیتے ہیں صرف اس آرزو میں کہ یہ ایک بہتر انسان بن جائے۔ اس احسان کا زبانی اور عملی اعتراف کرنے والی اولاد کو اپنی دنیا اور آخرت سنوارنے کے لیے پھر کسی اور عمل کی ضرورت باقی نہیں رہتی کیونکہ اول تو اپنے والدین کی اطاعت اور خدمت کرنے والا انسان (بیٹی یا بیٹا) کہیں بھی' کسی بھی اچھے کام کو نظر انداز نہیں کر سکتا بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی اسے اچھے کام کی توفیق ملتی رہتی ہے۔ دوسرے انسانی تمام تر رشتوں میں صرف اور صرف یہی رشتہ ہے جس کے حقوق و اطاعت اور خدمت و محبت کے لیے خود مالک حقیقی نے متعدد احکامات صادر فرمائے ہیں اور اگر دیکھا جائے تو حکم سے زیادہ اس بات کی اہمیت

ہوتی ہے کہ حکم کب اور کس موقع پر جاری کیا گیا ہے اگر اس روشنی میں غور کیا جائے اور والدین کے حقوق کا اندازہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ قرآن پاک میں جہاں جہاں اللہ تعالیٰ نے اپنی وحدانیت کا اعلان فرمایا ہے وہاں وہاں والدین کی اطاعت کرنے کا حکم دیا ہے گویا کہ انسان کے لیے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو تسلیم کرنے کے بعد پہلی عبادت ہی والدین کی اطاعت ہے۔ قرآن پاک میں کوئی مقام بھی ایسا نہیں ہے جہاں باری تعالیٰ نے اپنی وحدانیت بیان کی ہو اور والدین کی اطاعت کا ذکر نہ کیا ہو۔ سورۃ لقمان میں ارشاد ربانی ہے۔

''اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا' حق یہ ہے کہ شرک بہت بڑا ظلم ہے' ہم نے انسان کو اس کے ماں باپ کے بارے میں تاکید کی' اس کی ماں نے ضعف پر ضعف اٹھا کر اسے پیٹ میں رکھا' تکلیف سے جنم دیا اور دو برس رضاعت کی' پس تم میری اور اپنے والدین کی شکر گزاری کیا کرو۔'' (سورۃ لقمان: 14)

گویا کہ توحید کے بعد سب سے بہترین عمل والدین کی خدمت واطاعت ہے اور حقیقت یہ ہے کہ سب سے بڑھ کر احسان اور ایثار کرنے' خود کو تکلیف میں ڈال کر راحت پہنچانے والا رشتہ اگر کوئی ہے تو والدین ہی کا ہے' یہ وہی ہیں جو اپنی بنیادی اور اہم ترین ضروریات کو بھی اولاد کی خواہشات پر قربان کر دیتے ہیں' خود بھوکے رہ کر اولاد کو کھلا دیتے ہیں' خود تکلیف اٹھا کر اسے آرام اور راحت دیتے ہیں اور بعض اوقات مفلسی اور غربت کی شدید اذیتیں اٹھا کر بھی اس کے آرام کا انتظام کرتے ہیں بلکہ اگر ذرا سا غور کیا جائے تو میرا یہ کہہ دینا غلط نہیں ہے کہ انسان بہت سارے ناجائز کام محض اپنی اولاد کے مستقبل سنوارنے کے لیے ہی کرتا ہے۔ اسی لیے اولاد کو ایمان کی آزمائش اور فتنہ قرار دیا گیا ہے یا صرف دنیا کی زینت فرمایا گیا ہے اور شاید

یہی سب سے بڑی آزمائش ہے جس سے انسان والدین کے روپ میں آنے کے بعد ہی گزرتا ہے یعنی بار ہا حقوق العباد کی پامالی اور حقوق الٰہی سے بے پروائی کا سبب اولاد بن جاتی ہے' یہاں میں تاریخ سے کوئی مثال نہیں دوں گی کیونکہ اس بات کا یقین کر لینے کے لیے قرآن پاک کافی ہے۔ جس بات کی وضاحت قرآن فرما دے اس کے لیے دوسری مثالیں پیش کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ یہ حقیقت ہے کہ انسان کو والدین کی محبت جنت میں اور اولاد کی محبت جہنم میں لے جاتی ہے کیونکہ والدین کے لیے کوئی انسان ناجائز کام نہیں کرتا لیکن اپنی اولاد کے لیے بہت سارے ناجائز کام کر گزرتا ہے۔ اس کی دنیا کو سنوارنے کے لیے اپنی آخرت کو بھول جاتا ہے اور شاید اسی لیے باری تعالیٰ نے ''انما اموالکم و اولادکم فتنۃ'' فرمایا ہے۔ التغابن: 14) دوسری جگہ بڑے واضح الفاظ میں ارشاد ہوتا ہے۔

''تمہارا مال اور اولاد ایسی چیزیں نہیں ہیں کہ تم کو ہمارا مقرب بنا دیں' ہاں جو ایمان لایا' نیک عمل کرتا رہا' پس ایسے ہی لوگوں کو ان کے اعمال کے بدلے میں دوگنا بدلہ ملے گا'' (سبا: 37)

یہ اور ایسی لاتعداد آیات ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ انسان اولاد کی محبت میں احکاماتِ الٰہی اور صالح اعمال کی طرف سے غافل ہو جاتا ہے جو مالکِ حقیقی سے دوری کا سبب بھی بن سکتا ہے اور عام طور پر دنیا کے حالات پر نظر ڈال کر بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مال کمانے کی ہر کوشش اور دولت سمیٹنے کا ہر طریقہ انسان صرف اپنی اولاد کی مضبوطی اور عیش و آرام دینے کے لیے ہی اختیار کرتا ہے اور یہ سب والدین کی محبت کی انتہا ہوتی ہے۔ اب اگر وہی والدین اپنی بے بسی اور ضعیفی کے وقت میں اپنی اولاد کی توجہ اور سہارے کی ضرورت محسوس کریں اور انہیں ان کے ساتھ اور ان کی تقویت کی آرزو ہو' تب وہ اولاد ان کے لیے جو کچھ بھی

کر سکے وہ کم ہے۔ بڑی سچی بات ہے کہ انسان کو عقل اور تجربات اس وقت حاصل ہوتے ہیں جب وقت گزر جاتا ہے لہٰذا اپنے والدین کے جذبات اور کیفیات کو اس عمر سے پہلے سمجھنا مشکل ترین کام ہوتا ہے اسی لیے اللہ تعالیٰ نے والدین کے احساسات اور اولاد کے فرائض کی وضاحت خود اس طرح سے فرمائی ہے۔

''اور محبت سے خاکساری کا پہلو ان کے آگے جھکائے رکھنا اور ان کے حق میں دعا کرتے رہنا کہ اے میرے پروردگار! جس طرح انہوں نے مجھے بچپن میں پرورش کیا، جس طرح وہ میرے حال پر رحم کرتے رہے اور اسی طرح تو بھی ان پر رحم کرنا۔'' (سورہ الاسراء آیت:24) ان آیاتِ ربانی سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہی کافی نہیں کہ والدین کو ساتھ رکھ کر ان کی چند ضروریات پوری کر دی جائیں، انہیں روٹی کپڑا مہیا کر دیا جائے یا بیماری کے وقت ان کی دیکھ بھال کر لی جائے، بلکہ ان آیات سے یہ حکم ملتا ہے کہ ان سب ضروریات اور خدمت کے علاوہ ہر طرح ان کی اطاعت کے ساتھ ساتھ اللہ سے بھی ان کی بہتری اور بخشش کی دعا کرتے رہنا ضروری ہے۔ ان احکامات پر جس قدر بھی غور کیا جائے تو ایسا لگتا ہے کہ یہ باتیں صرف حکم ہی نہیں ہیں بلکہ زندگی کو بہتر بنانے کے اصول بھی ہیں جن پر عمل کرنا بہت ضروری ہے، اس سے نا صرف بزرگوں کی زندگی سہل ہو جاتی ہے بلکہ نسلوں کی تربیت کا سامان بھی ہو جاتا ہے۔ جس پر آخرت کا دارومدار ہوتا ہے اولاد کی اعلیٰ تربیت کے لیے ہر انسان کا فرض بنتا ہے کہ وہ عملی نمونہ بھی پیش کرے۔ صالح عمل میں بہترین عمل، نیکی کا بلند ترین درجہ، اطاعت الٰہی کا مکمل ترین نمونہ اور عبادات و معاملات کا حسین ترین امتزاج اگر کوئی عمل ہے تو وہ والدین کی اطاعت ہے۔ یہ دین بھی ہے اور دنیا بھی، یہ ایک طرف رضائے الٰہی اور قربِ الٰہی کا بہترین ذریعہ ہے تو دوسری طرف دنیاوی رشتوں سے تعلق کا وہ پاکیزہ نمونہ ہے جو نسلوں کی تعلیم کے لیے اَساس بن جاتا ہے۔ آج ہم جن جن اقوام کو اپنا آئیڈیل بنائے بیٹھے ہیں ہماری ترقی کی سوچ کی پہنچ جن سے آگے جاتی ہی نہیں، یہ اقوام زندگی اور دین کو جدا جدا کر کے صرف دنیاوی لحاظ سے ترقی کے قائل ہیں، شاید اس لیے کہ ان کے مذہب میں ہمہ گیری نہیں کچھ مخصوص تعلیمات ہیں، اسی لیے علم کی انتہا پر پہنچ کر بھی وہ اپنے والدین کے مسائل سے بے خبر اور ان کی خدمت و اطاعت سے محروم ہیں۔ یوں زمین کی انتہا اور آسمانوں کی بلندیوں کو چھو لینے کے باوجود یہ اقوام اپنے والدین کی ضروریات سے غافل ہیں جس کے سبب علم و عروج کے باوجود ان رشتوں کے درمیان فاصلے بڑھتے ہی جا رہے ہیں۔ غور کیا جائے تو اس معاملے میں وہ قصور وار نہیں ہیں کیونکہ ان کے پاس قرآن پاک کے احکامات کی مانند نہ واضح احکامات ہیں اور نہ اتنی مکمل ہدایات بلکہ اصل معنوں میں خطا وار وہی لوگ ہیں جنہیں قرآن جیسی مکمل ہدایت بھی ملی اور ایک کامل ترین اسوۂ حسنہ بھی مگر وہ ان چیزوں کو چھوڑ کر بے خبر لوگوں کی تقلید کرتے چل پڑے۔ جبکہ چاہیے تو ہمیں یہ تھا کہ ہم ان سب ہدایات و احکامات کا پرچار کرتے جو قرآن پاک کے ذریعے ہمارے پاس محفوظ ہیں۔ ہم دوسروں کو بھی ان مقدس رشتوں کے مقام وضروریات سے آگاہ کرتے مگر ہوا یہ کہ ہم خود بھی اس راہ سے ہٹ گئے۔ خیر سے کترانا یا بچنا ہی تو شر کو جنم دیتا ہے۔ اگر دیکھا جائے تو کوئی فرد بھی جان بوجھ کر شر اور برائی کا ارتکاب نہیں کرتا۔ بس وہ بھلائی کرنا، بھلائی کی ہدایت کرنا اور بھلائی کو رائج کرنا چھوڑ دیتا ہے تو اس کی جگہ متضاد کیفیت مضبوط ہوتی چلی جاتی ہے۔ پھر معاملے کو اختیار سے

باہر ہو جانے میں دیر نہیں لگتی اور ہمیں پتا ہی نہیں چلتا کہ ہم نے ایک نیکی ایک بھلائی اور ایک احسن کام سے غفلت برت کر کتنی بڑی برائی کو عام کر دیا ہے۔

بچہ ہر معاملے میں اپنے والدین سے عملی طور پر بہت کچھ سیکھتا ہے کہ اختلاف کے وقت والدین نے مسئلے کو حل کرنے میں شدید غصے کا اظہار کیا ہے یا باہمی مشورہ اور افہام و تفہیم کو اپنایا ہے۔ لین دین، میل ملاپ، عبادات و معاملات میں توازن، اوقات کی پابندی یہ سب باتیں اس کے ذہن میں جمتی چلی جاتی ہیں جن پر وہ جوان ہو کر لاشعوری طور پر عمل کرتا ہے لیکن یہی کافی نہیں ہوتا، بہت سی باتیں والدین کے تجربے میں آتی ہیں جن سے فیض اٹھانے کے لیے جب تک وہ حیات رہیں ان سے مشورہ کرنا خیر کا سبب بن جاتا ہے۔ کس عمل کے کیا نتائج ہوں گے؟ اور کون سے کام کا انجام کیا ہوگا؟ ظاہر ہے صحیح طریقہ اپنانے سے صحیح نتیجہ برآمد ہوگا اور غلط یا ناجائز کام کرنے سے انجام برا ہوگا، اب Choice آپ کی ہے کہ اچھا نتیجہ حاصل کرنا چاہتے ہیں یا غلط۔ حدیث شریف میں ہے کہ والدین کے چہرے پر محبت سے ایک نظر ڈالنا بھی عبادت ہے۔

اللہ تعالیٰ نے جن جن رشتوں کو ایک دوسرے سے وابستہ کیا ہے ان سے وابستگی لازمی بن جاتی ہے جو ضرورت بھی ہے اور عبادت بھی لیکن والدین کی خدمت اور اطاعت اگر ایک طرف فرض کی ادائیگی اور احکاماتِ الٰہی کی تعمیل ہے تو دوسری طرف یہی عمل اولاد کے لیے اعلیٰ ترین تربیت کی بنیاد بن جاتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس صورت میں ہی انسان حقوقِ اللہ بھی ادا کر دیتا ہے اور حقوق العباد بھی اور یہی عمل ''امر بالمعروف'' کا بہترین نمونہ ہے جس کی آج کے دور میں سب سے زیادہ ضرورت ہے۔

☆☆......☆☆

دوشیزہ کی محفل

محبتوں کا طلسم کدہ' خوب صورت رابطوں کی دلفریب محفل

خط بھجوانے کے لیے پتا: ماہنامہ دوشیزہ ڈائجسٹ۔ 88-C II خیابانِ جامی ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی
E-mail:pearlpublications@hotmail.com

بہت پیارے ساتھیو! سال 2015ء کا پہلا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ صرف ایک دعا سے نئے سال کا آغاز کریں۔

خدا! ظالموں کے شر سے ہر ذی روح کو محفوظ رکھنا۔ (آمین)

اس ماہ ہمارے دوست لکھاریوں کی کیا خبریں ہیں ملاحظہ کرتے ہیں۔

☆ ہمارے بہت پیارے قاری، لکھاری اور شاعر عادل حسین کی شادی خانہ آبادی 31 دسمبر کو انجام پائی۔

☆ ہمارے اکاؤنٹنٹ صاحب، محمد طاہر صدیقی بھی ماہِ دسمبر میں رشتہ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔

☆ ہماری ساتھی لکھاری نسیم نیازی کی نئی کتاب 'چراغ دل جلائے ہیں' منظر عام پر آ گئی ہے۔

☆ ہماری دوست لکھاری زمر نعیم کو بھتیجے، احسن اقبال کی آمد مبارک ہو۔

☆ ہماری نئی قاری ساتھی 'مسز نوید ہاشمی کے بھتیجوں بابر اور یاسر کو شادی کی پیشگی مبارکباد۔

☆ صفیہ سلطانہ مغل یکم جنوری' شمع حفیظ دو جنوری' سلمٰی غزل 5 جنوری' آسیہ اعوان 11 جنوری کو سال گرہ کی بہت بہت مبارکباد۔

☆ 16 جنوری کو ہماری ہر دلعزیز ساتھی رضوانہ کوثر کی بھانجی انعم نذیر کو شادی خانہ آبادی کی بہت بہت مبارک باد۔

☆ احمد سجاد بابر کا نعتیہ مجموعہ کلام 'ردائے شب پہ ستارہ جھلمل' منظرِ عام پر آ گیا ہے۔

☆ احمد سجاد بابر کو بیٹے کی بہت بہت مبارک باد قبول ہو۔

✉: ہماری عزیز ساتھی تسنیم منیر علوی صاحبہ دبئی سے اپنے خوبصورت تبصرے کے ساتھ ہمارے ساتھ ہیں۔ لکھتی ہیں، کاشی بیٹے بہت سی دعاؤں کے ساتھ محبتوں بھرا اسلام قبول ہو۔ تمہارا اداریہ 'لاج' پڑھ کر بھی بے حس قوم کو لاج نہ آئی ہوگی کیونکہ وہ کیا ہے کہ کسی نے خوب کہا ہے روٹی، کپڑا اور مکان' تین خدا اور ایک انسان۔ یہ بات ہم تواتر سے کہہ چکے ہیں کہ ہمیں پرچہ ایک مہینے کی تاخیر سے ملتا ہے بعض دفعہ دل چاہتے ہوئے بھی تبصرے سے محروم رہ جاتے ہیں۔ بہر حال تم اس کا اہتمام کر دیتے ہو کہ تاخیر ہوئی تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا۔ اللہ تمہارا بھلا کرے۔ نیا سال مبارک، کسی نے خوب کہا کہ

اُس کو شکوہ تھا سرد راتوں کا
میں محبت کی شال دے آیا

تو دوسری طرف کسی دل جلے نے فرمایا کہ

ایک اینٹ گر گئی دیوارِ زندگی سے
نادان کہہ رہے ہیں نیا سال مبارک

اپنا اپنا خیال ہے دردانہ نوشین ہم ہمیشہ سے تمہاری تحریر کے مداح ہیں اور اب تو 'مکتوب' کے بھی ہوئے۔ تبصرہ بھی کسی شاہکار سے کم نہیں۔ کاش ہم لوگ بھی کبھی مل بیٹھتے اور خوب خوب باتیں کرتے۔ تقریب ایوارڈ میں ملاقات بہت 'ہلچل' والی تھی۔ کچھ کو ناؤ نوش کی فکر دامن گیر تھی۔ کسی کو تصویر بتاں پریشان کر رہی تھی اور کچھ ہمارے دیوانے اِدھر اُدھر ڈولتے رابطے کے لیے نمبر لیتے پھر رہے تھے۔ مگر افسوس ہمارے موبائل نے ایسی دغا دی کہ پاکستان میں اس نے چل کر ہی نہ دیا۔ اسی لیے وہ محنت رایگاں گئی۔ نگہت اعظمیٰ کا شکوہ بجا مگر کیا کیا جائے اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں، دل کی ڈکشنری بہت پاورفل ہوتی ہے۔ کبھی گرد پڑتی ہے تو دھندلا جاتی ہے۔ ذرا جھاڑ پھونک کے بعد دوبارہ سے تروتازہ ہو کر آنکھیں جھپکانے لگتی ہے۔ ہمارے خیال میں زندگی میں سب کے ساتھ کبھی نہ کبھی ایسا ہو جاتا ہے۔ دل کی باتیں دلشاد نسیم ہمیشہ دل سے کرتی ہیں اس لیے 'دل' کو لگتی ہیں۔ رضیہ مہدی ایک معتبر نام، بہت اچھا لکھا۔ پروین شاکر کی ورکنگ وومین یاد آئی اور ساتھ ہی ساتھ ثروت زہرہ کی 'ورکنگ لیڈی' نگاہوں میں گھوم گئی۔

میں خود کو نہ جانے کہاں بھول آئی
میں کی بورڈ پر انگلیاں چھوڑ آئی

رضیہ کی تحریر ہمیشہ چونکا دینے والی اور بھرپور ہوتی ہے۔ بس ذرا سجاد بابر صاحب کی بھی نگاہ نوازش بھی ہو جائے تو بات بن جائے۔ ناول اور تمام سلسلے وار سلسلے، خاتمہ بالخیر پر ہی انشاء اللہ تبصرہ بھی کریں گے۔ گو کہ ناولٹ پڑھنا ایک جوئے شیر لانے سے کم نہیں دلچسپ اور اثر انگیز پر تو پتا نہیں چلتا کب ختم ہو گیا ورنہ، بڑا مشکل ہے اس کو ختم کرنا۔ صائمہ حیدر کا مریم فاطمہ نے ایک اچھا تاثر چھوڑا۔ سنبل کی طرح نازک، محبت اعزاز ہے ایک

اطلاعِ عام

قارئین سے گزارش ہے کہ اپنی نگارشات اور خطوط بھیجنے کے لیے ہمارا نیا پتا نوٹ فرمالیں اور آئندہ خط و کتابت اسی پتے پر ممکن بنائیں۔

88-C II۔ خیابانِ جامی۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز۔ 7، کراچی

فون نمبرز: 35893122 - 021-35893121

حساس موضوع لیے تشریف لائیں اور دل کو چھو گیا۔ واقعی محبت کا ہی فسوں و سحر ہوتا ہے، ورنہ ہم کیا ہماری بساط کیا، صدف آصف کے افسانے کی بنیاد شک تھی۔ یہ بھی اچھا ہوا کہ دیر سے ہی سہی مگر مہرین کی آنکھیں کھل گئیں۔ عارف شین روہیلہ کا افسانہ ایک سمجھ دار مگر چالاک عورت کا فسانہ تھا۔ دو چالاک ایک جگہ جمع ہو کر ایک عمر رسیدہ عورت کو چکمہ نہ دے سکے۔ یہ ہوئی ناں بات زین کے چٹخارے سے لبریز جواب یقیناً لوگ انجوائے کر رہے ہوں گے۔ محمد حامد سراج صاحب کی چائے کی پیالی نے دودھ پتی کو پیچھے چھوڑ دیا۔ بعض دفعہ من میں جلی لالٹین کی لو نیچی کرنے سے اطراف کا ماحول واضح ہو جاتا ہے۔ بہت خوب...... اور ہاں سنبل تمہارا جملہ شاید سارے لکھاریوں کی دل کی آواز ہے جس میں ہم ناچیز بھی شامل ہیں کہ ہم لوگ نا قابلِ اشاعت کی فہرست میں شامل ہو گئے ہیں۔ اب اجازت پھر ملیں گے اگر زندگی لائی۔ ہمیں دعاؤں میں یاد رکھیں۔ رخسانہ منزہ اور دانیال سب کو سلام۔

ﷺ: عزیز تسنیم جی! سلامت رہیے، ہمارا شعر 'محبت کی شال دے آیا' کوٹ کرنے کا بہت شکریہ۔ تبصرہ بے مثال اور تحریر شاندار، میں نے بچپن سے اپنی ماں کو تبرک کو بہت سنبھال سنبھال کر استعمال کرتے دیکھا ہے اور آپ کی تحریر کیا تبرک سے کم ہے؟ انشاء اللہ بہت جلد سارے گلے دور ہو جائیں گے۔

✉: کراچی سے یہ آمد ہے مومنہ بتول کی۔ لکھتی ہیں، ماہِ نومبر کا شمارہ ملا سرورق پر شائع شدہ تصویر بہت اچھی لگی۔ سادگی میں پُرکاری، اسی متوازن صورتِ حال پر کہتے ہیں۔ آپ کی ریحانہ خالہ کا پڑھ کر افسوس ہوا۔ خدا مرحومہ کو جنت مکانی کرے اور آپ کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین۔ رضیہ مہدی صاحبہ کے بھائی اور اُم مریم کے ماموں کے لیے بھی لب دعا گو ہیں۔ دلشاد نسیم صاحبہ اور زمر نعیم کو سال گرہ مبارک۔ اب آتی ہوں محفل کی طرف، تمام بہنوں بھائیوں کو سلام محبت، عادل حسین کراچی کا جامع تبصرہ اچھا لگا۔ اُن کا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں کہ انہوں نے مجھ ناچیز کو یاد رکھا اور ہمت بندھائی، دردانہ نوشین خان، رضوانہ کوثر، احمد سجاد بابر، سنبل، صائمہ حیدر، عقیلہ حق اور دیگر ناہید جی ثمینہ عرفان صاحبہ کو سلام محبت۔ اِن لوگوں کے تبصرے جاندار اور جامع تھے، پڑھ کر لطف دوبالا ہو گیا۔ اچھا جی کاشی صاحب سب سے پہلے مبارک باد وصول کریں اتنا خوبصورت جامع اور دلفریب پرچہ دینے پر، جس میں آپ کی محنت شامل ہے۔ خدا کرے زورِ قلم اور زیادہ، اللہ آپ کو مزید اچھا پرچہ دینے کی صلاحیت عطا فرمائے۔ ہر سلسلہ، ہر مرحلہ بہت مکمل ہے۔ جس کو مکمل پڑھ لینے کے بعد طبیعت سیر ہو جاتی ہے۔ ابھی افسانے اتنی جلدی پڑھ نہیں سکی مگر چائے کی پیالی اور مہنگا سودا طبیعت کو بشاش کر گئیں۔ اب اعتبار آیا میں صدف آصف صاحبہ نے بہت ہلکے پھلکے انداز میں نئی ازدواجی زندگی میں قدم رکھنے والی بہنوں کی برین واشنگ کی ہے۔ کاش نوعمر بچیاں اس کا مقصد گرہ میں باندھ لیں میرے پرندۂ دل میں نعمان اسحٰق صاحب متاثر نہ کر سکے۔ باقی پڑھ نہیں سکی انشاء اللہ پھر ملاقات ہو گی۔ میں نے غزل بھی ارسال کی تھی اُس کے بارے میں بھی بتا دیں۔

ﷺ: مومنہ جی! سلامت رہیے، غزل اِس ماہ شاملِ اشاعت ہے اور آپ کا تبصرہ اچھا لگا مگر اتنا مختصر...... اگلے ماہ تفصیلی تبصرہ چاہیے۔ یہ ہمارا حکم سمجھ لیں۔

✉: تلمبہ، میاں چنوں سے محفل میں یہ آمد ہے ہماری نئی ساتھی اُم جلال بخاری کی عرض کرتی ہیں، پیاری بیٹی منزہ اور میرا محنتی ٹیلنٹڈ بچہ کاشی! اللہ تم لوگوں کی عمر دراز فرمائے اور محنت قبول کر کے تم لوگوں کو بہت بہت عزت، شہرت، روزی، رزق اور صحت و تندرستی عطا فرمائے۔ یہ میرے سچے دل کی دلی دعائیں ہیں۔ دردانہ

دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ

دسمبر 2014 کا نتیجہ: قارئین نے مندرجہ ذیل تحریر کو پسند کیا ہے

''کلائمیکس'' ابنِ آس محمد

آپ کی نظر میں اس ماہ ''دوشیزہ'' کی بہترین تحریر کون سی ہے؟

دوشیزہ جنوری 2015

عنوان: ____________

قلم کار: ____________

نام: ____________

پتا: ____________
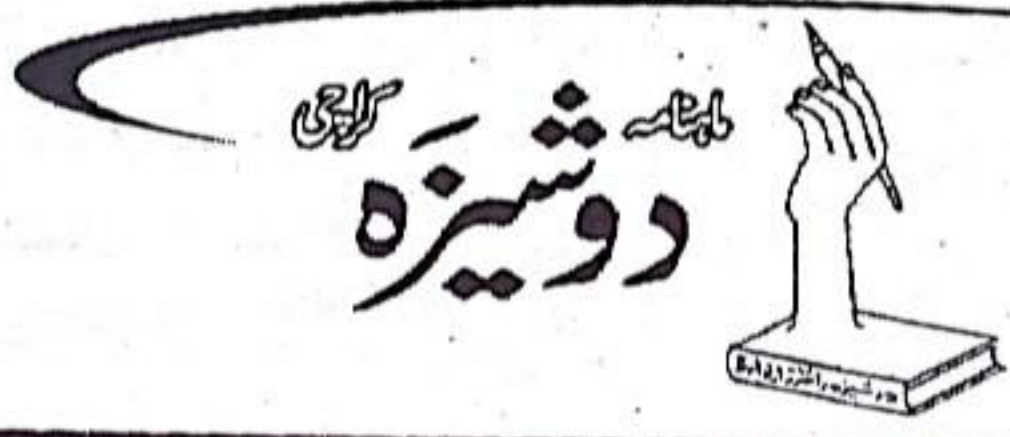
نوشین خان مظفر گڑھ کا بے انتہا شکر یہ کہ انہوں نے دوشیزہ سے متعارف کروایا ہی نہیں اپنے پاس سے شمارے بھیجے۔ میں زندگی بھر اُن کی ممنون احسان رہوں گی کہ انہوں نے بہت کچھ میرے لیے بھیجا۔ میرے ذوق کی تسکین کے لیے، ہمارے گاؤں یا قصبہ تلمبہ میں یہ جریدے میسر نہیں ہیں۔ سچی کہانیاں، عبدالعزیز جی آ بھائی اپنی کہانیوں کے حوالے سے بتاتے رہے۔ ایک اپنی کہانی والا شمارہ بھیجا بھی۔ اُکساتے رہے۔ مگر جو قدم ٹھوس اور پائیدار عبدالغفار عابد چیچہ وطنی نے اٹھایا ہے، اُس نے مجھے ہمیشہ کے لیے خرید لیا ہے۔ میری غذا، میری روح، میری زندگی کتاب ہے۔ میری کوئی دوست نہیں، سوائے کتاب کے۔ یہ میرا اوڑھنا بچھونا ہے۔ محاورتاً نہیں حقیقتاً، ان لوگوں کی میں مقروض ہوں۔ اس لیے ان سطور میں ان لوگوں کا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں۔ پلیز آپ سے گزارش ہے کہ آپ یہ سطور بالکل اسی طرح ضرور شامل کرنا۔ پہلے میں نے سوچا کوئی اپنی آمد کا اعلان شوخ انداز سے کرتے ہیں کوئی ڈھول ڈھمکا کر کے، کوئی توتی باجا بجا کے، مگر پھر ڈر گئے۔ ارے سب اتنے بڑے بڑے لوگ براجمان ہیں خطوط کی محفل میں، وہ یہ کہیں گے، ہائے ہائے یہ کون آ گئی۔ اس لیے سوبر بن کر آ رہے ہیں۔ مزاح اور مذاق کسی عمر میں بھی بُرا نہیں ہوتا۔ مگر موقع محل دیکھ کر کیا جائے تو لطف آتا ہے، اچھا لگتا ہے۔ اب آتے ہیں تبصرے کی طرف، صرف اکتوبر کے شمارے پر۔ ارے واہ! کیا رونق ہے، کیا بہار ہے۔ باغ ہے اور ہر پھول اپنی اپنی خوشبو دے رہا ہے۔ اپنا اپنا لہجہ، اپنی اپنی گفتار، اپنا اپنا رنگ، دل خوش ہو گیا ہے۔ باری باری سب سے تعارف لیتے ہیں۔ پیاری شمسہ فیصل بیٹے کی مبارکباد قبول کریں۔ پیاری عقیلہ حق ایوارڈ تقریب میں دیکھا۔ ہائے ظالم، چشم قاتل چشم آہو، ارے یاران موٹی موٹی آنکھوں کو کیا کہوں۔ کیسے ان کا حق ادا کروں۔ اللہ ان سوہنی انکھیوں کو سلامت رکھے۔ اور انکھیوں والی کو بھی۔ اللہ تعالیٰ تمہارے بھانجے ارسلان اختر کو صحت کاملہ عطا فرمائے اور عمر دراز کرے۔ غزالہ جلیل راؤ نئے ناول کی مبارکباد۔ افسر سلطانہ کو میری طرف سے حج کی دلی مبارکباد۔ رضوانہ کوثر حسن جمال کی سالگرہ مبارک، فصیحہ آصف شاعری پر ایوارڈ پر مبارکباد۔ ارے شمع حفیظ دوشیزہ میں تمہارا خط پڑھ کر بے حد خوشی ہوں۔ تبصرہ بہت جاندار کیا ہے۔ سنبل کا تفصیلی تبصرہ اور خط مزے دے گیا۔ لودھراں سے احمد سجاد بابر لکھتے ہیں۔ تبصرہ جو شروع ہوا ہے تو ماشاء اللہ خود بھی قلمکار ہیں۔ مگران کے مزاج کی عاجزی بہت اچھی لگی۔ عادل حسین نیئر رضاوی، مسز نوید ہاشمی، روبینہ شاہین حمیرا خان، فصیحہ آصف خان، نسیم سحر، تسنیم منیر علوی، مومنہ بتول، سب سے سلام ودعا تفصیلی گفتگو پھر کبھی۔ فرح عالم، نیئر شفقت، عائشہ کا آنا یوں اچھا لگا جیسے میری نور۔ آخر میں یہ محفل اختتام کو پہنچی شاہانہ اشتیاق پر، جو میری طرح پہلی بار شریک ہوئی ہیں۔ یہ میری پہلی انٹری ہے۔ بہنوں اور بھائیوں کی طرف سے خوش آمدید کا انتظار رہے گا۔ محفل تمام ہوئی تو آگے کا سفر شروع کیا۔ دلشاد نسیم میری فیورٹ رائٹرز میں سے ہیں۔ منی اسکرین سے نظر بچا کے گزر گئے کیونکہ گھر میں T.V نہیں ہے۔ فہیم برنی کا انٹرویو اچھا لگا کیونکہ مجھے انٹرویو اچھے لگتے ہیں۔ بینا عالیہ منجھی ہوئی قلمکار ہیں، ابھی دو تین قسطیں پڑھی ہیں۔ بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ مجھے ماہین اور عمار علی کے کردار بہت پسند ہیں۔ کیونکہ اپنی عمر کے حساب سے جو سوچ رہی ہے وہ اپنی جگہ بالکل درست ہے۔ 'میٹرو بس' میری جانِ جاں کی کہانی، ارے آپ کا انداز تو بالکل میرے جیسا ہی ہے۔ میری 'آداب عرض' میں اور 'ریشم' میں تقریباً جو کہانیاں چھپی ہیں۔ دیہاتی زندگی جس میں زینت کا کردار، یہ بالکل حقیقت پر مبنی افسانہ تھا۔ بہت پسند آیا۔ مینا تاج کو میں نے پہلے کہیں

سانحہ ارتحال

ہماری ہر دلعزیز لکھاری دلشاد نسیم اور نگہت نسیم گزشتہ ماہ عظیم سانحے سے دوچار ہوئیں۔ اُن کی والدہ رقیہ بیگم اپنے خالقِ حقیقی سے جاملیں۔ ادارہ پرل پبلی کیشنز دکھ کی اِن گھڑیوں میں اِن کے ساتھ ہے۔ اور مرحومہ کے اعلیٰ درجات اور لواحقین کے صبر کی دعا کرتا ہے۔

نہیں پڑھا پہلی بار انہیں پڑھا۔ اُم مریم فرحت عباس کی شاعری جس میں درویشانہ رنگ اُن کی پہچان، تمہارے ناول رحمٰن، رحیم سدا سائیں اس ناول کا تھیم یہی ہے۔ فصیحہ کا کالا جوتا غربت کے منہ پر جوتا ہے، جہاں چھوٹی چھوٹی خواہشوں کے لیے ترسنا پڑتا ہے۔ جوزی کی ایمانداری اچھی لگی۔ جبھی تو انجلی کی خواہش پوری ہوئی۔ ایسے ہی ہلکے پھلکے موضوعات پر لکھتے رہیے۔ میرے پرندۂ دل کا اینڈ بہت اچھا لگا۔ فرزانہ آغا کا اندازِ تحریر اور مکمل ناول رسالے کی جان تھا۔ باقی شمارہ ابھی زیرِ مطالعہ ہے۔

✉: اُم جلال بخاری کی سب سے پہلے اگست کے شمارے سے جان پہچان پر جو تحریر موصول ہوئی وہ بھی قارئین کے روبرو کرتے چلیں۔ اگست کا دوشیزہ مجھے دردانہ نوشین بہن نے کسی کے ذمے لگا کر لاہور سے بھجوایا۔ کیونکہ مجھے آپ سب لوگوں کو ایوارڈ تقریب میں دیکھنا تھا۔ نظر نہ لگے۔ منزہ تمہیں اللہ تمہارا نگہبان ہو۔ سب مصنفات دیگر پرچوں کے حوالے سے تقریباً جانی پہچانی تھیں۔ رضیہ مہدی، رفعت سراج، شگفتہ شفیق، رضوانہ پرنس، مگر جو دکھ اور خوشی کی ملی جلی کیفیت فاطمہ ثریا بجیا کو دیکھ کر ہوئی بیان نہیں کرسکتی۔ دُکھ اُن کے کمزور وجود کو دیکھ کر ہوا۔ یہ بالکل میری والدہ کی ہمشکل ہیں۔ ایوارڈ لیتے ہوئے سب تو خوش تھے۔ مگر سب سے زیادہ جسے دیکھ کر مجھے پیار آیا۔ کھلے جارہے ہیں صاحبزادے، آنکھیں جگر جگر کرتی اندرونی خوشی کو اُجاگر کررہی ہیں۔ کیا پیاری مسکراہٹ، جیسے بچے سارے کنچے جیت کے جگمگاتی آنکھوں سے دوسروں کو فاتحانہ دیکھ رہے ہوں۔ بھئی تمہارا حق بنتا ہے، اتنی محنت کی۔ معیار بنایا اور ان پرچوں کی ترقی کے لیے روز بروز معیاری تحریریں وصول کرنا، پڑھنا، منتخب کرنا، ویلڈن کاشی مجھے تم اپنی موہنی سی صورت کے ساتھ عزیزم جلال حیدر کی طرح لگے۔ اللہ تمہارے عزائم مزید بلند رکھے (آمین) اور تمہیں کامیابیاں نصیب ہوں (آمین)۔

ج: بہت عزیز اُم جلال صاحبہ! آپ کی محبت کے لیے وہ الفاظ کہاں سے لاؤں کہ آپ کی تشفی ہوسکے۔ بہرحال پھر بھی یہی کہنا ہے کہ آپ کی محبت کا جتنا قرض ادا کرسکتا تھا، کردیا۔ باقی محفل میں آپ کی آمد کے بنا مجھے اب مزا نہیں آئے گا۔ اُمید ہے آپ کی آمد اب مستقل رہے گی۔

✉: یہ تلمبہ، میاں چنوں ہی سے ہماری گڑیا سیدہ نور العین زاہرہ کا محبت نامہ موصول ہوا ہے۔ لکھتی ہیں میں پہلی بار خط لکھ رہی ہوں۔ اگر آپ نے خوش آمدید کہا تو حاضر ہوتی رہوں گی۔ سب سے پہلے تو آپی دردانہ نوشین خان کو ایوارڈ کی بہت بہت مبارک ہو۔ ہم نے دوشیزہ کے صفحات پر آپ کو دیکھا۔ آپی آپ کی سادگی نے ہمیں

لوٹ لیا۔ بہت سارا پیار، آپ کے لیے، ویسے دوشیزہ سے تعارف بھی آپی نوشین نے کروایا ہے۔ آپی اتنا پیارا ڈائجسٹ متعارف کروانے کے لیے بہت شکریہ۔ دوشیزہ میں کہانیاں سب ہی بیسٹ تھیں۔ خاص کر ’ہجوم‘ جناب احمد سجاد بابر نے کمال کر دیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں اُسی علاقے فقیراں والی میں موجود ہوں۔ جیسے یہ سب میرے سامنے ہو رہا ہے۔ مجھ پر بیت رہا ہے۔ آپ نے بالکل ٹھیک کہا ہے کہ ہر ہجوم کو لیڈر کی ضرورت ہوتی ہے۔ کیا سچائی کا ہاتھ پکڑے ہوئے یہ لیڈر ہم نہیں ہو سکتے؟ میں اپنی شاعری بھیج رہی ہوں۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ مجھے دوشیزہ میں جگہ دیں گی۔ انشاء اللہ پھر حاضر ہوں گی۔ بہت ساری دعاؤں کے ساتھ اجازت چاہتی ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ سب کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔ آمین۔

سورج ہوں زندگی کی رمق چھوڑ جاؤں گا
ڈوب کر بھی آسماں پہ شفق چھوڑ جاؤں گا
مرے مرنے کے بعد تجھی مجھے محسوس کر لینا
میں اپنی اِس ہنسی کی کھنک چھوڑ جاؤں گا

٭: اچھی گڑیا نورا! لیجیے آپ کا مختصر تبصرہ محفل کی زینت بنا اور شاعری بھی اس ماہ شامل ہے۔ اب اپنی آمد مستقل بناؤ اور مجھے اگلے ماہ تفصیلی تبصرہ چاہیے۔

✉: یہ آمد ہے ہماری بہت موہنی سی لکھاری شاعرہ اور کہانی کار نسیم نیازی کی لاہور سے۔ لکھتی ہیں، دسمبر کا دوشیزہ بغیر انتظار کیے ہی ہاتھوں میں آیا تو خوشگوار سی حیرانگی ہوئی کیونکہ عموماً دوشیزہ بڑے نخروں کے بعد ہاتھ لگتی ہے گو یہ تو دوشیزاؤں کی ادائیں ہوتی ہیں۔ سو ہم بھی ہمیشہ یہ سوچ کر صبر کر لیتے ہیں۔ کاش دسمبر **2014**ء کو الوداع تم نے کہا تو الوداع ہم بھی کرنے کو تیار ہیں۔ یہ سال بھی جس تیزی سے آیا اسی رفتار سے گزر گیا اب تو مانو یوں لگتا ہے وقت کو پر لگ گئے ہیں۔ اُڑے ہی چلا جا رہا ہے اور ہم سوچتے ہی رہ جاتے ہیں کہ کچھ کر لیں، اس سال تو کچھ کر ہی لیں مگر یہ واقعی ہمارے ساتھ گزشتہ چند سالوں سے ہے کہ بہت کچھ کرنے کی چاہ رکھنے کے باوجود ہم کچھ کر ہی نہیں پاتے مگر تمہارا اداریہ پڑھا۔ اپنا محاسبہ کرنے کو جی چاہا اور پھر جی چاہا چلو اس سال اور کچھ نہ کر پائے تو جاتے دسمبر دوشیزہ کے نام اک خط ہی لکھ ڈالیں۔ مانو یہ آواز اندر سے نکلی تو ہم نے قلم تھام لیا، اس اُمید پر، اس آس پر کہ شاید سال نو ہم سے کچھ لکھوانے پر تل جائے (اللہ کرے ایسا ہی ہو۔ سب مل کر کہو آمین ثم آمین) کیونکہ ذہن کے گنبد میں روزانہ بہت سی کہانیاں گونجتی ہیں، شور مچاتی، اُکساتی رہتی ہیں کہ ہمیں لکھو۔ ہمیں بیان کرو مگر اِک عجیب سی سستی کاہلی سی ہے۔ جس نے ذہن و دل کو جکڑ رکھا ہے۔ جو کچھ لکھنے نہیں دیتی بہر حال نئے سال کے آغاز سے قلم تھام رہی ہوں، اِس کوشش اور خواہش کے ساتھ کہ یہ قلم جو چلا ہے تو چلتا رہے، چلتا رہے۔ ٹائٹل کچھ خاص نہ تھا مگر اداریہ بہت خاص الخاص رہا۔ محفل میں اپنی سالگرہ کی خبر لگی دیکھی تو بے اختیار رضوانہ جی پر بہت پیار آیا کہ میں گوڈے گوڈے اُن کی محبتوں کی مقروض ہوتی جا رہی ہوں کیونکہ وہ کوئی موقع جانے نہیں دیتیں۔ خوش رہو رضوانہ جی۔ سنبل سے کہنا ہے کہ عورتوں سے عمر پوچھی نہیں جاتی بلکہ خود اندازے لگایا کرو جو عمر سے چند سال کم بتاؤ گی تو خوشی سے چند سال اور پیچھے چلی جائے گی عورت۔ سو مجھ سے تو ہرگز مت پوچھنا۔ پہلے بات ہو جائے ناولوں کی۔ بینا کیا خوب لکھ رہی ہیں تیرے عشق نچایا کو۔ ہر قسط بھرپور

ہوتی ہے اور کامیابی کی سند تو میں نے انہیں آغاز میں ہی دے ڈالی تھی۔ اور اب شدتوں کے ساتھ انتظار ہے رفعت سراج کے ناول کا۔ نگہت اعظمیٰ کا افسانہ پھوول میں عجیب سا درد اُتار گیا۔ واقعی جس عورت نے ماں باپ کے گھر میں گالی نہ سُنی ہو، اس کے لیے عام سی گالی برداشت کرنا بہت اذیت ناک ہوتا ہے اور پھر عزت سے بڑھ کر کچھ نہیں۔ مگر ہمارا معاشرہ ایسا ہے کہ عورت اگر عزت کی خاطر شوہر سے جدائی چاہتی ہے تو ہمارا معاشرہ اُسے بہت مشکل سے برداشت کرتا ہے اور معاشرہ کرلے تو اولاد بھی ماں کو ہی قصور وار سمجھتی ہے مگر اس لیے بیشتر عورتیں گالی کا زہر پی کر اسی گھر میں جلتی رہتی ہیں۔ اس بار کی بازی شمع حفیظ کے ہاتھ رہی۔ پہلی عورت آخری مرد لکھ کر، ویلڈن شمع۔ دورِ حاضر کی بہت دردناک کہانی محمد علی روشن کے قلم کی زبانی، میٹھی نیند! لوڈشیڈنگ کے عذاب نے واقعی پاکستانی عوام کو بے حال کر دیا ہے اور ایسے میں انسان بے بسی کے احساس میں گرفتار ہو کر اس طرح کے انتہائی قدم اُٹھانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ ناولٹ میں ابن آس کا کلائمکس آج کی تصویر، دل دہلا دینے والی، روح کو جھنجوڑنے والی۔ غزالہ عزیز **SMS** پیکیج لے کر آئیں۔ حساس دلوں کو دکھی کرتی یہ تحریر سو سو رہی۔ صفیہ سلطانہ کو شرجیل کی شادی مبارک۔ اللہ کرے صفیہ کی بہو اس کے لیے باعث خوشی باعث سکون اور شرجیل کے لیے باعث خوش بختی ہو اور ہاں کاشی تمہیں پہلے ناول کی مبارک ہو۔

ﮯ: نسیم جی! خدا آپ کے قلم کو فعال بنائے اور اِرد گرد بکھری کہانیاں آپ کے قلم کی گرفت میں جلد آ کر قارئین تک پہنچ جائیں (آمین)۔ تبصرہ بہت شاندار تھا مگر وائے نصیب! آپ ہمیں کیوں بھلا ایسی خوشیاں مستقل دینے لگیں۔

✉: کراچی سے خولہ عرفان محفل میں براجمان ہیں۔ لکھتی ہیں امید اور دعاؤں کے ساتھ پھر آپ کی محفل میں حاضر ہونا چاہتی ہوں کہ آپ خیریت سے ہوں اور اللہ تبارک وتعالیٰ آپ کو دونوں جہان کی سرفرازیاں اور صحت عطا فرمائے۔ سب سے پہلے آپ کی عزت افزائی اور خلوص کا شکریہ کہ خاکسار کے خط کو نہ صرف اپنے رسالے میں جگہ دی بلکہ اِس کا جواب اتنے خوبصورت اور پُرخلوص انداز میں دیا کہ اُس خوشی اور قدر دانی کے احساس کو ضبط تحریر میں لانے سے قاصر ہوں۔ یقین کریں آپ کی حوصلہ افزائی نے دل میں آپ کی قدر و منزلت میں اور اضافہ کر دیا ہے۔ آپ کی صلاحیتوں کا اُجاگر کرتا ماہِ دسمبر کا دوشیزہ بھی اپنی تمام تحریروں میں حقیقتوں کی عکاسی کرتا، بہترین اندازِ بیان سے مزین ملا۔ شمع حفیظ صاحبہ کی 'پہلی عورت آخری مرد' نے بہت متاثر کیا۔ مرزا حیدر عباس صاحب نے اپنے افسانے 'بوری' میں بہت خوبی سے عصرِ حاضر میں کتب بینی اور کتابوں کی اہمیت کی روز بروز تنزلی پر سے نقاب اٹھایا ہے۔ سب سے زبردست تحریر 'کلائمکس' تھی، جس نے روح تک کو جھنجوڑ دیا۔ ناولوں میں بینا عالیہ صاحبہ، عقیلہ حق صاحبہ، اُم مریم صاحبہ اور غزالہ جلیل راؤ صاحبہ سب ہی نے ماشاء اللہ اپنے قلم کے جوہر سے دوشیزہ کو چار چاند لگا دیے ہیں۔ 'نئے لہجے نئی آوازیں' میں ساری ہی نظمیں اور غزلیں آنکھوں کے رستے دل میں اترتی محسوس ہوئیں۔ اللہ تعالیٰ سب مصنفین اور شعراء کے زورِ بیاں میں خوبیوں کے ساتھ اور اضافہ فرمائے اور آپ کو اتنی خوبیوں سے مرتب کردہ دوشیزہ کی ادارت پر پوری صحت یابی وخوشیوں اور کامیابیوں کے ساتھ قائم رکھے آمین۔ کاشی صاحب ایک افسانہ خط کے ساتھ ارسال کر رہی ہوں، اگر قابلِ اشاعت محسوس ہو تو دوشیزہ میں ضرور جگہ عنایت فرمائیے گا، پچھلے خط کے ساتھ بھی ایک غزل ارسال کی تھی باقی جو آپ بہتر

سال گرہ مبارک

قارئین دوشیزہ کو سال گرہ اور نیا سال مبارک ہو۔ اللہ تعالیٰ یہ نیا سال ہم سب کے لیے اور میرے ملک کے لیے امن و آشتی کا پیغام لایا ہو۔ آمین۔ دل چاہتا ہے کہ کئی ماہ بعد آئی ہوں تو آپ لوگوں کے ساتھ اپنی کوئی خوبصورت یاد شیئر کروں۔

اِن دنوں یہ بات ہوتی ہے کہ جب بھی مجھے کوئی نیو قاری یا لکھاری فون کرتی ہیں تو سب سے پہلے تو وہ یہ کہتی ہیں۔ پلیز اقبال بانو سے بات کروادیں۔

کہتی ہوں۔ ''جی بول رہی ہوں۔''

''آپ......نہیں بھئی اُس اقبال بانو سے بات کروائیں جو لکھتی ہیں۔''

''بھئی میں وہی ہوں۔''

''مگر آپ کی آواز......؟'' کہا جاتا ہے۔

مزا لے کر میں۔ ''بہت بری ہے۔''

جلدی سے۔ ''نہیں آپ تو لگتی نہیں کہ بہت عرصے سے لکھ رہی ہیں۔ جسے ہماری امیاں اور خالائیں پڑھتی تھیں۔ آپ تو 25 سال یا حد 30 سال کی لگتی ہیں آواز سے۔''

اور میں ایک جملہ کہتی ہوں۔ ''سنو رائٹر کبھی بوڑھا نہیں ہوتا اور تم نے مجھے 30 کا بھی کیوں کہا۔ میں 20 سال کی ہوں میرا 'زریں قول' ہے کہ

''رائٹر 16 سال سے کم اور 20 سال سے کبھی بھی زیادہ نہیں ہوسکتا اور آئندہ احتیاط کی جائے۔''

کاشی چوہان یہ اچھی مشکل ہے، جن دنوں 'دوشیزہ' میں میرا پہلا ناول شیشہ گر چھپ رہا تھا تو تب لوگ مجھے سمجھتے تھے میں کوئی عمر رسیدہ خاتون ہوں کہ بقول لوگوں کے وہ ناول بہت میچورڈ تھا۔ مشفق خواجہ صاحب، قتیل شفائی صاحب اور حتیٰ کہ اپنی عصمت چغتائی صاحبہ جب پاکستان آئی تھیں تو انہوں نے مجھے دیکھ کر حیرت سے کہا تھا ارے تم ہو 'شیشہ گر' کی مصنفہ! میں تو سمجھی تھی کوئی مجھ سے دو چار سال چھوٹی خاتون ہوگی۔ 'شیشہ گر' میں نے فرسٹ ایئر میں لکھا تھا۔ (یعنی سوئیٹ سکسٹین کا ناول ہے وہ میرا)

اِس بار بھی پورے ایک سال بعد میں نے دوشیزہ میں انٹری دی ہے اور اللہ بھلا کرے کاشی چوہان کا۔ یہ مجھے یاد دہانی کرواتا رہتا ہے کہ آپا آپ نے افسانہ دینا ہے ڈیڈ لائن دیتا ہے۔ اور یقین کریں میرا 'دوشیزہ' میں لکھوانے کا کریڈٹ کاشی کو جاتا ہے۔ تھینک یو کاشی، قارئین دوشیزہ سے بھی گزارش ہے کہ دعا کریں میں ہر ماہ آیا کروں۔ اللہ تعالیٰ مجھے ہمت اور صحت دے کہ اتنا لکھ پاؤں۔ میری جانب سے ماہنامہ دوشیزہ کی پوری ٹیم کو دوشیزہ کی سال گرہ مبارک ہو۔ اِسے بنانے اور سنوارنے والے ہاتھ سدا سلامت رہیں (آمین)۔

آپ کی

اقبال بانو

سمجھیں، پُرخلوص دعاؤں اور نیک خواہشات کے ساتھ۔

ﺟ: اچھی خولہ جی! محفل تو آپ ہی کی ہے نا! اس لیے آپ کا استقبال بھی ہونا چاہیے تھا۔ محبت ہمارا ایمان ہے کمال نہیں۔ بس اب آپ کی محفل میں حاضری ثابت کرے گی کہ آپ ہم سے کتنی محبت کرتی ہیں۔

✉: ملتان سے یہ آمد ہے ہماری شاعرہ اور بہت عمدہ لکھاری دوست فصیحہ آصف خان کی دوشیزہ کا نومبر کا شمارہ 19 نومبر کو ملا' خیر ملا تو۔ سرورق بس ٹھیک لگا۔ کاش خزانے بھرنے والے، عوام کی سسکتی آواز بھی سن سکیں۔ مگر مجھے تو یوں لگتا ہے ان کی آنکھوں کے ساتھ ساتھ کانوں پر بھی بے حسی کی چربی چڑھ گئی ہے۔ اسلامیات کی کلاس کے بعد اس حسین محفل میں قدم رکھے جہاں روشن چہرے اور ذہانت سے پُرمکھڑے مسکرا رہے ہیں۔ کاشی ہم سبھی آپ کی خالہ ریحانہ صاحبہ جیسی پاکیزہ زندگی گزار سکیں۔ کاشی بھائی ان کے واسطے دعائے مغفرت کردی ہے۔ رضیہ مہدی جی اور اُم مریم سے بھی تعزیت۔ دردانہ نوشین کا تبصرہ پسند آیا اور آپا رضوانہ کوثر کی کیا بات ہے۔ خط تو پرانا لگا مگر تھا جاندار و شاندار، میری تحریر' کالا جوتا' پسند کرنے پر سب بہن بھائیوں کا لاحد شکریہ سنبل خیر مبارک، تمہارا تبصرہ بھی تمہاری طرح کول سا تھا۔ ارے عقیلہ جی آپ راز نہ بتائیں پر یونہی لکھتی رہیں اور اللہ تعالیٰ بھی آپ کی آنکھیں اشکبار نہ کرے آمین۔ ثمینہ عرفان اور صائمہ حیدر بھی تبصرہ کرنے میں کامیاب ٹھہریں، صنم جنگ سے ملاقات پسند آئی۔ بینا جی شکر ہے کہ آپ نے اُم فروا کو درست ٹھکانہ دیا۔ ماہین کو ہوش کے ناخن لینے چاہئیں۔ بلال حمید کی دعائیں اے کاش رنگ لائیں۔ ورکنگ وومین میں کوئی خاص چیز نظر نہ آئی، دنیا پتل دی' لڑکیو! ہوش کرو۔ سبق آموز تحریر تھی۔ میرے پرندہ دل دوسری قسط کے بعد اگلی کا انتظار ہے۔ خوابوں کی دہلیز، محبت اعزاز ہے اور صدف آصف کی' اب اعتبار آیا' شکی بیویوں کے لیے مشعل راہ ثابت ہوگی۔ مہنگا سودا نے خوب ہنسایا، اِس راہِ وفا میں گداز جذبوں کی تحریر رہی، صائمہ حیدر بھی اپنا نقطہ نظر واضح کرنے میں کامیاب رہیں۔ 'چائے کی پیالی' اچھی تحریر موزوں رہی۔ باقی تمام سلاسل اپنی اپنی جگہ درست معلوم ہوئے۔ باقی اور کیا کہوں خوش رہیں، دوشیزہ کو اِس تن دہی سے سجاتے سنوارتے رہیں۔ اگر مہینے کے شروع میں دوشیزہ مل جایا کرے تو تبصرہ مزید طویل لکھوں گی۔ بس جلدی میں اتنا ہی لکھ پائی ہوں۔

ﺟ: فصیحہ جی! شاعری تو اس ماہ شاملِ اشاعت ہے۔ انشاء اللہ جلد ہی افسانہ بھی ان ہی صفحات پر موجود ہوگا۔ دیگر شکایات بھی جلد دور ہو جائیں گی۔

✉: مسز نوید ہاشمی، کراچی سے اپنی بے پناہ محبتوں کے ساتھ محفل میں جلوہ افروز ہیں۔ عرض کرتی ہیں، اُمید ہے آپ سب لوگ خیریت سے ہوں گے۔ کاشی چوہان کی خالہ کے انتقال پر بے حد افسوس ہوا خدا آپ سب کو ہمت دے۔ خالہ ماں کا دوسرا روپ ہوتی ہے خدا انہیں جنت الفردوس میں جگہ دے آمین۔ اُم مریم اور رضیہ مہدی کے چھوٹے بھائی کے انتقال پر بھی افسوس ہے خدا آپ کو بھی ہمت اور صبر دیں۔ دلشاد نسیم صاحبہ کو جنم دن پر مبارک باد قبول ہو۔ نگہت اعظمیٰ کو افسانوں کی کتاب پر مبارکباد۔ عادل حسین، سنبل، رضوانہ کوثر کا خط نومبر میں پسند آیا۔ نگہت اعظمیٰ آپ کی محبت سر آنکھوں پر ہم نئے لکھنے والے جانتے نہیں ہیں۔ آپ کا نومبر کا خط محبت سے گندھا ہوا تھا۔ شکوہ بھی تھا، محبت بھی تھی، اپنے دوستوں کے لیے، مجھے پسند آیا آپ کا یقین، پیار ہی پیار۔ عادل حسین اور سنبل صاحبہ آپ تو ہماری سچی کہانیاں احوال کے بھی ساتھی ہیں کبھی بھولے سے ہمارا نام بھی لے لیا

کریں۔ دوشیزہ میں اپنے لوگوں سے مل کر بڑی خوشی ہوتی ہے۔ صائمہ حیدر آپ کا سوپ دیکھا بے حد پسند آیا۔ میں نے سب دوستوں کو بتایا یہ صائمہ حیدر دوشیزہ میں بھی لکھتی ہیں۔ عقیلہ حق کے بھانجے کے لیے دعا گو ہوں، خدا انہیں صحت عطا فرمائے۔ ثمینہ عرفان آپ کے شوہر کے لیے دعا گو ہوں۔ خدا انہیں صحت عطا فرمائے۔ آپ کو بھانجے کی شادی کی مبارکباد، اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟ کاشی چوہان آپ کا ڈرامہ بھی مجھے پسند آیا۔ ماشاء اللہ آپ تو ہرفن مولا ہیں۔ آپ شاعر، رائٹر، اداکار ہر اسٹائل میں بے مثال ہیں۔ نومبر میں لاج بہت خوبصورتی سے پیش کیا ہے کاشی نے۔ نعمان اسحٰق، بینا عالیہ اور عقیلہ حق کے ناول مجھے بہت پسند آرہے ہیں۔ ورکنگ وومین بہت شاندار تحریر تھی، ہم جیسی ورکنگ وومین کے لیے ایک تحفہ تھی، عزم حوصلہ تھی آپ کی تحریر۔ نیلم الماس، الماس روحی اور مریم فاطمہ کا ناولٹ اچھا تھا۔ سنبل اور صدف آصف، عارف شین روہیلہ کی تحریر پسند آئی۔ نسرین اختر بھٹی اور محمد حامد سراج کی تحریر بھی بہت زیادہ پسند آئی۔ شوکت جمال کی خودکشی تحریر پورے ڈائجسٹ کا دل لگی، خوبصورت پیارا لکھا اور کیا خوب لکھا۔ افسر سلطانہ حج کی بہت بہت مبارکباد قبول فرمائیں۔ پروفیسر صفیہ سلطانہ مغل کے بیٹے کی شادی پر مبارکباد پیش کرتی ہوں۔ رضیہ مہدی کو نانی جان کا رتبہ ملنے کی مبارکباد پیش کرتی ہوں۔ نسیم نیازی اور سویرا فلک کو جنم دن کی مبارکباد، خوشی کے ساتھ غم بھی ہوتے ہیں۔ پیاری رضوانہ کوثر کی کزن کے وفات پر مغفرت اور اعلیٰ درجات کے لیے دعا گو ہوں۔ دسمبر میں نیرّ رضاوی کے خط کا جواب کاشی چوہان نے دیا پسند آیا۔ کاشی چوہان صاحب، محمد اقبال زمان صاحب آفتاب صاحب آپ سب کی شکرگزار ہوں کہ اب دوشیزہ مجھے وقت پر مل گیا تھا۔ شکریہ فریدہ جاوید فری کے لیے دعا گو ہوں۔ اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟ اور آپ کو مجموعہ کلام کی مبارکباد پیش کرتی ہوں۔ ہمیشہ کی طرح دوشیزہ ڈائجسٹ میں تمام کہانیاں نگینے کی طرح فٹ تھیں۔ اس ماہ چند کہانیاں پڑھ پائی ہوں جس پر تبصرہ کررہی ہوں۔ نگہت اعظمی کی بچھو واقعی بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتی ہے۔ غصہ اور گالی دینا میں سمجھتی ہوں یہ بیماری ہے، جس کا علاج ضروری ہے ورنہ وہ اپنے اردگرد بسنے والے کو جلا کر راکھ کردیتی ہے۔ میٹھی نیند محمد علی روشن نے لوڈشیڈنگ پر اتنی خوبصورتی سے لکھی اگر سچے دل سے واقعی سوچا جائے تو بہت بھیانک تصویر پیش کی ہے۔ جو سچ ہے غزالہ جلیل راؤ کی ناول بھی پسند آئی۔ شمع حفیظ کا افسانہ بھی پسند آیا، عزت لوٹ کر جو عزت دینے آئے...... خط بے حد لمبا ہوگیا ہے معافی چاہتی ہوں۔

ﷺ: اچھی آپی! آپ کا طویل تبصرہ محفل کا حصہ بنا، آپ کی محبت ہمارا مان ہے۔ آپ بھی محفل میں اسی مان سے آیئے۔

✉: کراچی سے ہماری بہت عزیز قاری اور شاعرہ ثمینہ عرفان رقم طراز ہیں، بہت اچھے سے کاشی چوہان تین 'سطروں' پر مشتمل میرے خط کا جواب تمہارے بے لوث خلوص کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ جس کو میں کئی دفعہ پڑھ چکی ہوں۔ اپنے خط کے جواب کی وجہ سے ہی میں فوراً خط لکھنے کا ارادہ کر بیٹھی تھی۔ لیکن پھر دفتر کی تبدیلی اور نئے وپرانے پتے پر مجھے جب سمجھ نہیں آیا، تو میں نے 'توجہ طلب' والے کالم کے موبائل نمبر پر فون کیا تو انہوں نے بتایا کہ ہمارا آفس شفٹ ہورہا ہے اور پھر خط کا معاملہ ادھورا رہ گیا۔ سب سے زیادہ خوشی اس بات کی ہوئی کہ اب آپ لوگ ہمارے گھر کے کافی قریب آگئے ہیں۔ آپ سب لوگوں کو نیا آفس مبارک ہو۔ اللہ تعالیٰ آپ لوگوں کو مزید کامیابیوں اور ترقی سے نوازے آمین۔ میں نے جب پہلے خط لکھنا شروع کیا تھا، بہت کچھ لکھنے کا ارادہ تھا

سانحۂ ارتحال

ہماری دیرینہ ساتھی اور سابق ایڈیٹر 'رضوانہ پرنس' کی والدہ شدید علالت کے بعد لندن میں اپنے خالقِ حقیقی سے جاملیں۔ دکھ کی اِن گھڑیوں میں ادارہ پرل پبلی کیشنز اِن کے ساتھ ہے اور مرحومہ کے اعلیٰ درجات اور لواحقین کے لیے صبر کی دعا کرتا ہے۔

اور اب خط لکھنا شروع کیا تو سب سے پہلے تمہارا 'الوداع اے گزرے برس' پڑھا۔ پہلے پڑھا تو ایک ٹھنڈی آہ نکلی تھی۔ لیکن دوبارہ پڑھا، تو ایسے لگا جیسے کسی نے سینے پر بہت زور سے گھونسا مارا ہو۔ کاش دسمبر کا مہینہ میرے لیے خوشی اور غم دونوں کا امتزاج لیے ہوئے ہے۔ 8 دسمبر 1983ء کو شادی ہوئی۔ شادی خوشی بھی اور ماں باپ اور بہن بھائی سے جدائی کا غم بھی۔ 22 دسمبر 2003ء کو پاپا کی اچانک وفات...... 71ء کی جنگ کے وقت تو میں بہت چھوٹی تھی لیکن آج بھی جب دسمبر کا مہینہ آتا ہے۔ تو 71ء کی جنگ اور دیگر واقعات ایک تسلسل کے ساتھ ذہن میں در آتے ہیں۔ لیکن 16 دسمبر 2014ء کے 'سانحے' نے تو ہوش و حواس ہی گم کردیے۔ جن سفاک درندوں نے آرمی پبلک اسکول پر جس دہشت اور بربریت کا مظاہرہ کیا، اُن طلباء کے معصوم وجود سے آگ اور خون کی ہولی کھیلی۔ اُن معصوموں کی ماؤں پر کیا گزری ہوگی اور کیا گزر رہی ہوگی۔ آج بھی ہر آہٹ پر ان کے کان اپنے معصوموں کی آہٹ کے منتظر ہوں گے۔ وہ منتظر ہوں گی کہ آج میرے بچے نے دوپہر میں کھانے کے لیے اپنی پسند کے کھانے کی فرمائش کی تھی۔ جلدی سے بنالوں، دن بھی چھوٹا ہوتا ہے۔ اسکول کی چھٹی بھی ہونے والی ہے یا دو دن بعد بچوں کی سردیوں کی چھٹیاں ہوں گی تو نانی کے گھر جائیں گے بچے رہنے، فلاں جگہ جائیں گے بچے گھومنے، کیا پتا ان ماں باپ کو 19 دسمبر کو ہونے والی 'سردیوں' کی چھٹیوں سے پہلے ہی وہ بھی چھٹیوں پر چلے جائیں گے۔ اکیلے ہی ماں باپ کے ساتھ جاتے تو بہت روک ٹوک ہی ہوتی کہ بیٹا بری بات ہے کسی اور کے گھر پر آئے ہو، شرارت نہیں کرتے۔ تمیز سے رہو۔ یہ نہیں چھوؤ وہ نہیں چھوؤ، ندیدوں کی طرح نہ کھاؤ۔ لیکن امی ابا ہم سب ایک دم ہی سے اللہ میاں کے پاس آگئے ہیں۔ وہ انکل گندے ضرور تھے جنہوں نے ہم کو مارا لیکن ہماری سردیوں کی چھٹیاں زبردست کردیں۔ ہم سب لوگ یہاں جنت میں بہت مزے میں ہیں۔ ہر جگہ بہت مزے سے گھوم پھر رہے ہیں۔ مزے مزے کی چیزیں کھانے کو مل رہی ہیں آپ لوگ پلیز اپنے آنسو پونچھ لیجیے۔ کاش شاید شدتِ غم سے میں پاگل ہوگئی ہوں۔ مجھے کچھ بھی سمجھ نہیں آرہا ہے کہ میں تم کو کیا لکھ رہی ہوں۔ تم میری ان باتوں کو میری تحریر کو 'ربط' دے دینا۔ میرا اکلوتا بیٹا رمیز جب تک گھر نہیں آجاتا۔ میں نیند کی متوالی اِس وقت تک پلک نہیں جھپکتی ہوں۔ کیسے بھولوں گی اپنے اتنے بچوں کا ایک ساتھ چلے جانا۔

تخلیق کے خون کو بے مایا بہتے دیکھ کر ثمینہ
صورتِ شبنم روتا خدا دکھائی دیتا ہے

کاشی آخری لائن تمہارے کالم کی الوداع اے مصروف و مجبور 2014ء کہ تیرے جاتے جاتے بھی ہم تہی دست ہی رہے۔ الوداع الوداع......''نہیں کاشی ہم تہی دست نہیں رہے۔ معصوم خوں رائیگاں نہیں گیا۔ دھرنے ختم ہوئے۔ کاشی اس سے زیادہ لکھا نہیں جارہا ہے۔ تم سے کچھ گلے شکوے کرنے تھے یہ ظالم دسمبر گزر جائے۔ یہ دل ذرا سنبھل جائے۔

ج: ثمینہ جی! میں نے جہاں تک ہوسکا آپ کے جذبات حوالۂ محفل کردیے۔ میرا قلم خاموش ہوچکا۔ کیا لکھوں......

✉: لودھراں سے یہ آمد ہے ہمارے عزیز ترین احمد سجاد بابر کی۔ لکھتے ہیں، نومبر کا شمارہ موصول ہوا، سب سے پہلے احباب کی محفل کا رخ کیا، جو احباب اپنے پیاروں کو کھو بیٹھے ان کے غم میں، میں ان کے ساتھ ہوں، یہ سائیکل آف لائف سہی مگر اسے سہنا بہت دشوار ہے۔ کاشی میں اکثر ایک بات نوٹ کرتا ہوں کہ دوشیزہ میں زیادہ تر خطوط دو پیٹرن کے ہوتے جارہے ہیں، پہلا پیٹرن تو وہ جس میں سب کی تعریف ہوتی ہے، ''اداریہ کمال کا تھا، وہ بھی اچھا، یہ بھی اچھا، پپّو، گڈو، منی، چھوٹو سب کے سب ستائش کے حقدار'' (بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ کسی کی تحریر میں کوئی بھی خامی نہیں) یا پھر دوسرے خطوط جن میں پرچے پر کوئی بات نہیں کی جاتی، اپنی کسی تحریر کے بھیجے جانے کی اطلاع دی جاتی ہے یا اپنے مسائل، مصروفیات کے تذکرے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا (مشتری ہوشیار باش۔ تاکہ سند رہوے اور بوقت ضرورت کام آوے) یہ دونوں قسم کے خطوط صرف اور صرف ایک بات ظاہر کرتے ہیں کہ اکثر خط لکھنے والوں نے پرچہ پڑھا ہی نہیں ہوتا یا پھر اخلاقی جرأت کی کمی کہ غلط کو غلط کہنے سے ڈر لگتا ہے، ہم اپنا تعلق کیوں خراب کریں (کہ سانوں کی!!)، ایسے خطوط سے سوائے صفحات کالے کرنے کے اور اپنی حاضری لگوانے کے اور کیا فائدہ؟ اس کے علاوہ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ زیدہ تر رائٹرز خط لکھتے ہی نہیں جبکہ وہ یہ امید کرتے ہیں کہ ان کی تحریر کا ہر خط میں تذکرہ ہونا ان کا آسمانی تفویض کردہ حق ہے (معذرت)۔ کاشی بھائی اس مرتبہ رضیہ جی کا نام دیکھا تو لپک کر ''ورکنگ وومین'' پڑھنا شروع کی، پچھلے سال نومبر میں بھی رضیہ جی کی تحریر ''درِقفس'' ورکنگ وومین (اوج) کا دکھ بیان کررہی تھی (اتفاق دیکھیے)۔ رضیہ جی کی سب سے بڑی خوبی پتا ہے کیا ہے؟ وہ ہے ان کی دورِجدید، بدلتے تقاضوں سے اپنی تحریر کو ہم آہنگ کرنا، کرداروں اور پلاٹ کے مطابق ان کے مکالمے اتنے جاندار، شوخ اور چلبلے تھے کہ رائٹر کا انہماک اور ارتکاز صاف نظر آرہا تھا، دوسرے مکالمے برمحل و بے ساختہ بھی تھے جس کی وجہ سے مصنوعی پن کی بجائے نیچرل فلو نظر آیا، تیسرے مکالمے وہی تھے جو ہمارے گھروں اور اردگرد ہم سنتے ہیں جس کی وجہ سے تحریر میں بوجھل پن نہیں پیدا ہوا، چوتھے کہانی کی سپیڈ بہت مناسب و متوازن تھی جس کی وجہ سے تشنگی اور ادھورا پن نظر نہیں آیا۔ بہت زیادہ اور رضیہ جی کے لیے۔ مجھے صرف ایک بات چبھی، وہ یہ کہ ناولٹ کا اختتام نیچرل نہیں تھا بلکہ اختتام تھا ہی نہیں، ایک تھیم دے کر اس کا نتیجہ تو نکالا گیا تھا مگر جو قافلہ آپ لے کر چل رہے تھے اس کو سرِراہ چھوڑ دیا، شاید رضیہ جی نے ورکنگ وومین کے مسائل کو پیک پر لے جاکر دکھانا تھا، وہ تو انہوں نے دکھایا مگر کہانی ایک مقام پر رُک گئی۔ نیلم الماس کا ناولٹ ''دنیا پتّل دی'' کی سب سے بڑی خوبی اس کا سسپنس تھا، آخر تک اندازہ نہیں ہو پارہا تھا کہ ہوگا کیا، ایک مرحلے پر تو لگا کہ آنچل سب کچھ چھوڑ چھاڑ اشعر کی راہ پر چلنے والی ہے مگر یہاں سے کہانی نے فائنل ٹوئیسٹ لیا، اچھی تحریر رہی یہ!!۔ نعمان اسحٰق کی ''میرے پرندہِ دل'' کہانی کے مناظر میں تو بہت سلو چلتی ہے مگر واقعات میں ڈرونز کی طرح یہ جا وہ جا کی تمثیل ہے، نعمان بھائی عمر کو بیان کرنے کا آپ والا طریقہ (دو دہائیاں، تین

دہائیاں وغیرہ) بہت مشکل طریقہ ہے، رک کر سوچنا پڑتا ہے کہ عمر ہے کتنی، بھائی کوئی آسان بیانیہ اختراع کریں
نا اور کمرے کی یا ماحول کی ہر ہر چیز کو جزئیات سے بیان کرنا تو کوئی آپ سے سیکھے (ایمان سے)، اس کے علاوہ منظر
کشی، صحیح جگہ پر صحیح جملہ اور لفظوں سے دلکشی پیدا کرنے میں ابھی آپ کو کافی سفر طے کرنا ہے۔ الماس روحی کا
افسانہ ''خوابوں کی دہلیز پر'' مرد کی اس مخصوص سوچ کا عکاس تھا کہ دوستی کے لیے الٹرا ماڈرن اور شادی کے لیے
سات پردوں میں لپٹی لڑکی درکار ہوتی ہے جسے چشمِ فلک نے بھی نہ دیکھا ہو۔ ''محبت اعزاز ہے'' سنبل جی کا
افسانہ، جسے بہت غور سے پڑھا، اس میں اچھا سبق دیا گیا تھا کہ پہلا چراغ چاہے خونِ دل سے جلانا پڑے ضرور
جلاؤ، وہ پیچھے آنے والوں کے لیے روشنی کا منبع اور راستہ سہل کرنے کا باعث بنتا ہے۔ چھوٹے شہروں، دیہاتوں میں
تو ایسا بہت ہوتا ہے کہ کالج، یونیورسٹی جانے والوں کے اٹھائے گئے اسٹیپ اور کیے گئے فیصلے پیچھے آنے والوں کا
راستہ ہمیشہ کے لیے یا بند کردیتے ہیں یا پھر اجال دیتے ہیں۔ صدف آصف اپنے افسانہ ''اب اعتبار آیا'' میں متاثر
نہ کرسکیں، یوں لگا کہ ہزاروں بار کی پڑھی کوئی تحریر دوبارہ پڑھ رہے ہیں، تھیم، مکالموں، آغاز و اختتام سبھی پہلوؤں
سے۔ صائمہ حیدر ''مریم فاطمہ'' کے روپ میں ایک اچھی تحریر ہمارے لیے لائیں، یہ ناولٹ ہر لحاظ سے اچھا لگا۔ ایک
عمدہ فن پارے کے تمام رنگ اس میں موجود تھے۔ ایک اور ناولٹ ''اس راہِ وفا میں'' جو نسرین بھٹی نے لکھا، مایوسی کا
باعث بنا۔ ایک تو پنجابی مکالمے کثرت سے تھے جس کی وجہ سے بوجھل پن تھا (ترجمے کے باوجود)، دوسرے کہانی
کی رفتار بہت تیز تھی، غیر فطری حد تک تیز تھی، تیسرے یہ کہ اندازِ بیاں دلکش نہیں تھا، تحریر قاری کو لیے نہیں چل رہی تھی
بلکہ قاری کو ہانپتے ہوئے کہانی کا دامن تھامنا پڑ رہا تھا۔ چاشنی کا فقدان تھا (اس کا مطلب کہ بُنت کے دیگر عناصر بھی
کم تھے)، یوں لگ رہا تھا کہ پاکستان کی پنجابی فلم اور انڈیا کی ناکام فلم مکس کردی گئی ہیں۔ کہانی میں چھلانگیں زیادہ
لگائی گئی تھیں جس کی وجہ سے کہانی کو سمجھنا سہل نہ تھا، سین زیادہ تھے، کردار غیر ضروری زیادہ تھے، مکالمے عام سے
تھے، آخر میں تو زیادہ ہی بوجھل ہوگئی یہ تحریر (بھٹی صاحبہ معذرت کے ساتھ)۔ اب ذرا دسمبر کے شمارے پر کچھ کہنا
چاہوں گا، محمد علی روشن کا افسانہ ''میٹھی نیند'' کا اندازِ بیاں پسند آیا، نگہت اعظمی کا افسانہ ''بچھو'' منفرد اس وجہ سے رہا کہ اس
میں ایرج نے وہ قدم اٹھایا کہ جو ہمارا دل کہہ رہا تھا کہ اٹھانا چاہیے ورنہ عام طور پر تو اکثر افسانے روایتی انداز میں
یوں بڑھتے ہیں کہ عورت نے ظلم، زیادتی، عزتِ نفس کا قتل روز سہا، برداشت کیا، پھر اولاد جوان ہوگئی، شوہر نے
ایک دن چاندرات کو شرمندگی کا اظہار کردیا (شادی کے تیس، چالیس سال بعد)، کہانی کی ہیروئن نے تشکر سے افق
پر چاند کو دیکھا تو اسے لگا آج اس کی پہلی عید ہے!!! (ہاہاہاہا) نگہت اعظمی نے کہانی کو خود آگے چلنے دیا اور کہانی نے
اپنا انجام خود متعین کیا۔ شمع حفیظ کی ''پہلی عورت، آخری مرد'' ایک عمدہ تحریر رہی، انہوں نے ایک عام سے موضوع اور
برتتے ہوئے ٹاپک کو بہت خاص بنادیا، منظر کشی اور مکالمے جاندار رہے۔ غزالہ عزیز نے ''ایس ایم ایس پیکج'' میں
آج کے مشینی دور کا ایک سلگتا ہوا مسئلہ بیان کیا ہے جو ہم سب کو ہی چبھتا ہے، بہت خوب غزالہ جی۔ روزینہ حنیف کا
افسانہ ''معجزے ہاتھوں میں'' اور عائشہ شفقت کا ''کمپرومائز'' ہر لحاظ سے ان گنت مرتبہ کے پڑھے ہوئے افسانے
لگے۔ وہ کچھ بھی نیا نہ دے پائیں مگر ان میں صلاحیت نظر آئی جو یقیناً ان کی معاون ثابت ہوگی۔ ابنِ
آس ''کلائمکس'' کی شکل میں ایک مختلف تحریر لے کر آئے، آج کے دور میں ضرورت ہے ایسی تحریر کی۔ ہمارے
چاروں طرف طارق جیسے کردار موجود ہیں جس نے ہمارے معاشرے کو تضاد کا ملغوبہ بنا کر رکھ دیا ہے۔ کہانی کا فلو

عمدہ تھا۔ مجموعی طور پر دسمبر کا شمارہ زیادہ معیاری رہا، جس میں زیادہ جدت اور کوالٹی تھی۔ کاشی اب اجازت دیں۔

ج: پیارے احمد! یقین کرو تمہاری کمی بڑی کھلنے لگی ہے۔ یار اب محفل میں غیر حاضر نہ ہونا، اسے محبت سمجھو یا حکم...... مگر حاضری لازمی بناؤ۔

✉: محفل اختتام پر تھی کہ اچانک ایک سندیسہ آ گیا۔ اور سندیسہ بھی ہماری بہت اچھی شاعرہ اور لکھاری ساتھی شاہدہ ناز قاضی کا لاہور سے۔ شاہدہ جی کی محفل میں ایک طویل عرصے بعد آمد ہے۔ عرض کرتی ہیں، پیارے بیٹے کاشی، میں ایک لمبے عرصے کے بعد دوشیزہ کی محفل میں حاضر ہو رہی ہوں۔ کچھ مصروفیات، کچھ غم دوراں، سب نے مل کر کولہو کا بیل بنائے رکھا۔ منزہ کی خیریت اور بھابی جان رخسانہ کی صحت یابی کے لیے ہمیشہ دعا گو رہی۔ آپ سب سے تعلق ایک رسالے اور قاری یا لکھاری کا ہی نہیں ایک گھرانے کا سا ہے۔ بہت گہری محبت، انسیت، اس رسالے سے محسوس ہوتی ہے۔ میں دوشیزہ ایوارڈ میں شامل اس لیے نہ ہوسکی کہ میرا لیٹر غلطی سے آپ کے ادارے نے میاں چنوں کے پتے پر بھیج دیا۔ وہ مجھے بہت بعد میں ملا اور میں کچھ عرصہ ملول بھی رہی یہ حادثاتی غلطی، بہر حال میرے لیے بہت بڑی تھی۔ بس گلہ بھی نہیں کر سکی، بہر حال زندگی رہی تو میں اور سلمیٰ اکٹھے ہی آئیں گے۔ اب جو ہونا تھا ہو چکا۔ تمام لکھاری 'سینئر' جونیئر سب کو بہت بہت پیار اور سلام۔ ابھی خط اتنا ہی لکھا تھا کہ ٹی وی پر پشاور کے سانحے کی خبر نے اچانک غم کے اندھیرے میں ڈبو دیا ہے۔ جلدی میں خط میں ختم کر رہی ہوں۔ اپنا ایک افسانہ ارسال کر رہی ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ سب کو، پورے پاکستان کو اور سب کے گھروں میں امن، چین، سکون رکھے اور جو معصوم بچے شہید ہو چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین۔

ج: بہت اچھی شاہدہ جی! آپ کے خط نے نئے سال کی جو خوشی دی وہ لفظوں میں بیان نہیں کی جاسکتی۔ سلامت رہیے۔

ساتھیو! لیجیے جنوری کا شمارہ آپ کے ہاتھ میں ہے اور اِس شمارے کے ساتھ ہی آپ کا دوشیزہ اپنے **42** برس مکمل کر چکا۔ **43** ویں برس کا پہلا شمارہ آپ کو کیسا لگا؟ آپ کی رائے کا انتظار رہے گا۔ اگلے ماہ انشاء اللہ ان ہی صفحات پر پھر ملاقات ہوگی۔

آپ کا ساتھی
کاشی چوہان

توجہ طلب

قارئین خط و کتابت کے لیے ہمارا نیا پتا نوٹ فرمالیں۔
آئندہ خطوط اسی پتے پر ارسال کریں۔ (شکریہ)

88-C II خیابانِ جامی فیز 7۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی، کراچی
0333-2269932 / 0300-2313256
ای میل pearlpublications@hotmail.com

'بابل کی دعائیں لیتی جا'

ابن آس محمد، وہ نام جو قلم کا امین ہے۔

آج کے معروف اور مصروف قلم کار کی جانب سے سچی کہانیاں کے قارئین کے لیے تحفۂ خاص!

'بابل کی دعائیں لیتی جا' ایک ایسا سماجی شاہکار ناول، جس میں آج کے معاشرے کی حقیقی صورت نظر آئے گی۔

ایک ایسی لڑکی کی کہانی، جس نے اپنے بابل اور سہاگ کے لیے اپنی زندگی وار دی۔

ماہ فروری سے سچی کہانیاں کے صفحات پر ملاحظہ کیجیے

باصلاحیت اور معروف اداکارہ

منشا پاشا

ذیشان فراز

☆وہ نام جو شناخت کا باعث ہے؟
♥:منشا پاشا۔
☆گھر والے کیا کہہ کر پکارتے ہیں؟
♥:منشا یا منشو۔
☆وہ مقام جہاں سے آشنا ہو کر آنکھ کھولی؟
♥:حیدرآباد۔
☆زندگی کس برج (star) کے زیراثر ہے؟
♥:میزان (Libra)۔
☆علم کی کتنی دولت کمائی؟
♥:زیبسٹ سے میڈیا سائنس میں بیچلر کیا ہے۔ اسکالرشپ پر امریکہ گئی، وہاں ایک سال پڑھا اور گریجویشن کیا۔
☆ کتنے بھائی بہن ہیں۔آپ کا نمبر؟
♥:چار بہنیں ہیں۔میرا نمبر آخری ہے۔
☆برسرروزگار ہو کر پریکٹیکل لائف میں داخل ہوگئیں؟
♥: کہہ سکتے ہیں۔
☆موجودہ کیریئر (مقام) سے مطمئن ہیں؟
♥:بہت کچھ کرنا چاہتی ہوں۔
☆پروگرام کے لیے اپنی طبیعت اور مزاج کے برعکس موڈ بنانا ضروری ہوتا ہے؟
♥:بالکل بنانا پڑتا ہے۔
☆:اس زندگی میں کون سا کام سب سے مشکل ہے؟
♥:ہمت کرے انسان تو کچھ مشکل نہیں۔
☆:کوئی ایسی خواہش جواب تک پوری نہ ہوئی ہو؟
♥:ہر خواہش پوری تھوڑی ہوتی ہے۔بس ہر حال میں خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے۔
☆:کون سی چیز کی کمی آپ آج محسوس کرتے ہیں؟
♥:بہت خوبصورت سا گھر لوں۔
☆:اپنی کون سی عادت بہت پسند ہے؟
♥:میں بہت ایماندار ہوں۔
☆:اپنی کون سی عادت سخت ناپسند ہے؟
♥:ایمانداری ہی سخت ناپسند بھی ہے مگر......
☆:زندگی میں کون سے رشتوں نے دُکھ دیے؟
♥:اللہ نہ کرے رشتے دکھ دیں۔
☆:لباس جگ بھاتا پہنتی ہیں یا من بھاتا؟
♥:من بھاتا۔
☆:اردو والے "سفر" کا ذریعہ کیا ہے؟
♥:اپنی گاڑی۔

☆: صبح کا آغاز کس طرح کرتی ہیں؟

♥: ناشتا کر کے۔

☆: دن کا کون سا پہرا اچھا لگتا ہے؟

♥: جب میں نیند پوری کر کے اٹھتی ہوں۔

☆: حساس ہیں یا......؟

♥: حد سے زیادہ۔

☆: کون سے ایسے معاشرتی رویے ہیں جو آپ کے لیے دکھ اور پریشانی کا باعث بنتے ہیں؟

♥: جھوٹ، فریب۔

☆: دولت، عزت، شہرت، محبت اور صحت اپنی ترجیح کے اعتبار سے ترتیب دیجیے۔

♥: محبت، صحت، عزت، شہرت، دولت۔

☆: سمندر کو دیکھ کر کیا خیال آتا ہے؟

♥: بہت رومانٹک۔

☆: پہلی ملاقات میں ملنے والے کی کس بات سے متاثر ہوتی ہیں؟

♥: اندازِ گفتگو۔

☆: خود ستائشی کی کس حد تک قائل ہیں؟

♥: یہ معاملہ انسانوں ہی کے ساتھ ہوتا ہے۔

☆: یاد کا کوئی جگنو جو تنہائی میں روشنی کا باعث بنتا ہو؟

♥: بچپن بہت یاد آتا ہے۔

☆: شوبز میں پہچان کون سا ڈرامہ بنا؟

♥: 'زندگی گلزار ہے' میرا پہلا پلے تھا۔ جس نے

مجھے پہچان دی۔ اللہ کا شکر ہے اب تک میرے تمام ڈرامے اور کردار ہٹ ہوئے ہیں۔

☆: غصے میں کیا کیفیت ہوتی ہے، خاموشی یا چیخ و پکار؟

♥: غصہ بہت کم آتا ہے۔

☆: لوگوں کی نظر میں آپ کی شخصیت کیسی ہے، اعلیٰ، اچھی، بس ٹھیک؟

♥: منہ پر کون کسی کی برائی کرتا ہے؟ سب تعریف کرتے ہیں۔

☆: موت خوف کا باعث ہے؟ اور اس کے علاوہ ڈرنے کی کوئی وجہ؟

♥: موت سے کون ڈرتا ہے؟

☆: فراز کے اس خیال پر کس حد تک یقین رکھتی ہیں کہ دوست ہوتا نہیں ہر ہاتھ ملانے والا؟

♥ : یہ تو حقیقت ہے۔
☆ : کھانا گھر کا پسند ہے یا باہر کا فاسٹ فوڈ؟
♥ : کھانا اچھا ہو، بھلے جہاں کا بھی ہو۔
☆ : کھانا کس کے ہاتھ کا پکا ہوا پسند ہے؟
♥ : اپنے ہاتھ کا پکا ہوا۔
☆ : کون سا کھانا اچھا پکا لیتی ہیں؟
♥ : کانٹی نینٹل کھانے اچھے بنا لیتی ہوں۔
☆ زندگی کے معاملات میں آپ تقدیر کی قائل ہیں یا تدبیر کی؟
♥ : دونوں کی۔
☆ : کون سے الفاظ عام بات چیت میں زیادہ استعمال کرتی ہیں؟
♥ : کبھی غور نہیں کیا۔
☆ : زندگی کا وہ کون سا پل تھا جس نے یکدم زندگی ہی تبدیل کر دی؟
♥ : شوبز میں آنے کے بعد زندگی خود بخود تبدیل ہوگئی۔
☆ : ویک اینڈ کیسے گزارتی ہیں؟
♥ : سو کر۔
☆ شہرت، رحمت ہے یا زحمت؟
♥ : رحمت ہے، اُس وقت تک جب تک سر پر نہ چڑھے۔
☆ : اگر آپ میڈیا پر نہ ہوتیں تو کیا ہوتیں؟
♥ : کچھ نا کچھ اسی فیلڈ میں کر رہی ہوتی۔
☆ : آئینہ دیکھ کر کیا خیال آتا ہے؟
♥ : اللہ کا شکر ادا کرتی ہوں۔
☆ : ''ہے زندگی کا مقصد اوروں کے کام آنا'' کس حد تک عمل کرتی ہیں؟
♥ : جتنا ہو سکے۔
☆ اس بات پر یقین رکھتی ہیں کہ موسیقی روح کی غذا ہے؟ اگر ہے تو کیسی موسیقی؟
♥ : بالکل، ہر اچھا میوزک پسند ہے۔

☆ : پسندیدہ شخصیت؟
♥ : قائداعظم۔
☆ : اپنے ملک کی کوئی اچھی بات؟
♥ : اگر ہم اچھے شہری بن جائیں تو ملک خود بخود اچھا لگنے لگے گا۔
☆ : کیا ہم آزاد ہیں؟
♥ : اللہ کا شکر ہے۔
☆ : لوگوں کی کوئی عادت جو بہت بری لگتی ہے؟
♥ : منافقت بہت ناپسند ہے۔
☆ : خودکشی کرنے والا بہادر ہوتا ہے یا بزدل؟
♥ : میں ایسے لوگوں کو جج نہیں کرتی کیونکہ مجھے لگتا ہے کہ کبھی کبھی انسان کے مینٹل پرابلمز بھی ہوتے ہیں۔
☆ : آپ پاکستان میں کس تبدیلی کی خواہاں ہیں؟
♥ : میں پاکستان کے ان قوانین کو تبدیل کروں گی جو خواتین کے لیے بالکل اچھے نہیں ہیں۔
☆ : مطالعہ عادت ہے یا وقت گزاری؟
♥ : عادت ہے۔
☆ : کون سا ملک پسند ہے؟
♥ : اپنے ملک کے علاوہ ترکی۔
☆ : شاپنگ کے لیے پسندیدہ جگہ؟
♥ : کوئی جگہ مخصوص نہیں۔ بہت سی جگہوں سے شاپنگ کرتی ہوں۔
☆ : جھوٹ کب بولتی ہیں؟
♥ : جب کسی کا دل نہ دکھانا ہو تب۔
☆ : انٹرنیٹ اور فیس بک سے کتنی دلچسپی ہے؟
♥ : زیادہ کریز نہیں ہے۔ بہت نارمل ہوں۔
☆ : مردوں کی کیا بات سب سے اچھی لگتی ہے؟
♥ : عورتوں کو عزت دینے والے مرد پسند ہیں۔
☆ : مردوں کی سب سے بری بات کیا لگتی ہے؟
♥ : مردوں کا غصہ بہت برا لگتا ہے۔
☆ : حرف آخر کیا چاہنا چاہیں گی؟
♥ : زندگی خوبصورت ہے، اس کی قدر کریں۔

☆☆......☆☆

مِنی اسکرین پر پیش کیے جانے والے مقبولِ عام ڈراموں پر بے لاگ تبصرہ

م ش خ

اِس وقت پاکستان میں تقریباً بیسیوں چینل عوام کی دسترس میں ہیں۔ اِس الیکٹرانک خوشحالی میں جہاں عوام کے پاس معیاری ڈراما دیکھنے کا کال نہیں، وہیں ڈراموں کی بہتات نے بہتر سے بہترین، معیار اور کوالٹی کے لیے چوائس آسان کردی ہے۔ مِنی اسکرین میں ہم مقبولِ عام ڈراموں پر بے لاگ تبصرہ شائع کریں گے۔

دل نہیں مانتا

ARY ڈیجیٹل سے پیش کیے جانے والے ڈرامہ سیریل 'دل نہیں مانتا' میں احسن اقبال ایک اچھے بزنس

جاوید شیخ، روبینہ اشرف اور عمار عرفانی 'دل نہیں مانتا' میں

مین ہیں اور وہ اپنے باپ کی جائیداد کی وجہ سے بزنس کرنے میں کامیاب ہوئے۔ والدہ کے انتقال کے بعد انہوں نے اپنی چھوٹی بہنوں کا بہت خیال رکھا۔ احسن اقبال کی بیوی شاہانہ ایک سمجھدار خاتون ہیں۔ احسن اقبال چاہتے ہیں کہ اُن کی بہنوں کی شادیاں ہوجائیں۔ احسن اقبال کی بیوی شاہانہ کا کہنا ہے کہ احسن کی بہنیں بہت چالاک ہیں۔ سیریل 'دل نہیں مانتا' کو لکھا ہے سیما غزل نے جبکہ ہدایات افتخار افی کی ہیں۔ اس کے فنکاروں میں جاوید شیخ، روبینہ اشرف، سلما حسن، عمار عرفانی، سارہ خان، آمنہ الیاس، گل رعنا، سیما پاشا، آغا شیراز اور شافی حسن شامل ہیں۔ یہ سیریل ہر ہفتے کی رات ARY ڈیجیٹیل سے 9 بجے دکھائی جارہی ہے۔

نہ کترو پنکھ میرے

ARY ڈیجیٹل کی ڈرامہ سیریل 'نہ کترو پنکھ میرے' کی کہانی یہ ہے کہ اکیس سالہ نامیہ اپنے والد پروفیسر عمار کے ساتھ دو بہنوں شادمین اور حرا کے ساتھ رہتی ہے۔ یہ ایک خوشحال فیملی ہے۔ نامیہ ریحان کو چاہتی ہے۔ سام شادمین کو پسند کرتا ہے۔ نامیہ ریحان سے شادی کرلیتی

ہے مگر اس شادی کا انجام کیسا ہوا یہ تو سیریل 'نہ کترو پنکھ میرے' دیکھ کر ہی پتا چلے گا۔ اے آر وائی 'زندگی' سے ہفتہ اور اتوار کی رات 8 بجے دکھایا جارہا ہے۔ اس سوپ کو تحریر کیا ہے ارم وسیع اور صائمہ وسیع نے جبکہ ہدایات نین بنیار کی ہیں۔ فنکاروں میں صبا قمر، حسین رضوی، دانش تیمور، نبیل، اسد، رابعہ نورین، پرویز رضا اور دیگر شامل ہیں۔ سوپ 'نہ کترو پنکھ میرے' ناظرین کی توجہ کا مرکز بن رہا ہے۔

میرے خواب لوٹا دو

ARY زندگی کی ڈرامہ سیریل 'میرے خواب لوٹا دو' کو تحریر کیا ہے ثمینہ اعجاز نے، ہدایات ہشام سعید کی ہیں۔ ہر لڑکی کی آنکھوں میں زندگی کے حسین خواب ہوتے ہیں مگر کچھ پتا نہیں ہوتا کہ نصیب کہاں تک ساتھ دے گا۔ سیریل 'میرے خواب لوٹا دو' کے فنکاروں میں اعجاز اسلم، صبا فیصل، سمیعہ اظہر اور دیگر فنکار شامل ہیں۔ یہ سیریل ہر ہفتے کی رات 8 بجے اے آر وائی زندگی سے دکھائی جائے گی۔ ادھر دو خوبصورت سیریل نے تو کمال کردیا۔ جسے عوام توجہ سے دیکھ رہے ہیں۔ سوپ 'اور پیار ہوگیا' جس کے فنکاروں میں کانچی سنگھا اور مس گھاٹ رام شامل ہیں۔ یہ سوپ پیر سے جمعرات تک اے آر وائی زندگی سے دکھائی جارہی ہے جبکہ سیریل 'پیار تو نے کیا' کے فنکاروں میں میانگ چنگ سوربالی جوشی شامل ہیں۔ یہ سیریل ہر اتوار کی رات 7 بجے اے آر وائی زندگی سے دکھائی جارہی ہے۔

'میرے خواب لوٹا دو' میں صائمہ اظہر

دوسری بیوی

ARY ڈیجیٹل کی سیریل 'دوسری بیوی' کو تحریر کیا ہے ثمینہ اعجاز' ہدایات انجم شہزاد جبکہ فنکاروں میں فہد مصطفیٰ، مریم فاروق، ماہا وارثی، شہریار زیدی، امبر واجد

'دوسری بیوی' میں فہد مصطفیٰ اور ماہا وارثی

اور فاطمہ قابل ذکر ہیں۔ یہ سیریل ہر پیر کی رات 8 بجے ARY ڈیجیٹل سے دکھائی جائے گی۔

ڈرامہ سیریل 'جینا دشوار سہی'

اقبال بانو کی نئی ڈرامہ سیریل 'جینا دشوار سہی' ہر منگل کی شب رات 07:45 بجے پی ٹی وی ہوم سے ٹیلی کاسٹ ہورہا ہے اور پسندیدگی کا تناسب ہر قسط کے بعد بتدریج اوپر کی جانب بڑھ رہا ہے۔ اِس وقت ...... یہ ڈرامہ مقبولیت کے اعتبار سے ٹاپ 3 ڈراموں میں سرفہرست ہے۔

اقبال بانو کی تحریریں سماجی و گھریلو مسائل کا احاطہ کرتی ہیں۔ یہ کہانی بھی دو بہنوں کی کہانی ہے مگر اس میں دو سوتیلی بہنیں آپس میں کس قدر محبت کرتی ہیں کہ

سوتیلی بہن کی خاطر دوسری بہن اپنی سگی ماں سے لڑ پڑتی ہے۔ اِس ڈرامے کو 7th SKY پروڈکشن نے بنایا ہے اور ڈرامے کے ڈائریکٹر شعیب خان ہیں۔ اداکاروں میں اریج فاطمہ، عفان جنید، ہما نواب، محسن گیلانی اور سینئر فنکار منظور قریشی شامل ہیں۔ جینا دشوار سہی بدھ کی صبح 11 بجے دوبارہ ٹیلی کاسٹ کیا جاتا ہے۔

☆☆......☆☆

عشق کی راہداریوں، طبقۂ اشرافیہ اور اپنی مٹی سے جڑے
لوگوں کی عکاسی کرتے سلسلے وار ناول کی پندرہویں کڑی

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

ملک قاسم علی جہان آباد کے مالک تھے۔ان کا شمار ضلع خوشاب کے جانے مانے زمینداروں میں ہوتا تھا۔ان کے دو بیٹے ملک عمار علی اور ملک مصطفیٰ تھے۔عمار علی ریاست کے امور میں دلچسپی لیتے تھے جبکہ ملک مصطفیٰ علی چھوٹی بہن امل کے

ساتھ تعلیم کے سلسلے میں لاہور رہائش پذیر تھے، ملک عمار علی کی شادی ان کی کزن ماہین سے ہوئی تھی۔ وہ اٹھارہ سالہ لڑکی خود سے عمر میں کئی سال بڑے ملک عمار علی کو ذہنی طور پر قبول نہ کر سکی تھی۔ وہ کانوینٹ سے پڑھی ہوئی اور خاصے آزاد خیالات رکھتی تھی، جو لائف بھرپور طریقے سے انجوائے کرنا چاہتی تھی۔ ام فروا ام زارا اور اسماعیل بخش مولوی ابراہیم کی اولادیں ہیں۔ ام فروا کی شادی بلال حمید سے ہوئی ہے جو میڈم فیری کے لیے کام کر رہا ہے۔ میڈم فیری کا تعلق اس جگہ سے تھا جہاں دن سوتے اور راتیں جاگتی ہیں۔ بلال حمید ام فروا کو پہلی بار میکے لے کر آیا تھا کہ میڈم فیری کی کال آگئی......

میڈم فیری نے بلال عرف بالو کو باور کرایا کہ جلد ام فروا کو ان کے حوالے کر دے۔ بلال حمید کے لیے یہ ناممکن سا ہو گیا تھا کیونکہ وہ ام فروا سے واقعی محبت کرنے لگا تھا۔ ماہین اپنے دیور مصطفیٰ علی میں دلچسپی لینے لگی تھی۔ امل کی تعلیم مکمل ہوتے ہی اُس کی شادی اُس کے کزن محمد علی کے ساتھ ہونے کی تیاریاں ہونے لگی تھیں لیکن امل کے خیالات کسی اور طرف بھٹکنے لگے تھے۔

ماہین اپنے بچپن کے دوست کاشان احمد سے ملتی ہے تو پتا چلتا ہے کاشان بچپن ہی سے اُس میں دلچسپی لیتا تھا مگر کبھی محبت کا اظہار نہ کر پایا۔ ماہین اپنے آئیڈیل کے اس طرح بچھڑ جانے پر دکھی ہے۔ کاشان احمد ملک سے باہر جانے سے پہلے ماہین سے محبت کا اظہار کر دیتا ہے۔ ماہین ملک عمار علی سے ویسے ہی ناخوش ہے اس پر کاشان احمد کا اظہارِ محبت اُس کی زندگی میں ہلچل مچا دیتا ہے۔

ماہین کے دل میں کاشان احمد کی محبت بھی جڑ پکڑ رہی ہے اور اب وہ عمار علی کی شدتوں سے مزید خائف ہونے لگی ہے۔ امل کی شادی اس کے کزن محمد علی کے ساتھ ہو جاتی ہے۔ محمد علی اُسے محبتوں کی بارش میں نہلا دیتا ہے اور یوں فوجی افسر کی بیوی بن کر وہ اپنی پہلی محبت کی یادوں سے پیچھا چھڑا لیتی ہے۔ ماہین اور عمار علی کے بیچ میں تکرار ہونے لگی ہے۔ میڈم فیری بلال کو ام فروا پر کڑی نظر رکھنے کا کہتی ہے۔ ایک دن اچانک بلال کی ملک مصطفیٰ علی سے ملاقات ہو جاتی ہے اور وہ انہیں اعتماد میں لے کر اپنی اور ام فروا کی رام کہانی سنا دیتا ہے۔ ملک مصطفیٰ علی اُسے اپنے ساتھ مراد ولا میں لے جاتا ہے اور انیکسی میں رہائش اختیار کرنے کا حکم دیتا ہے۔ فیری بلال کی تلاش میں ہے۔

اچانک ملک قاسم علی کی وفات ہو جاتی ہے۔ سارا جہان آباد سوگ میں ڈوبا ہے۔ ملک عمار علی سارے انتظام اپنے ہاتھ میں لے کر بڑے ملک کے فرائض انجام دینے لگتے ہیں۔

ماہین کی ذرا سی غفلت اُسے نہ چاہتے ہوئے بھی ماں بنا دیتی ہے۔ مگر......

(اب آگے پڑھیے)

ماہین حسان کو اوپر کا دودھ لگانا چاہتی تھی لیکن مہرالنساء نے سختی سے منع کر دیا۔

''تم اس کو اپنا دودھ پلاؤ گی۔ ہمارے ہاں مائیں بچوں کو اپنا دودھ پلاتی ہیں، اسی لیے تو ہمارے بچے اپنی ماؤں سے اتنا پیار کرتے ہیں۔ پتر ماں کے دودھ میں بڑی تاثیر ہوتی ہے۔ ماں کا دودھ بچے کو بیماریوں سے بچاتا ہے۔''

پھوپی ماں نے اتنا لمبا چوڑا لیکچر دیا تھا کہ تیسرے دن سے ہی وہ حسان علی کو اپنا دودھ پلانے لگی تھی۔ مہرالنساء زبردستی ماہین کو فروٹ، دودھ جوس، کھلاتی پلاتی رہتیں۔ مہرالنساء ہر تھوڑی دیر بعد اُسے کچھ کھانے کو کہتیں۔ اب وہ تنگ آ چکی تھی اس زبردستی سے۔ اس کا دل نہ بھی ہوتا تو بھی اُسے کھانا پڑتا۔ اسے دودھ اچھا نہیں لگتا تھا لیکن پھوپی ماں کا اصرار ہوتا کہ وہ خالص دودھ پیے تاکہ بچے کو پیٹ بھر کر ماں کا دودھ ملے۔ ملک قاسم علی کے جانے کے بعد مہرالنساء ماہین کا اور زیادہ خیال رکھنے لگی تھیں۔

عمار علی نے اب ماہین کو اُف تک کہنا چھوڑ دیا تھا۔ حسان علی تو اپنے بابا کی جان تھا۔ جتنا ٹائم گھر پر رہتے 'چھاموُ' اُن کی گود میں رہتا۔ وہ پیار سے اُسے 'چھاموُ' بولتے تھے۔ جب لیٹتے تو حسان علی کو اپنے پیٹ پر لٹا لیتے۔ وہ خوب ہاتھ پیر چلاتا، ہنستا تو ہنستا چلا جاتا۔ اُس کی پیاری سی غوں غاں کی آواز کمرے کو رونق بخش جاتی۔

ممی نے پانچ لاکھ ماہین کے اکاؤنٹ میں ڈلوادیا تھا۔
''اپنی اور بچے کی شاپنگ کر لینا، ہم انشاء اللہ آیان ارسل کی چھٹیوں میں ضرور پاکستان آئیں گے۔'' اب ماہین نے ممی پاپا کا ذکر کرنا چھوڑ دیا تھا۔
اس روز ماہین ملک عمار علی سے کہہ رہی تھی۔ ''عمار اب میں یہاں بور ہونے لگی ہوں۔ کیوں ناں کچھ عرصہ لال حویلی میں چل کر رہا جائے۔ مصطفیٰ بھائی وہاں اکیلے بور ہوتے رہتے ہوں گے۔ انہیں بھی تو گھر کا ماحول ملنا چاہیے۔ مہینے میں ہم پندرہ دن وہاں رہا کریں اور پندرہ دن یہاں۔ میں اپنی فرینڈز سے بھی مل لیا کروں گی۔ کبھی انہیں اپنے ہاں بلالیا۔ شاپنگ کا بھی یہاں پر مسئلہ ہے۔ اب تو میری طبیعت میں خاصی بیزاری چھا چکی ہے۔'' وہ خاصی لمبی تمہید باندھ کر اپنی بات ملک عمار علی کو سمجھانا چاہ رہی تھی۔
''ماہی میں پندرہ پندرہ دن وہاں نہیں رہ سکتا۔ یہاں بہت کام ہیں۔ اب تو بابا جان بھی نہیں ہیں۔'' اُن کے ذکر پر عمار علی ہمیشہ رنجیدہ ہو جایا کرتے تھے۔ ''ماہی پہلے میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا تھا اب چھامو کے بنا نہیں رہ سکتا۔ مہینے بعد تم چند دن چلی جایا کرو لال حویلی۔ اس دوران دوستوں سے مل لیا، شاپنگ کر لی۔'' ملک عمار علی اب ماہین پر زیادہ روک ٹوک نہیں رکھنا چاہتے تھے کیونکہ وہ نہیں چاہتے تھے ماہین کبھی بھی پریشان ہو۔ اب تو چھامو کے آجانے سے اُن کا رشتہ مضبوط ہو چکا تھا۔ اُن کے دل میں بیٹھے تمام وسوسے ختم ہو چکے تھے۔ اب ماہین کی طرف سے انہیں کسی قسم کا خوف نہیں رہا تھا۔
ماہین خوش تھی کہ وہاں رہنے کی اُسے اجازت تو ملی، قیام خود ہی بڑھا لیا کرے گی۔
''کل آپ میرے ساتھ چلیں گے یا ڈرائیور سراج اور شہزادی کے ساتھ جاؤں۔ گلنار بھی میرے ساتھ جائے گی۔ حسان کو وہی سنبھالتی ہے اور یہ بھی گلنار سے بہت مانوس ہے۔'' ماہین پیار سے حسان علی کو دیکھ کر مسکرائی جو ملک عمار علی کے پیٹ پر مزے سے سو رہا تھا۔
''میں خود تمہیں چھوڑ کر آؤں گا۔ چھامو کے بغیر رہنا تو بہت مشکل ہو جائے گا'' انہوں نے احتیاط سے اُسے اُٹھا کر 'کاٹ' میں لٹا دیا۔

☆......☆......☆

لاہور آئے اسے تین چار روز ہو چکے تھے۔ ماہین نے اپنے آنے کی اطلاع سب دوستوں کو دے دی تھی۔ انٹرنیٹ پر تو سبھی سے رابطہ رہتا تھا۔ دری نے اسے بتا رہی تھی کاشان نے دوبارہ لاہور میں ٹرانسفر کرالی ہے کیونکہ کراچی کے حالات دن بدن خراب ہوتے جا رہے تھے۔ افرا آنٹی وہاں پریشان رہتی تھیں۔ ہر وقت انہیں کاشان کی فکر رہتی تھی۔ انکل احمد کو بھی وہاں کی آب و ہوا سوٹ نہیں کر رہی تھی۔ تقریباً چار ماہ سے وہ لاہور میں ہے۔ تم سے کوئی رابطہ کیا اُس نے۔'' دری نے پوچھا۔
''نہیں۔'' ماہین اُداس ہوگئی۔
''ماہی وہ صرف تم سے اس لیے رابطہ نہیں رکھنا چاہتا کیونکہ وہ نہیں چاہتا تمہاری پرسنل لائف اُس کی وجہ سے ڈسٹرب ہو۔ تم صرف اور صرف عمار اور اُس کے بچے پر توجہ دو۔ ماہی وہ سمجھتا ہے اگر تم نے اتنے لوگوں کا دل دکھا کر اُس کی طرف رجوع کیا تو شاید کبھی حقیقی، دائمی خوشی تم دونوں کو نہ مل پائے۔ خدا کی مرضی تسلیم کرتے ہوئے کاشان احمد نے صبر کر لیا ہے۔ پھر تم ایسا کیوں نہیں کر سکتیں۔ بس اسی لیے وہ تم سے رابطہ نہیں رکھنا چاہتا تا کہ تم بار

بار اُس کی خاطر بکھرتی نہ رہو۔ میں نے اُسے تمہارے بیٹے کے متعلق بتایا تھا۔ وہ بہت خوش ہوا۔ میں نے عرصے بعد اُسے کھل کر ہنستے دیکھا تھا۔ تمہاری خوشی میں وہ بے حد خوش ہوتا ہے۔ ایک دن وہ مجھ سے کہہ رہا تھا۔ دری میں کبھی بھی ماہی کو افسردہ نہیں دیکھ سکتا۔ ماہی تمہاری خوشی ہی اُس کے چہرے پر مسکراہٹ لا سکتی ہے۔ وہ اب بھی تمہیں اپنی اچھی دوست سمجھتا ہے۔ ہم جب بھی اُس سے ملتے ہیں وہ تمہارا ذکر کرتا ہے کہ وہ کیسی ہے، پہلے کی طرح پیاری ہے، ویسی ہی اسمارٹ ہے یا گوشت کا پہاڑ بن گئی ہے۔ ہنستی ہے تو اب بھی اُس کی نیلی آنکھوں میں جگنو چمکتے ہیں۔ ماہی وہ خوف زدہ ہے۔ اسی لیے تم سے کوئی رابطہ نہیں رکھنا چاہتا۔ کہیں اُس کی پابند سوچیں بغاوت نہ کر جائیں۔ اُسے دیکھ کر تمہارے پیر نہ اکھڑ جائیں۔ اگر تم صرف ایک مخلص دوست کی طرح اُس سے رابطے میں رہنا چاہتی ہو تو میں اُسے فورس کروں گی، پر تم دوستی سے زیادہ کچھ امید نہیں رکھو گی اُس سے پھر ہم سب دوست پہلے کی طرح ملا کریں گے۔''

وہ خاموشی سے دری کی باتیں سنتی رہی تھی۔ یک بارگی وہ تیزی سے بولی۔ ''دری میں کاشان کو اپنے دل سے نہیں نکال سکتی۔ اُس نے تو مجھے محبت کا مفہوم سمجھایا ہے۔''

''ماہین تم کیوں بھول جاتی ہو کہ تم ایک ماں بھی ہو۔ تمہیں ہر بات بھلا کر صرف اپنے بچے کے بارے میں سوچنا ہوگا۔ خدا کا شکر ادا کرو اُس نے تمہیں کس قدر خوبصورت بیٹا عطا کیا ہے۔ جس بچے کو تم کبھی دنیا میں لانا ہی نہیں چاہتی تھیں۔ دیکھ لو خدا جو چاہے وہ کرتا ہے کیونکہ وہ بے نیاز ہے۔ تمہارے نا چاہنے کے باوجود رب نے تمہیں ماں کے درجے پر فائز کر دیا۔ اسی بچے کی وجہ سے تمہارے قدموں کے نیچے جنت کو لازم قرار دے دیا گیا۔ یار تم بہت لکی ہو۔ مجھے دیکھو میرا ہزبینڈ مجھے بالکل پسند نہیں کرتا۔ حالانکہ میں ہر اعتبار سے اُس سے بہتر ہوں۔ میری سیلری چالیس ہزار ہے اور شیراز کی پچاس ہزار، بات بات پر مجھے ڈانٹ دیتا ہے۔ مجھے ہر بات پر مردوں میں کام کرنے کے طعنے دیتا ہے۔ اُس کا موڈ بھی، کسی وقت صحیح نہیں رہتا۔ گھر بھی مجھے کمپنی کی طرف سے ملا ہوا ہے۔ جب بھی گھر کے خرچ کے لیے اس سے رقم مانگوں تو لڑائی شروع کر دیتا ہے۔ تمہاری اتنی سیلری ہے وہ کہاں خرچ کرتی ہو؟ تینوں بچوں کی فیسیں، بجلی گیس کے بل تو وہ دے دیتا ہے۔ باقی تمام اخراجات مجھے پورے کرنے ہوتے ہیں۔ اپنی کمائی کا زیادہ حصہ شراب اور دوستوں کو کھلا پلا دیتا ہے۔ آج کل ایک کولیگ لڑکی پر فدا ہے۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اسے لوٹ رہی ہے۔ سارا دن آفس میں دماغ کھپاتی ہوں، شام کو تھک کر گھر جاؤں تو ساس صاحبہ کی بک بک، چخ چخ سننی پڑتی ہے۔ بات بات پر طعنے دیتی ہیں کہ خود تو سارا دن اے سی والے دفتر میں آرام فرماتی ہے اور گھر بھر کی ذمے داریاں مجھ پر ڈال دی ہیں۔ حالانکہ نوکر بھی رکھا ہوا ہے جو کھانا تک بناتا ہے۔ ماہی تم تو خوش نصیب ہو جسے نیک اور محبت کرنے والا خاوند ملا ہے۔ ساس تمہاری ماؤں کی طرح اچھی ہیں۔ جتنا چاہو خرچ کر لو، کوئی روک ٹوک نہیں۔ خدا نے اب تمہیں اولاد کی نعمت سے بھی نواز دیا۔ ماہی تمہیں ابھی دنیا کے دکھوں کا اندازہ نہیں ہے کیونکہ تم سونے کا چمچہ منہ میں لے کر پیدا ہوئی ہو۔ اُدھر بیبو کو دیکھو دو بچے بھی ہو گئے ہیں اور اب آ کر وہ دونوں میاں بیوی ایک ساتھ رہنے کو تیار نہیں ہیں۔ وہ ایک دوجے سے سخت نالاں ہیں۔ بچے ان دونوں کی آئے دن کی لڑائیوں میں پس رہے ہیں۔ ماہی تم عقل کے ناخن لو اور کاشان احمد کا خیال اپنے دل سے نکال دو۔ اگر تمہیں اُس سے محبت کرنی ہی تھی تو شادی سے پہلے کرتیں۔ وہ بھی تو چودہ سال کی عمر سے تم سے محبت کر رہا ہے۔ جب تمہاری شادی ہو گئی تو اُس نے اس لیے صبر کر لیا کہ تمہاری ازدواجی زندگی

خراب نہ ہو۔ یہی سوچ کر خداوند نے تم دونوں کا جوگ نہیں لکھا۔ پھر قسمت کو کوسنے یا مقدروں سے سر ٹکرانے کا فائدہ؟ ماہی ڈیئر تم اب کاشان احمد کو بھول کر اپنی شادی شدہ زندگی پر توجہ دو۔ ورنہ بہت دیر ہو جائے گی۔ تمہارے اس گیم میں تمہارا بچہ متاثر ہوگا۔ تم ملک عمار علی کے بارے میں سوچ کر تو دیکھو۔ تم پتھر تو نہیں ہو جو موم نہ ہو سکو گی۔ عمار علی سے تمہارے کتنے رشتے ہیں۔ کیا اُن تمام رشتوں کو دکھی کر دو گی۔ صرف اپنی خوشی کی خاطر! یار تم اتنی سیلفش کیوں ہو۔ کبھی تو خود سے ہٹ کر کسی اور کے بارے میں بھی سوچو۔ تم اُس بندے کی قدر نہیں کر رہی ہو، جس نے اپنے تمام جذبے تم پر تیاگ دیے۔ جواب تم سے پہلے سے بھی زیادہ محبت کرتا ہے۔ اُس نے تمہارے مقابل کسی دوسری عورت کو شراکت دار نہیں ٹھہرایا۔ وہ سچائی سے تمہارا بن کر رہ رہا ہے۔ اس کا بھائی ہے مصطفیٰ علی، تم نے خود بتایا ہے ناں کہ تم نے اکثر اُس کے کمرے سے چوروں کی طرح نوکرانیاں نکلتی دیکھی ہیں۔ لال حویلی کے مردان خانے میں بھی وہ عورتیں لاتا ہے۔ تم نے اپنے شوہر کو کسی عورت کو کن اکھیوں سے دیکھتے ہوئے دیکھا۔ ماہی تم خوش نصیب ہو۔ ایسا نہ ہو وقت تمہارے ہاتھوں سے پھسل جائے۔ آج تک جاتے لمحوں کو کوئی نہیں روک سکا۔ تم ملک عمار علی کی طرف دھیان تو دو۔ اپنے بچے کی خاطر ہی سہی۔ اگر عمار علی تم سے چودہ سال بڑے ہیں تو کیا ہوا، مرد کبھی بوڑھا نہیں ہوتا۔ لڑکیوں کی اکثریت میچور مرد کو آئیڈلائیز کرتی ہے کہ بڑے عمر کے مرد زیادہ محبت دیتے ہیں۔ میرے نانا میری نانو سے بیس سال بڑے تھے۔ اُن کی لائف مثالی گزری ہے۔'' دریِ شہوار کب سے ماہین کو سمجھا رہی تھی۔ وہ خاموشی سے دری کی باتیں سنتی رہی۔ آج ماہین نے اُس کے ساتھ بحث نہیں کی تھی، خود کو مظلوم اور ستم زدہ نہیں گردانا تھا۔

☆......☆......☆

بلال حمید اور اُم فروا کو لال حویلی آئے ایک ہفتہ ہو چکا تھا۔ اس دوران جب بھی وہ بلال حمید کے سامنے آتی، وہ اُس سے معافیاں مانگتا۔ بار بار کہتا خدا بھی تو اپنے بندوں کو معاف کر دیتا ہے تم بھی معاف کر دو۔ مجھ سے بہت بڑی بھول ہو گئی ہے۔ اب میں اپنی غلطی سدھارنا چاہتا ہوں۔ پلیز تم مجھے صرف ایک موقع دو۔ میں تم جیسی نیک لڑکی کے قابل ہر گز نہیں ہوں۔ میں کبھی تم پر اپنا حق نہیں جتاؤں گا۔ تم میری طرف سے بے فکر ہو جاؤ۔ بس مجھے معاف کر دو۔''

اُم فروا بلاوجہ بلال حمید کے سامنے نہیں آتی تھی۔ سامنا ہو جاتا تو کنی کترا جاتی لیکن وہ اس کے پیچھے آ کر اپنی بات پوری ضرور کرتا۔ اب وہ کھانا خود بنانے لگی تھی۔ وہ خاموشی سے کھانا بلال کے سامنے رکھ دیتی اور اندر چلی جاتی۔ دو تین مرتبہ اُم فروا نے گھر پر فون بھی کیا تھا۔ وہ اُن سب کے لیے بہت اُداس تھی۔ بے بے جی کہتیں۔ ''پتر آ کر مل جاؤ۔'' وہ مسکراتی۔

''بے بے جی گھر شفٹ کیا ہے ناں کچھ مصروف ہوں۔''

''پتر وہ فلیٹ تو بلال حمید کا تھا پھر اُسے کیوں چھوڑ دیا؟'' اس نے پھر بہانہ کیا۔

''بے بے جی وہ اُن کے دفتر سے بہت دور تھا۔ اب ان کے دوست نے انہیں فیکٹری میں گھر دیا ہے۔ فلیٹ تو کرائے پر دے دیا ہے۔'' اُسے جھوٹ بولنا پڑ رہا تھا اور وہ بے بے جی کے سامنے خود کو خاصا شرمندہ محسوس کر رہی تھی۔ گھر والوں کو مطمئن کرنے کے لیے اسے ایسا کرنا پڑا تھا۔ وہ خدا سے اپنے اس مصلحت آمیز جھوٹ کی معافی مانگ رہی تھی۔

''بے بے جی آپ آ جائیں ناں؟'' وہ اوپر سے کہتی۔ ورنہ وہ اُن کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ انہیں دیکھ کر کہیں صبر کے تمام پیمانے لبریز ہی نہ ہو جائیں۔

تین چار دن سے اسے ٹمپریچر تھا، بی پی لو ہو گیا تھا۔ بلال حمید ڈاکٹر سے اس کے لیے دوائیں لایا تھا۔ اب وہ پہلے سے قدرے بہتر ہو چکی تھی لیکن کمزوری ابھی بھی باقی تھی۔ رنگت بھی پھیکی پڑ گئی تھی۔ دن رات اُس کا دماغ سوچتا رہتا۔ وہ کتنے مان واعتماد سے داخل ہوئی تھی بلال حمید کی زندگی میں۔ اس نے میرا مان توڑ دیا۔ اگر...... اگر خدا...... اس کے دل میں میرے لیے رحم نہ ڈالتا تو میرا کیا ہوتا۔ یہ تو سوہنے رب کی طرف سے ایک معجزہ ہی ہو گیا۔ ورنہ یہ پیشہ ور شخص جسے دس لاکھ ملنے والے تھے، مولوی ابراہیم کی اس بیٹی کے عوض...... خدا ہی نے تو بلال حمید کے دل کے اندر اُم فروا کی محبت اور رحم ڈال کر اس کی عزت محفوظ کر دی تھی۔ اگر بلال حمید کے دل میں خدا نے اُم فروا کی شرافت ومحبت نہ ڈالی ہوتی تو وہ کب کا اسے طلاق دے کر فیری کو بیچ چکا ہوتا اور پھر نئے شکار کی طرف نکل جاتا۔

بلال حمید ممنون تھا اُم فروا کا جس کی وجہ سے اس نے فلاح پائی، صراطِ مستقیم کے راستے کو اپنایا، نماز کا پابند بنا، بچپن میں پڑھا ہوا قرآنِ پاک نہایت عقیدت ومحبت سے دوبارہ پڑھنے لگا۔ عبادت کے نوافل کثرت سے پڑھنے شروع کر دیے۔ یہ تمام تبدیلیاں صرف اُم فروا کی وجہ سے اس میں آئیں۔

اُم فروا دن بھر اپنے کمرے میں رہتی۔ قرآنِ پاک پڑھتی یا تسبیح پڑھتی رہتی۔ دو تین بار ملک مصطفیٰ علی آئے لیکن وہ اُن کے سامنے نہ گئی۔ اکثر وہ سہم کر سوچتی نجانے اب یہ دونوں مل کر میرے ساتھ کیا کھیل کھیلنے والے ہیں۔ خدا پھر اُسے امید کا دامن پکڑا دیتا۔ خدانخواستہ اُن کی اگر ایسی نیت ہوتی تو اب تک مجھے اس عورت کے حوالے کر چکے ہوتے۔

بلال حمید اُم فروا کے سامنے نظریں جھکا کر آتا۔ شرمندگی کے بوجھ سے اُس کی نگاہیں اُوپر اٹھ ہی نہ پاتیں۔

صبح ناشتہ سے فارغ ہو کر اُم فروا نے پورے گھر کی صفائی کی حالانکہ ملک مصطفیٰ علی نے بلال حمید سے کہا تھا۔ مالی کی بیوی گھر کے کام کاج کر دیا کرے گی۔ لیکن اُم فروا نے منع کر دیا تھا کہ کام ہی کتنا ہوتا ہے گھر کا۔'' صفائی سے فارغ ہو کر وہ اپنے کپڑے استری کرنے لگی تھی۔ بلال حمید اب اس سے اپنا کوئی کام نہیں کرواتا تھا۔ وہ دھوبی کو اپنے کپڑے دے آتا تھا۔ اُم فروا نے بھی چپ سادھ رکھی تھی۔ ویک اینڈ کے اس دن بلال حمید ٹی وی دیکھ رہا تھا کہ اچانک ملک مصطفیٰ علی آ گئے۔

''السلام علیکم ملک صاحب!'' دروازہ کھولتے ہوئے بلال حمید مسکرایا۔

''وعلیکم السلام، کیسے ہو بلال؟''

''اللہ کا شکر ہے جناب۔'' دونوں باتیں کرتے ہوئے ہال میں آ گئے۔

''اُم فروا کیسی ہے؟'' بلال حمید کے چہرے پر اُداسی بڑھی۔

''کیا ابھی تک تم سے ناراض ہے؟'' ملک مصطفیٰ بیٹھتے ہوئے بولے۔

''ملک صاحب میں نے اُس کے ساتھ کوئی تھوڑی زیادتی تو نہیں کی جو اُس کی ناراضگی ختم ہو؟''

''ہاں زخم ابھی تازہ ہے بھرنے میں کچھ تو ٹائم لگے گا۔ اور کچھ؟''

''سب ٹھیک چل رہا ہے۔''

''کوئی پرابلم تو نہیں ہوئی؟''

''فیری کو میں نے فون کیا تھا بہت بگڑی ہوئی تھی۔ بولی تم بن بتائے غائب ہو گئے ہو۔ اب اپنے انجام کے خود ذمے دار ہو گے۔ میں تمہیں زمین کے آخری پاتال سے بھی ڈھونڈ لوں گی۔ ملک صاحب مجھے فکر صرف یہ ہے کہ وہ مولوی صاحب کی فیملی کو کوئی نقصان نہ پہنچائے۔''

''بلال اُس کی اتنی ہمت نہیں ہے۔ آج ہی اُس کی طرف چلیں گے، تم تیار رہنا۔ چار لاکھ میں اُس کے منہ پر مار آؤں گا۔''

''آپ چائے پئیں گے۔''

''نہیں اب میں چلوں گا۔'' وہ اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

''تم سے کہا تھا گھر کے کاموں کے لیے مالی کی بیوی کو رکھ لو۔''

''ملک صاحب میں نے اُم فروا سے بات کی تھی۔ اُس نے انکار کر دیا ہے۔ یقیناً اُس نے سوچا ہو گا گھر میں نوکرانی آئے گی تو سو سوال کرے گی۔''

''اچھا میں چلتا ہوں، ظہر کی نماز کے بعد فیری کی طرف چلیں گے۔''

''جی بہتر۔'' ملک مصطفیٰ علی اب باقاعدگی سے نماز پڑھنے لگے۔

☆......☆......☆

ظہر کی نماز مسجد میں پڑھ کر آنے کے بعد بلال حمید نے چار لاکھ سنبھال کر جیب میں رکھے اور اُم فروا کو دروازہ بند کرنے کی تاکید کرتا ہوا لال حویلی کے مردان خانے کی طرف چلا گیا۔ مالی اس وقت اُن کے لان کی گھاس اور پودوں کی تراش خراش میں لگا ہوا تھا۔ گھر سے نکلتے ہوئے بلال حمید نے اُسے بھی تاکید کر دی تھی۔

''اندر بی بی ہیں اُن کا خیال رکھنا۔''

اس وقت ملک مصطفیٰ علی کی جیپ گلبرگ میں فیری کے گھر کی طرف جا رہی تھی۔ پچھلی سیٹ پر ملک مصطفیٰ علی کے دو گن مین بیٹھے ہوئے تھے۔ اب جیپ فیروزہ ملک کے گیٹ کے سامنے کھڑی ہوئی تھی۔ سکیورٹی گارڈ سے سلام دعا کے بعد بلال حمید نے گیٹ کھولنے کو کہا تو اُس نے فوری طور پر گیٹ کھول دیا۔ جیپ اندر آ چکی تھی۔ بلال حمید نے فیری کو فون کیا۔

''میں تمہارے گھر میں موجود ہوں۔ تم سے ملنا چاہتا ہوں۔''

فیری نے اُسے اندر آنے کو کہا۔ دونوں گن مین جیپ سے باہر نکل کر کھڑے ہو گئے تھے۔ بلال حمید نے ملک مصطفیٰ علی کو اندر چلنے کا اشارہ کیا۔ دونوں مین انٹرنس سے لاؤنج میں داخل ہو گئے۔ وسیع و عریض لاؤنج میں فیری سامنے صوفے پر براجمان تھی۔ آج بلال حمید نے فیری کو سلام نہیں کیا تھا۔

''آیئے سائیں! تشریف لایئے۔'' ملک مصطفیٰ علی کی ظاہری پوزیشن کا اندازہ کرتی ہوئی وہ خوش مزاجی سے گویا ہوئی۔ لیکن تیکھی نگاہوں سے بلال حمید کی جانب بھی اُس نے ضرور دیکھا تھا۔ وہ ملک مصطفیٰ علی کا بغور جائزہ لینے لگی۔ دو گھوڑے بوسکی کی قمیص پر گھیرے دار کلف شدہ شلوار، پیروں میں بہت قیمتی براؤن کھیڑی، سیدھے ہاتھ میں زمرد کی بڑی سی انگوٹھی، تراشیدہ مونچھیں چوڑی روشن پیشانی، ستواں ناک، ڈارک براؤنش شہد آگیں بڑی اور لامبی آنکھیں، طویل قد و قامت کسرتی سراپا۔ یہ تھے ملک مصطفیٰ علی۔

''بالو آج سلام نہیں کیا فیری ماں کو۔'' اس کے لہجے میں اب بھی تناؤ بھری تلخی تھی۔ وہ ملک مصطفیٰ علی کی بارعب پرسنالٹی سے دبک گئی تھی۔ ورنہ اس نے گندی گالیوں سے بلال حمید کی تواضع کرنی تھی۔

''میں جانتا ہوں اب میرا تمہارا کوئی ریلیشن نہیں ہے، اس لیے بالو کی بجائے مجھے بلال کہو۔'' وہ کٹھور پن سے بولا۔

''واہ بھئی واہ! تمہارے تو رنگ ڈھنگ ہی اور ہو گئے ہیں۔'' فیری پان چباتے ہوئے بولی۔

''جانتا ہوں۔'' بلال حمید کے لہجے میں اب بھی بے گانگی بھری ہوئی تھی۔

ملک مصطفیٰ علی خاموشی سے فیری کا جائزہ لے رہے تھے۔ میرون کلر کی سلمیٰ ستارہ سے بھری ہوئی ساڑی پہن رکھی تھی اُس نے۔ میک اپ کی موٹی تہہ میں چہرے کی جھریاں چھپانے کی کوشش کی گئی تھی، جوڑے میں تازہ موتیے کے گجرے ٹانک رکھے تھے۔ شیفون کی مہین ساڑی میں اُس کا جسم ننگا تھا۔ اس عمر میں بھی اُس کا بے حد اسمارٹ، کسا ہوا جسم چمک رہا تھا۔ ہیرے کے جھمکے اور ہار پہن رکھا تھا۔ انگلیاں ہیرے کی انگوٹھیوں سے بھری ہوئی تھیں۔ 'حرام کی کمائی سے خوب عیش کر رہی ہے۔' ملک مصطفیٰ علی نے سوچا۔

''جناب اپنا تعارف کرائیں گے۔'' اب وہ ملک مصطفیٰ علی کی جانب متوجہ تھی۔ وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں جانے انہیں کیا سمجھانا چاہ رہی تھی۔

''مجھے ملک مصطفیٰ علی کہتے ہیں۔ لال حویلی کا مالک۔''

''سائیں یہاں پر لال حویلیاں تو بہت سی ہیں۔''

''صحیح فرما رہی ہیں آپ۔ یہاں پر لال حویلیاں، لال کوٹھیاں بہت ہیں۔ شاہ جہاں فوڈ انڈسٹری کا نام تو ضرور سنا ہوگا۔ اور آپ مراد ولا میں کبھی تشریف نہیں لائیں۔'' ذومعنی گفتگو میں مصطفیٰ علی نے اُسے جھٹکا دیا۔

''ہاں یاد آ گیا، ڈیفنس میں باریک اینٹوں والی لال حویلی باہر سے ضرور دیکھی ہے۔''

''ہوں تو آپ کو یاد آ ہی گئی۔''

''بالو تم ہی انہیں لائے ہو گے؟'' وہ زبردستی ہنسی۔ وہ اُمِ فروا کے متعلق بلال حمید سے تنہائی میں بات کرنا چاہتی تھی۔

''ہاں انہیں بھی بہت اشتیاق تھا تم سے ملنے کا۔''

''آج تم کس لہجے میں بات کر رہے ہو؟''

''جس لہجے میں مجھے پہلے تم سے بات کرنی چاہیے تھی۔''

''میرا سامان کہاں ہے؟'' فیری رہ نہ سکی اور بلال حمید کا بدلا ہوا انداز نظر انداز کر کے بولی۔ اُسے اس وقت حیرت ہو رہی تھی۔ بلال حمید پر جس نے آنکھیں ماتھے پر سجالی تھیں۔

''کون سا سامان؟'' بلال کی آواز میں لاتعلقی بُکل مارے ہنس رہی تھی۔

''جو تمہارے پاس امانتاً رکھوایا تھا۔ اور تم وہ فلیٹ بھی چھوڑ گئے ہو مجھے بتائے بغیر۔''

''فیری وہ سامان اب تمہارے پاس نہیں آ سکتا۔''

''کیوں نہیں آ سکتا۔'' پہلو بدلتے ہوئے وہ اونچی آواز میں بولی۔

''تمہاری دکان اُس سامان کے شایانِ شان نہیں ہے۔''

''اوئے یہ تم آج بول کہاں سے رہے ہو۔''
''جہاں سے پہلے کبھی نہیں بولا۔'' اس دوران ملک مصطفیٰ علی ٹانگ پر ٹانگ رکھے بیٹھے خاموشی سے دونوں کی گفتگو سنتے رہے۔
''شاید تم بھول رہے ہو تم سے میرا معاہدہ ہو چکا ہے۔''
''جانتا ہوں۔'' آواز میں وہی بے ثباتی عود رہی تھی۔''اب میں وہ کانٹریکٹ واپس کرتا ہوں۔''
''واٹ!'' فیری بمشکل خود پر کنٹرول کیے بیٹھی تھی۔
''فیری تم نے دیکھی ہے ناں وہ لڑکی؟''
''ہاں۔''
''پھر تم خود ہی بتاؤ وہ کس طرح یہاں آ سکتی ہے۔ وہ تو اتنی پاک اور نیک ہے۔ اُس کا تو نام ہی وضو کر کے لینا چاہیے۔''
''بالو اتنی دیر بعد کیوں خیال آیا تمہیں؟''
''فیری پہلے اُسے دور سے دیکھا تھا۔ اب نزدیک سے دیکھا ہے۔'' ملک مصطفیٰ ابھی تک خاموش تھے۔
''بالو تم یہ کیوں نہیں کہتے کہ اُس کی خوبصورتی دیکھتے ہوئے تم بے ایمان ہو گئے ہو۔''
''بے ایمان!'' بلال حمید مضحکہ خیز انداز میں ہنسا۔''جب اُس لڑکی کو دیکھا تو اُس نے مجھے میرے رب سے ملا دیا۔ پہلے تم جیسوں کی صحبت میں تھا تو اپنے خدا کی اعلیٰ و برتر شانِ بے نیازی سے غافل تھا۔ اب اُس لڑکی کی وجہ سے آگہی کے روزن ایک ایک کر کے مجھ پر کھلتے جا رہے ہیں۔ اپنے کیے پر نادم ہوں کہ میں نے انتخاب کیا بھی تو ایک دین دار گھرانے کی پاک دامن لڑکی کا۔'' بلال حمید بنا رُکے بولتا چلا گیا۔ اس وقت فیری کو اپنی توہین محسوس ہو رہی تھی۔ فیری کو لگا جیسے بلال حمید اس کی قد آور شخصیت کی نفی کر رہا ہے۔ اس کا مذاق اڑا رہا ہے۔ وہ حیرت سے بلال حمید کو دیکھ رہی تھی۔
''بالو تم اتنے منہ پھٹ اور بہادر پہلے کبھی نہ تھے۔''
''یہ تمام ہمتیں اُس لڑکی کی وجہ سے مجھ میں آئی ہیں۔'' بلال حمید کو اس جگہ پر اُم فروا کا نام لینا گوارہ نہیں تھا۔ فیری بے یقینی سے اُسے گھور رہی تھی۔
''بہت خوب تو تم وہ لڑکی مجھے دینے کا ارادہ نہیں رکھتے؟''
''بھول جاؤ اُس لڑکی کو۔'' بلال کے لہجے میں پہاڑوں جیسی مصمم پختگی تھی۔ فیری بار بار ہونٹوں کو بھینچ بھینچ کر بلال حمید کو گھور رہی تھی۔ فیری نے ایک لمحے کے لیے سوچا۔ کیا بالو میری گرفت سے نکل چکا ہے۔
''بالو تم مجھ سے چار لاکھ ایڈوانس لے چکے ہو۔ تم اپنی بات سے پھر نہیں سکتے۔''
''یہ لو اپنے چار لاکھ۔'' بلال حمید نے ہاتھ میں پکڑا لفافہ اُس کی گود میں اچھال دیا۔''آئندہ کبھی بھول کر بھی اپنی ناپاک زبان سے اُس لڑکی کا نام مت لینا۔'' وہ طنزیہ ہنسی۔
''بالو میری پہنچ کہاں تک ہے اس کا تمہیں بخوبی اندازہ ہے۔'' فیری بہت اونچی آواز میں بولی تھی۔
''فیری بائی ذرا اپنے اُن دلاروں کا پتا تو بتاؤ۔'' ملک مصطفیٰ علی پہلی بار بولے۔ لفظ ''بائی'' پر انہوں نے خاصا زور دیا تھا۔ اُن کی گھمبیر تا، بااعتماد آواز سن کر فیری نے چونک کر ملک مصطفیٰ علی کی جانب دیکھا۔ ویسے ہی

وہ اُن کی شخصیت سے دبی جا رہی تھی۔

''میں فیری بائی نہیں، فیری ماں ہوں۔'' اُس کی آواز میں شدید احتجاج عود آیا تھا۔

''اس دھندے میں تم عرفِ عام میں طوائف کہلاتی ہو۔ تم ماں کہلائے جانے کی مستحق نہیں ہو۔ تم جیسی عورتیں تو پیدائشی طوائفیں ہوتی ہیں۔ سمجھیں تم!'' ملک مصطفیٰ علی نے لال ہوتی آنکھوں سے اُسے گھورا۔ وہ پریشان ہوگئی۔ اُسے کوئی جواب نہیں سوجھ رہا تھا۔ ایسی دبدبے والی پرسنالٹی دیکھ کر اس کے ماتھے پر پسینہ اُتر آیا تھا۔ فیری نے فوراً سے پہلے خود کو سنبھالا۔

''ملک صاحب تمیز سے بات کریں۔'' اُس کی کھوکھلی آواز خاصی تیز تھی۔

''میں نے تم سے اپنا تعارف نہیں کرایا۔ جب میرا مکمل تعارف حاصل کرلوگی تو جن بڑی شخصیات سے اپنے تعلق کا رعب جھاڑ رہی ہوناں۔ وہ دھری کی دھری رہ جائیں گی۔ وہ کھوکھلے گندی نالیوں کے کیڑے جو تمہارے تلوے چاٹتے ہیں۔ میں اُن کا بھی باپ ہوں۔ سنا تم نے۔'' ملک مصطفیٰ علی کی آواز میں غصہ تھا۔ فیری کے ہاتھ پاؤں پھول رہے تھے۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا جواب دے۔ ملک مصطفیٰ علی اُسے بولنے کا موقع ہی نہیں دے رہے تھے۔

''تم عرصہ دراز سے یہ کام کر رہی ہوناں۔ سیدھی سادی لڑکیوں کو اس کالے دھندے میں ڈالتی ہو۔ لوگوں کی مجبوریوں سے ناجائز فائدہ اٹھاتی ہو۔ میری ایک فون کال پر تمہاری یہ ساری ہرن چوکڑیاں نکل جائیں گی۔''

''آپ تمیز سے بات کریں۔ میرے گھر میں آ کر کوئی اس لہجے میں مجھ سے بات کرے، میں ہرگز اجازت نہیں دوں گی۔''

''کتنے لوگ تم سے تمیز سے بات کرتے ہیں؟ تم تو صرف پیسے کی ماں ہو؟''

''میرے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔'' فیری نے اپنی غیر ہوتی حالت پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''کتنے لمبے! ذرا مجھے بھی تو بتاؤ۔ ہمیں بھی تو پتا چلے تمہاری پہنچ کا۔'' ملک مصطفیٰ علی نے قہر آلود نگاہ فیری پر ڈالی۔

''بلال میرے ہاتھوں کی لمبائی جانتا ہے۔ میں نے اس کے ساتھی دو لڑکوں کو غداری کرنے پر مروایا ہے۔ اس کا بھی یہی حشر کروں گی۔''

''اگر میں یہاں بیٹھے بیٹھے ایک کال پر تمہارا انجام ابتر کرا دوں تو؟'' بلال گواہ ہے تم نے جو دو قتل کرائے ہیں ساری زندگی جیل کی سلاخوں کے پیچھے سڑتی رہوگی۔ بدبخت عورت، تمہاری ساری باتیں میں نے موبائل پر ریکارڈ کرلی ہیں۔ یہی ثبوت کافی ہوجائے گا۔ تم اپنی زبان سے دو قتل کرنے کا اقرار کرچکی ہو۔'' اسی وقت ایک لڑکا بیسمنٹ کی سیڑھیاں طے کر کے اوپر آیا۔ اُس کے پیچھے نیلی تھی۔ جو جلدی سے دوسرے دروازے میں غائب ہوگئی تاکہ اُسے کوئی دیکھ نہ سکے۔ بلال حمید اور ملک مصطفیٰ علی نے اُسے دیکھ لیا تھا۔ وہ لڑکا فیری کے قریب آیا اور ہزار کا نوٹ فیری کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ ملک مصطفیٰ علی پیسے پکڑاتے لڑکے اور فیری کی تصویر بنا چکے تھے۔

''تو دن دیہاڑے بھی تم یہی کام کرتی رہتی ہو۔'' ملک مصطفیٰ علی ایک دم اُٹھ کر کھڑے ہوگئے۔ ایک جھٹکے سے اُس مریل سے لڑکے کا کالر پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔

''کون ہو تم؟'' ملک مصطفیٰ علی کی آنکھوں میں خون اتر رہا تھا۔

''کک......وہ......'' اس ناگہانی افتاد کے لیے وہ لڑکا ہر گز تیار نہیں تھا۔ فیری کا رنگ بھی فق ہو گیا تھا۔
''سیدھی طرح بتا دو کون ہو تم؟'' ملک مصطفیٰ علی نے اُسے زور کا جھٹکا دیا۔ وہ اب بھی ڈرے سہمے لڑکے کو گھور رہے تھے۔
''میرا نام امجد ہے۔''
''امجد صاحب کیا کرتے ہیں آپ؟'' ملک مصطفیٰ علی کی قہر برساتی آنکھوں سے وہ نروس ہو چکا تھا۔
''میں......تو کچھ نہیں کرتا۔'' ملک مصطفیٰ علی نے ایک زوردار دھپ اُس کی پیٹھ پر رسید کی۔
''سیدھی طرح بتا دو کون ہو تم؟''
''بتایا تو ہے میں کہیں بھی ملازمت نہیں کرتا۔''
''بلال اس حرامی کو جیپ میں ڈال کر لال حویلی لے کر چلو۔ اس کے تو اچھے بھی بتائیں گے۔''
''وہ میں......جی پولیس میں انسپکٹر ہوں۔''
''بہت خوب انسپکٹر صاحب! ملک کے رکھوالوں کا یہ حال ہے تو باقی لوگ کس کھاتے میں گئے۔ اتنی خوبصورت لڑکی کے ساتھ دیر تک رہنے کے صرف ایک ہزار تم نے اس بڑی بائی کو پکڑا دیے ہیں۔'' ملک مصطفیٰ نے اُسے ایک زوردار گھونسا جڑ دیا۔
''ایسی ہی بڑی شخصیات تک تمہاری پہنچ ہے فیری بائی۔ اگر میں چاہوں تو ابھی تمہیں اور اس قوم کے محافظ کو تھانے میں بند کروا دوں۔'' ملک مصطفیٰ علی نے اُس لڑکے کو زور سے پیچھے دھکیل دیا۔
''کہاں تعینات ہو؟'' وہ گرج کر بولے۔ اونچے مضبوط سراپے کے مالک مصطفیٰ علی کے سامنے وہ چوہا بنا ہوا تھا۔
''گلبرگ تھانے میں۔''
''اسی لیے بھتے کے طور پر یہاں عیاشی کرتے ہو۔'' بات کرتے ہوئے ملک مصطفیٰ علی اُسے جھانپڑ رسید کرتے جا رہے تھے۔ فیری کے ہاتھوں کے طوطے اڑ رہے تھے۔
''سر معاف کر دیں، آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔'' وہ لڑکا انہیں پہچان گیا تھا تبھی وہ ڈر رہا تھا۔
''دفع ہو جاؤ یہاں سے۔'' وہ لڑکا سرپٹ بھاگتا باہر نکل گیا۔
''بڑی بی تم سے ابھی تک میں نے اپنا مکمل تعارف نہیں کرایا۔ میں ملک مصطفیٰ علی ہوں۔ لال حویلی مراد ولا کا چشم و چراغ اور معروف شاہ جہاں انڈسٹری کا مالک، جن کے ذاتی عقوبت خانوں کو تم جیسے لوگ ہی آباد کرتے ہیں۔ اب سمجھ آئی میں کون ہوں؟'' اس بار فیری کچھ نہ بولی۔ آج تک وہ کبھی کسی کے سامنے نہ دبکی تھی۔ اس کے تمام خوف اُسی رات ختم ہو گئے تھے جب آرنڈ ولیم اپنے باس سے اپنی بیوی کی عزت کا سودا محض ایک سائن کے عوض کر آیا تھا۔ اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد آج اس چھوٹی سی عمر کے اونچے قد کاٹھ کے خوبرو لڑکے کے سامنے اُس کی بولتی بند ہو چکی تھی۔ اس نے دل میں تہیہ کر رکھا تھا آدم کے تمام بیٹوں کو برباد کر کے چھوڑے گی۔
مصطفیٰ علی دوبارہ صوفے پر بیٹھ چکے تھے۔ بلال حمید بھی بیٹھ گیا۔
''بولو ابھی بھی چاہیے تمہیں وہ لڑکی؟''
''ملک صاحب میں آپ کے رعب میں نہیں آنے والی، ابھی تک آپ فیری کو نہیں جانتے۔ میرے ہاتھ

بہت لمبے ہیں۔''

''کہتی ہو تو ابھی گلبرگ تھانے میں فون کر کے تمہارے لمبے ہاتھوں کو اور لمبا کرائے دیتا ہوں۔ وہاں جو تمہارے چمچے بیٹھے ہیں ناں۔ وہی تمہیں گرفتار کر کے لے جائیں گے، تب اپنے لمبے ہاتھ دکھاتی رہنا، پھر دیکھنا کیسا پکا انتظام کرواتا ہوں تمہارا۔''

''بس آپ یہاں سے چلے جائیں۔ تھانے والے میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔''

''سنو یہ تمہاری بھول ہے۔'' وہ اپنی جگہ سے اُٹھ کر اس کے سامنے آ کر کھڑے ہو گئے۔ ملک مصطفیٰ علی کی آنکھیں فیری کے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں۔ وہ بہت اونچی آواز میں بول رہے تھے۔ فیری ان کی دبدبہ بھری آواز سے ڈر گئی تھی لیکن وہ ظاہر نہیں کر رہی تھی۔

''اگر آئندہ تم نے ایسی ویسی کوئی بھی حرکت کرنے کی کوشش کی تو پھر دیکھنا تمہارا حشر کیا ہوتا ہے۔ اگر تم نے بلال یا اُس لڑکی کے والدین کو کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش کی تو تمہیں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے پر مجبور کر دوں گا۔ اگر زندہ رہنا چاہتی ہو تو شرافت سے فحاشی کا یہ اڈہ بند کر دو۔ لیکن شرافت تو تمہیں چھو کر بھی نہیں گزری۔ ایک مہینے کی تمہیں مہلت دیتا ہوں۔ مہینے کے اندر اندر یہ تمام سلسلے بند کرو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو تمہیں اس کوٹھی سے بے دخل کر دیا جائے گا۔ پھر مدد کے لیے بلا لینا اپنے کسی چاہنے والے کو۔'' ملک مصطفیٰ علی نے بلال کو چلنے کا اشارہ کیا۔

''اِسے صرف دھمکی نہ سمجھنا۔ اگر تم نے کوئی چالاکی کرنے کی کوشش کی تو رنگے ہاتھوں چھاپا ڈلوا کر تم سب کو پکڑواؤں گا۔ اچھی طرح میری باتیں تمہیں ذہن نشین ہو گئی ہوں گی۔'' ملک مصطفیٰ علی بلال حمید کے ساتھ تیزی سے باہر نکل گئے۔

''بلال اب تم بے فکر ہو جاؤ۔ یہ عورت تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گی۔'' راستے بھر دونوں خاموش رہے کیونکہ پیچھے بیٹھے گن مینوں کے سامنے وہ اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتے تھے۔

ملک مصطفیٰ علی تمام راستے اُم فروا کے متعلق ہی سوچتے رہے۔ شیفون کے گلابی دوپٹے کے ہالے میں اُس کا ماہتاب چہرہ جس پر بڑی بڑی سیاہ آنکھیں تھیں۔ وہ حسنِ بے کل بار بار اُن کی آنکھوں کے سامنے جھلملا رہا تھا۔ اک بے نام میٹھی میٹھی کسک اُن کے اندر بڑھتی جا رہی تھی۔

'کہیں بلال اُم فروا پر اپنا حق نہ جتانا شروع کر دے۔' اچانک ملک مصطفیٰ علی کے چٹانوں جیسے مضبوط بدن میں بجلی کے کوندے جیسی سنسناہٹ برپا ہو گئی۔ 'اُم فروا کی مرضی کے خلاف اسے شوہر ہونے کا حق ہرگز نہیں وصولنا چاہیے لیکن اُم فروا بلال کے نکاح میں ہے۔ یہ آسانی سے اُس سے دستبردار نہیں ہو گا۔'

'ملک مصطفیٰ علی تم کیوں یہ سب سوچ رہے ہو۔ تمہارا اُم فروا سے کیا واسطہ ہے۔ تم تو صرف بلال کی مدد کر رہے ہو۔ سو وہ تم نے کر دی۔' اس وقت بلال حمید کے چہرے پر بھی مردنی چھائی ہوئی تھی۔ اُسے تو اب خوش ہونا چاہیے تھا۔ اب اُمِ فروا کو فیری سے کسی قسم کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ ان دونوں کے اندر سوچیں جالے بُن رہی تھیں۔

☆......☆......☆

بلال حمید جس وقت گھر پہنچا تو اسی وقت اُمِ فروا نہا کر واش روم سے نکلی تھی۔ اس وقت فیروزی اور سیاہ

پھولوں والے ڈریس میں ملبوس وہ بہت اچھی لگ رہی تھی۔ سپید نہایت خوبصورت انگلیوں والے، نفیس گلابی ایڑیوں والے پاؤں میں سیاہ چمڑے کی نازک سی چپل بہت بھلی معلوم ہورہی تھی۔ پانی کے ننھے ننھے قطرے اس کے طویل بالوں کا سفر طے کرتے نیچے گررہے تھے۔ جوں ہی اُم فروا نے دروازہ کھولا سامنے بلال حمید اور ملک مصطفیٰ علی کھڑے تھے نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے سلام کردیا۔ کچھ بھی ہو یہ دونوں اس کے محسن تھے۔

ملک مصطفیٰ علی اُسے دیکھ کر سانس لینا بھول چکے تھے۔ بلال حمید نے سر جھکایا ہوا تھا۔ وہ پیچھے ہٹ گئی اور انہیں اندر آنے کا راستہ دیا۔ وہ دونوں اندر آگئے۔ ملک مصطفیٰ علی یہ کہہ کر بلال حمید کے ساتھ آئے تھے کہ صورتِ حال اُم فروا کو بتا کر اُسے مطمئن کیا جائے ورنہ یہاں آنے کی بات تو کچھ اور تھی اور یہ بھید وہ خود ہی جانتے تھے۔ اُم فروا کی آنکھیں آج بھی متورم تھیں۔ صوفے سے کمر ٹیکتے ہوئے ٹانگ پر ٹانگ رکھے۔ انہوں نے آنکھیں بند کرلیں۔ ایک معطر خوشبو کا جھونکا دبیز ی لیے اُن کے آس پاس منڈلانے لگا۔

ملک مصطفیٰ علی نے آہستگی سے آنکھیں وا کیں تو وہ اُن کے پاس سے گزر کر اپنے بیڈروم کی جانب بڑھ رہی تھی۔

''بلال بھوک محسوس ہورہی ہے۔ دل چاہ رہا ہے آج کھانا یہیں کھایا جائے۔''

''میں پتا کرتا ہوں اُم فروا سے اُس سے کیا پکایا ہے۔''

''ارے بلال اُسے تکلیف نہ دو۔ حویلی میں فون کردیتا ہوں شاہ نواز کو، وہ کھانا اِدھر ہی لے آتا ہے۔''

''ملک صاحب آپ رہنے دیں، اُمِ فروا بنالیتی ہے۔''

''وہ اب کہاں تکلیف کرے گی، شاہو لے آتا ہے۔'' ملک مصطفیٰ علی نے حویلی میں فون کردیا تھا۔

''میں بلال کی انیکسی میں بیٹھا ہوا ہوں تم کھانا اِدھر ہی لیتے آؤ۔''

''جی بہتر۔'' ملک مصطفیٰ علی کے حواس پر بے کلی سی تھکن سوار تھی۔ بلال اب اُم فروا پر اپنا حق نہ جتائے اور وہ لڑکی حکمِ مجازی خدا کے اس طوفان میں یہ سمجھ کر بہہ جائے کہ بلال اس کا شوہر ہے اور اُسے اس پر پورا حق ہے جو خدا کی طرف سے اُسے ملا ہے، انہوں نے بالوں میں مضبوط انگلیوں کی پوریں پھنسائیں۔ انہوں نے اپنا ذہن جھٹکا۔ میں طریقے سے بلال کو سمجھا دوں گا۔ اُس کے اندر ایک اچھا انسان بھی تو ہے۔ جو ابھی تک اُس نے اُمِ فروا کو چھوا نہیں شاید وہ خود کو اس نیک لڑکی کا اہل نہیں سمجھتا۔

''ملک صاحب! کیا سوچ رہے ہیں؟''

''کچھ نہیں بلال۔'' انہوں نے مسکرا کر بلال کی جانب دیکھا۔

''میں اُمِ فروا سے پوچھتا ہوں اُس نے کیا بنایا ہے۔'' وہ بیڈروم میں آ گیا اُمِ فروا سورۃ یسین پڑھ کر اُسے ریک میں رکھ رہی تھی۔

''اُم فروا کیا بنایا ہے۔ ملک صاحب کھانا اِدھر ہی کھائیں گے۔''

''آلو قیمہ۔''

''گرم کرکے برتن ٹرالی میں لگادو۔ میں تمہاری ہیلپ کردیتا ہوں۔''

''آپ رہنے دیں میں لگا دیتی ہوں۔'' وہی گہری سنجیدگی تھی اُس کے چہرے پر۔ ''پھلکے بنانے میں تھوڑی دیر لگے گی۔''

''ملک صاحب نے گھر سے کھانا منگوایا ہے تم صرف سالن گرم کر دو۔'' اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔
جب سے اُمِ فروا کو بلال حمید کے اس مکروہ پلان کا علم ہوا تھا وہ بلا وجہ اُس کے سامنے نہیں آنا چاہتی تھی۔ وہ خود کو مجبور تصور کرتی تھی ورنہ ایک لمحہ بھی یہاں پر نہ رُکتی اور فوری طور پر اپنے پیاروں کے پاس چلی جاتی۔ بلال حمید انٹرنس کے ساتھ والے کمرے میں سوتا تھا اور اُمِ فروا ہال کے سامنے والے بیڈ روم میں۔ اس وقت وہ ملک مصطفیٰ علی کے قریب سے گزر کر کچن کی جانب بڑھی تو اُس کے پیچھے جاتے بڑے سے آنچل سے خوشبو آزاد ہو کر ملک مصطفیٰ علی کی روح و سانسوں کو سرشار کر گئی۔ خوشبو کا وہ لمس اب انہیں بے قراری سونپ رہا تھا۔ اُن کے اندر کسی نے زور سے واویلا مچایا۔ ''مصطفیٰ علی یہ لڑکی تمہارے لیے بہت ضروری بن چکی ہے۔ ورنہ تم......؟ تم نہیں رہو گے۔ تم فنا ہو جاؤ گے۔'' کوئی اندر سے مسلسل دہائیاں دے رہا تھا۔ انہوں نے گردن موڑ کر اوپن کچن کی طرف دیکھا۔ دوپٹے کا ہالہ اُس کے چاند سے چہرے کو اپنی پناہوں میں لیے ہوئے تھا۔ اُمِ فروا کا چہرہ زود رنجی میں مبتلا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ سانسوں کی تیزی کو اعتدال پر لاتے ہوئے اُسے دیکھتے رہے۔ وہ چولہا جلا کر سالن گرم کر رہی تھی۔ بلال حمید اُن کے سامنے آ کر بیٹھ چکا تھا۔ دروازے پر بیل ہوئی۔ بلال حمید اُس طرف بڑھا۔ شاہ نواز کھانا لے کر آیا تھا۔ اُس کے ساتھ ایک اور لڑکا تھا۔ اُس نے بھی ٹرے اٹھائی ہوئی تھی۔ بلال حمید نے شاہ نواز سے ٹرے لے کر دروازہ باہر کی جانب دھکیل دیا اور ٹرے سینٹر ٹیبل پر لا کر رکھ دی، جو ٹرے پوش سے ڈھکی ہوئی تھی۔ وہ دوبارہ دروازے کی طرف بڑھا اور دوسری ٹرے بھی لے آیا۔ وہ جب سے یہاں آیا تھا اس نے بھی کسی کو بھی اندر نہیں آنے دیا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کوئی اُمِ فروا کو دیکھے۔ اُمِ فروا نے سالن گرم کر کے ڈش آؤٹ کر دیا تھا۔ پلیٹس بھی ٹرالی میں لگا دی تھیں۔ گلاس چمچ سب کچھ ٹرالی میں موجود تھا۔ بلال حمید ٹرالی لیے ہال میں آ گیا۔ ٹیبل ملک مصطفیٰ علی کے قریب کھسکا دیا۔ ٹرے پوش اوپر سے اٹھائے۔ پالک گوشت، مرغ پلاؤ اور لال لوبیا بنا ہوا تھا، ساتھ اصلی گھی کے نان تھے۔ لیکن وہ شوق سے آلو قیمہ کھا رہے تھے۔
عشق کی رمزیں عاشق ہی جان سکتا ہے۔ غیر ارادی میں وہ یہ سب کر رہے تھے۔ کھانے کے بعد انہوں نے فرمائش کر کے سبز قہوہ بنوایا تھا۔ پہلے بھی ایک مرتبہ وہ اُمِ فروا کے ہاتھ کا قہوہ پی چکے تھے۔
اُمِ فروا نے کچن میں بیٹھ کر کھانا کھا لیا تھا۔ بلال حمید اُسے وہیں پلیٹ بنا کر دے گیا تھا۔ وہ جانتا تھا اُمِ فروا اُن کے ساتھ بیٹھ کر کبھی کھانا نہیں کھائے گی۔
اُمِ فروا جانتی تھی وہ آج فیری کی طرف گئے ہوئے تھے۔ وہ کچن سے نکل کر اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔ اب اُسے جلد یہاں سے جانا تھا اپنے والدین کے پاس۔
''پلیز میری بات سنیں!'' اپنے قریب سے گزرتی اُمِ فروا کو انہوں نے پکارا تھا۔ وہ رُک گئی۔
''آپ یہاں بیٹھ کر میری بات سنیں۔'' ابھی تک اُس کی ملک مصطفیٰ علی کی جانب پیٹھ تھی۔
''بولیں!''
''آپ یہاں آ کر بیٹھیں۔'' وہ سائیڈ پر رکھی کرسی پر ٹک گئی۔ ''آج میں اور بلال اُس عورت کی طرف گئے تھے۔ جس سے بلال نے چار لاکھ لیے تھے۔'' تب بے دم ہوتی کیفیت پر قابو پاتے ہوئے اس نے نچلے ہونٹ پر سختی سے دانت گاڑھ دیے۔
''وہ چار لاکھ اُسے واپس کر دیے ہیں اور اُسے اچھی طرح سمجھا دیا ہے کہ اب وہ یا اُس کی سات نسلیں بھی بھول کر

بھی آپ کو نقصان نہیں پہنچا سکتیں۔ اُسے اچھی طرح ذہن نشین کرا دیا ہے۔ آپ بالکل بے فکر ہو جائیں۔''

اِس وقت اُم فروا کی سیاہ آنکھوں میں سفید دھند چھا رہی تھی۔ اُس کی زبان اکڑ کر تالو سے جا لگی تھی۔ بلال حمید نے اُم فروا کو اعتماد میں لے کر بے اعتباریاں بخش دی تھیں۔ اس وقت اُم فروا کا دل اضطراب بھرے تاسف میں جکڑا ہوا تھا۔ اُم فروا کی غیر شعوری طور پر نگاہ ملک مصطفیٰ علی کی جانب اُٹھی تھی۔ وہ بھی اسی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ یک بارگی ایک کوندا لپکا تھا اُن کی آنکھوں میں۔ تب اُس کی وہ ایک نگاہ اُس کی نہ رہی ملک مصطفیٰ علی کی آنکھوں میں امر ہو کر محفوظ ہوگئی۔ دوسرے لمحے اُم فروا کی پلکیں گہرے بوجھ سے خود بخود جھک گئی تھیں۔

''ملک صاحب میں آپ کی ممنون ہوں۔ جب میں سوچتی ہوں میرے ساتھ کیا ہونے جا رہا تھا تو میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔'' بحرِ بیکراں جیسی اضطرابی کیفیت کو اپنے اندر سموئے وہ نڈھال ہوئی جا رہی تھی۔ ''آپ نے میری بہت مدد کی۔ میں جس قدر بھی آپ کا شکریہ ادا کروں کم ہے۔'' اس دوران بلال حمید شرمندگی سے نظریں جھکائے خاموش تھا۔

''اس میں شکریہ کی بات نہیں ہے۔ میں اور بلال بھی اس بات سے مطمئن ہیں کہ خدا نے آپ کو بہت بڑی پریشانی سے بچا لیا۔ آپ ایک مذہبی گھرانے کی مذہبی لڑکی ہیں۔ قرآن پاک کی حافظہ ہیں۔ آپ کے اندر قرآن پاک محفوظ ہے پھر آپ کو کیونکر کوئی مشکل پیش آتی۔'' لیکن وہ ابھی تک اندر سے خوف زدہ تھی۔ بے اعتباری آڑے آ رہی تھی۔ بلال حمید اب کوئی اور چال نہ چل دے۔ وہ جو چال چلنے والا تھا اس سے بڑی اور کیا چال ہوگی۔ مجھے شک نہیں کرنا چاہیے اور فوراً سے پہلے یہاں سے چلے جانا چاہیے۔ بلال نے اُم فروا کی طرف دیکھا۔ وہ کسی گہری سوچ میں تھی۔ اب بھی اُم فروا کو اپنے چہرے پر دو سلگتی آنکھیں محسوس ہو رہی تھیں۔ لیکن ملک مصطفیٰ علی تو اب کی بار اُس کی طرف دیکھ ہی نہیں رہے تھے۔ اُن کی نگاہیں تو فرنٹ کی بہت کھلی دیوار پر لگی عالی شان پینٹنگ پر مرکوز تھیں۔ جس میں گھنے درختوں کے جھنڈ میں دو ہرن بھاگ رہے تھے۔

''بلال کو خدا نے سیدھی راہ دکھائی ہے، مالک جیسے چاہتا ہے اُسے ہدایت دیتا ہے۔ بلال کو خدا نے آپ کے ذریعے ہدایت سے نوازا ہے۔ اس کا یوں سچائی سے مذہبی ہونا ہی شاید اس کی نجات کا وسیلہ بنا ہوگا۔''

''آپ نے جہاں اتنا احسان کیا ہے ایک اور کر دیں۔ مجھے میرے والدین کے پاس پہنچا دیں۔''

''کیا کہیں گی آپ اپنے والدین کو جا کر۔ وہ پریشان ہو جائیں گے۔ اُن کے بھی عزیز واقارب ہیں۔ آس پڑوس ہے، میں نہیں چاہتا کہ یہ بات پھیلے۔ کسی کو بھی پتا نہیں چلنا چاہیے۔''

''کسی کو پتا نہیں چلے گا۔'' اُم فروا نے کہا۔

''کب تک پتا نہیں چلے گا۔''

''آپ درست فرما رہے ہیں۔ میرے والدین کو تو پتا چل ہی جائے گا۔'' اس دوران بلال حمید خاموش تھا۔ اصل میں ملک مصطفیٰ علی بھی یہی چاہ رہے تھے کہ اُم فروا یہاں سے چلی جائے تا کہ بلال اس کے زوجیت ہونے پر اپنا حق نہ جتائے۔ وہ بلال حمید سے خوف زدہ تھے۔

''بلال انہیں اپنے میکے گئے کافی عرصہ ہو چکا ہے۔ ایک ہفتہ کے لیے انہیں مولوی صاحب کے ہاں چھوڑ دو۔ چند دن وہاں رہ لیں گی تو اُن کی بھی طبیعت بہتر ہو جائے گی۔ لیکن آپ کو مجھ سے ایک وعدہ کرنا پڑے گا۔ آپ وہاں جا کر ایسی کوئی بات نہیں کریں گی جس سے انہیں شک کا شائبہ بھی ہو۔ بعد میں، میں خود بلال کے

ساتھ جا کر تمام صورتِ حال سے انہیں آگاہ کروں گا، طریقے کے ساتھ تاکہ اچانک انہیں شاک نہ پہنچے۔''

''ٹھیک ہے میں انہیں کچھ محسوس نہیں ہونے دوں گی۔'' اُم فروا کے دل کا بوجھ قدرے کم ہوگیا تھا۔

''لیکن ایک ہفتہ بعد آپ کو ہر صورت یہاں واپس آنا ہوگا۔'' کچھ دیر تک وہ خاموش رہی پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔

''بلال تم آج ہی انہیں ایک ہفتے کے لیے چھوڑ آؤ اور اُن سے کہہ دینا فیکٹری کے ضروری کام سے شہر سے باہر جا رہا ہوں۔ اس لیے یہ چند دن یہاں رہیں گی۔ انہیں چھوڑ کر آج ہی آجانا۔ صبح میرے ساتھ فیکٹری چلنا ہوگا تمہیں۔ میری گاڑی پر چلے جانا تاکہ واپس جلدی آسکو۔'' اصل میں وہ نہیں چاہ رہے تھے کہ اُم فروا اُس کے ساتھ بائیک پر جائے۔

''تو پھر میں چلتا ہوں۔'' اٹھتے ہوئے ملک مصطفیٰ علی نے ایک نگاہ اُم فروا پر ڈالی اور دروازے کی جانب بڑھ گئے، بلال حمید بھی اُن کے پیچھے بڑھا۔

''ملک صاحب آپ میرے لیے جو کر رہے ہیں اس کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔''

''بلال رہنے دو ان تکلفات کو۔ تمہاری وجہ سے میرے حصے میں بھی کوئی نیک کام آگیا تو اچھی بات ہے ناں۔'' انہوں نے مسکرا کر کہا اور باہر نکل گئے۔

''اُم فروا تم تیار رہنا ایک گھنٹے تک تمہیں ملک صاحب کی گاڑی میں چھوڑ آؤں گا۔'' اُس نے سر ہلا دیا اور الماری سے اپنے کپڑے نکالنے لگی۔ وہ اندر سے ڈری ہوئی تھی۔ بلال حمید سے دور رہنا چاہتی تھی کہ جانے کس وقت وہ اس پر اپنے شوہر ہونے کا حق جتا دے اور وہ ایسا ہرگز نہیں چاہتی تھی۔ اس کے دل میں اب اُس کے لیے محبت نہیں رہی تھی۔ ابھی تو اسے کئی مراحل سے گزرنا تھا۔ بلال حمید نے اُم فروا کے ساتھ جو کچھ کیا تھا وہ معافی کے لائق نہیں تھا۔ وہ اُس کی احسان مند بھی تھی۔ ان ہی سوچوں نے اس کے اندر بے چینی بھر دی تھی۔

'اگر میں اس کے قریب نہ جانا چاہوں تو کیا میں گناہ گار ہو جاؤں گی اللہ کی نگاہ میں۔' اچانک بے بے جی کی آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی۔

''پتر عشقِ خدا کے بعد عشقِ مجازی معتبر ہوتا ہے جو عورت اپنے برے ترین شوہر کے ساتھ بھی حسنِ سلوک روا رکھتی ہے۔ وہ جنتی ہوتی ہے۔ خدائے مجازی کی ہر جائز بات ماننا عورت کا اولین فرض ہوتا ہے۔ اور تم بھی اپنے فرض سے کبھی غفلت نہ برتنا۔''

میرے مالک تُو دلوں کے بھید خوب جانتا ہے۔ میں نہیں جانتی میرے ساتھ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ میرے دل میں بلال حمید کے لیے پہلے جیسی تڑپ کسک نہیں رہی۔ اُس نے میری روح کو ایسے الم سے دوچار کیا ہے۔ انہیں دیکھتی ہوں تو اپنی ہی ذات میں اپنا مدفن ہوتا کھلی آنکھوں سے دیکھتی ہوں۔ مولوی ابراہیم کی بیٹی کے لیے اس نے ایسا سوچا جس نے آج تک خود کو سینت سینت کر رکھا۔ میری حفاظت کی۔ مجھے ایسے سنبھالا جیسے ایک ماں اپنے نومولود بچے کو زمانے کے گرم سرد تھپیڑوں سے بچا کر رکھتی ہے۔ میں بلال حمید کی ممنون ہوں اس نے مجھے اُس عورت سے بچا لیا لیکن بچانے سے پہلے ڈبونے کا بھی تو بھرپور ارادہ کیا تھا۔ میرے خدا مجھے معاف فرما دے۔ وہ میرا مجازی خدا ہے، پر اس دل کا کیا کروں۔ یہ بھی تو تُو نے بنایا ہے، اِس میں جو بال آچکا ہے اب وہ نہیں جاسکتا۔ میرے مالک تُو رحمٰن ہے، رحیم ہے بس تُو درگزر فرما دے۔ مجھ سے کبھی کوئی ایسا عمل نہ ہو جو تیری نگاہ میں معیوب ہو۔ میں تیری رحمتوں کی طلب گار ہوں۔'' عصر کی نماز کی ادائیگی کے بعد وہ دیر تک دعا مانگتی رہی

تھی۔ بلال حمید بھی عصر کی نماز پڑھ کر مسجد سے آ چکا تھا۔

''اُم فروا تیار ہو چکی تھی۔ خوبصورت ڈریس کے ساتھ لائٹ میک اپ بھی آج اس نے کیا تھا۔ گولڈ کے ٹاپس، لاکٹ اور چوڑیاں بھی پہنیں تا کہ بے بے جی اور اُم زارا یہ نہ سوچیں ابھی شادی کو دو مہینے بھی نہیں ہوئے اور اتنی سادگی سے میکے آئی ہے۔ بلال حمید نے دل میں اسے توصیفی نگاہوں سے سراہا۔ وہ عبایا پہن چکی تھی۔ چھوٹا سا بیگ اُس نے ہاتھ میں پکڑ لیا تھا۔

''چلیں۔'' بلال نے پوچھا۔ اُس نے پھر آنکھوں کو موہوم سی جنبش دی۔ دروازہ بند کرتے دونوں باہر آ گئے، سامنے ہی ڈرائیور اُن کا منتظر تھا۔

دونوں خاموشی سے پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اُم فروا کی آنکھوں میں سوچوں کے سراب تھے، اُدھر بلال حمید گم صم سا تھا۔ کبھی بلال حمید کی محبت کی چاندنی الوہی احساس میں اُم فروا کی روح کے تہہ خانوں کی پرتوں میں ہلچل مچاتی تھی اور اب کی بار وہی چاندنی سراپا سوال بنی ہوئی تھی۔ وہ دل کے بے انت بحر میں ٹھاٹھیں مارتی سرکشی پر اُتر آنے والی لہروں کو نہیں سنبھال پا رہی تھی۔ اس کا دل سفید پھوڑوں کی مانند رِس رہا تھا۔ وہ مجروح کیفیات سے دوچار تھی۔ اسے نہیں معلوم تھا حالات اُسے کس سنگین دھارے پر لے جائیں گے۔ اس کے ابا جی اور بے بے جی کو جب حقیقت کا علم ہوگا تو اُن کے دل پر کیا گزرے گی۔ کوئی دلکش رنگ اب اُس کی آنکھوں تک آ ہی نہیں سکتا تھا۔ اُدھر بلال حمید سوچ رہا تھا۔ مجھے اُم فروا سے کوئی اچھی اُمید رکھنی ہی نہیں چاہیے۔ جو میں نے اس کے ساتھ کیا وہ قطعی معافی کے قابل نہیں ہے۔ اس کی جگہ اگر کوئی اور لڑکی ہوتی تو شاید وہ کچھ سہار بھی لیتی۔ لیکن یہ باعصمت لڑکی جس کی پاکی کی قسم آنکھیں بند کر کے کھائی جا سکتی ہے۔ یہ تو اس اعزاز کی مستحق ہے کہ اس کا نام بھی وضو کر کے لیا جائے اور میں اسے کس دلدل میں غرق کرنے جا رہا تھا۔ جب میں نے پہلی مرتبہ اس کا پورا چہرہ دیکھا تھا، سبزی کا تھیلا اس کے کندنی ہاتھوں میں پکڑاتے ہوئے۔ اس کی جھلک دیکھتے ہی میرے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا تھا یہ لڑکی مجھے بہت سارا مال دے سکتی ہے اور فیری کو بھی یہ مالا مال کر سکتی ہے۔ تب یہ خیال مجھے کیوں نہیں آیا تھا۔ اس ملکوتی سراپے والی شریف لڑکی کو میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنی زوجیت میں لے لوں اور فیری کو پتا ہی نہ چلنے دوں۔ پر میں نے صرف یہ سوچا اس کے بدلے مجھے کتنے لاکھ ملیں گے؟ یہ تک بھول گیا تھا کہ یہ ایک دین دار گھرانے کی بیٹی ہے۔ میں تو یہ سوچے بیٹھا تھا، نکاح کے دوسرے روز ہی اسے طلاق دے کر فیری کے حوالے کروں گا اور اُس سے بھاری رقم وصول کر لوں گا اور اپنی یہ فرضی داڑھی صاف کروا لوں گا۔ یہ ٹخنوں سے اوپر شلوار، سر پر ٹوپی یہ سب کچھ اتار پھینکوں گا۔ اس لڑکی کا گھونگھٹ اٹھاتے ہی میرے تمام منصوبے اپنی موت آپ مر گئے۔ میری آنکھوں میں اس کے چہرے کی شرم و حیا ہتھوڑوں کی طرح برس رہی تھی میں اپنے ہاتھوں سے کھودی قبر میں خود ہی جا سویا تھا۔ ان ہی سوچوں میں سفر گزرنے کا پتا ہی نہ چلا۔

☆......☆......☆

اُم فروا نے آنے سے پہلے فون کر دیا تھا۔

بے بے جی اور اُم زارا اس کی منتظر تھیں۔ راستے میں بلال حمید نے فروٹ اور کیک لے لیا تھا۔ وہ بے بے جی کو دیکھتے ہی اُن سے لپٹ گئی۔ اس کا دل اندر سے رو رہا تھا۔ لیکن آنکھوں سے اسے ایک آنسو بھی نہیں بہانا تھا۔ اس کا وجود اَن دیکھے آنسوؤں سے جل تھل تھا، پر اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹیں سجی تھیں۔ اپنے پیاروں کے

لیے خود پر ضبط کرتے ہوئے وہ کس عذاب سے گزر رہی تھی۔ دل ہی دل میں اپنے خدا سے ہمت کی بھیک مانگ رہی تھی، جس میں اس کے گھر والوں کے لیے طمانیت تھی۔

''بلال بیٹا کیسے ہوتم۔'' بے بے جی بلال حمید کے کندھے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولیں۔

''بہت اچھا ہوں بے بے جی! آپ کیسی ہیں۔ دیکھا آپ کی بیٹی کو لے آیا ناں۔''

''بہت اچھا کیا تم نے۔''

''بہنا تم نے تو ہمارے ہاں نہ آنے کی قسم کھا رکھی ہے۔'' بلال حمید اب اُمِ زارا سے مخاطب تھا۔

''میرا تو آنے کو بہت دل چاہتا تھا پر ابا جی اور بے بے جی اکیلے تھے۔''

''مولوی صاحب کہاں ہیں؟''

''مغرب کی نماز پڑھ کر آنے ہی والے ہیں۔'' بے بے جی نے بتایا۔

''اسماعیل دکھائی نہیں دے رہا؟''

''اسے شہر سے کچھ کتابیں لینی تھیں وہ لینے گیا ہے۔''

''بلال بھائی آپ بیٹھیں ناں۔''

''میں مسجد جا رہا ہوں۔ مغرب کی نماز کا ٹائم ہی نہ نکل جائے، وہیں مولوی صاحب سے بھی مل لوں گا۔ تم مزے دار سی چائے بناؤ میں آتا ہوں۔'' اس دوران اُمِ فروا عبایا اُتارے جاء نماز پر کھڑی مغرب کی نماز پڑھ رہی تھی۔ مغرب کی نماز کا ٹائم بہت کم ہوتا ہے۔ راستے بھر اُمِ فروا یہی سوچتی آئی تھی کہیں نماز قضا نہ ہو جائے۔ نماز سے فارغ ہو کر وہ ابا جی اور بے بے جی کے کمرے میں آ گئی تھی۔ اُسے یہاں آ کر گہرا سکون ملا تھا۔ اس کے دکھتے دل کو قرار آ گیا تھا۔ جانے وہ کتنی دلگیر مسافتیں طے کر کے یہاں تک پہنچی تھی۔

''باجی آپ تو بہت پیاری ہو گئی ہیں۔'' اُمِ زارا نے شرارت بھری آنکھوں سے اُس کی طرف دیکھا۔ ''یہ سب تو بلال بھائی کی محبتوں کا کمال ہے۔''

''ہٹ بے شرم۔'' اُمِ فروا نے شرمانے کی ایکٹنگ کی۔ بے بے جی کے آنے پر دونوں خاموش ہو گئیں۔

''اور سنا پتر! تو خوش تو ہے ناں۔'' بے بے جی نے پہلا سوال یہی کیا۔ دنیا کی ہر ماں جب اپنی بیٹی سے ملتی ہے تو وہ پہلا سوال یہی کرتی ہے۔ اچانک اُمِ فروا کے دل میں اک تباہ کن اتھل پتھل مچی۔

''بہت خوش ہوں بے بے جی! آپ کو مجھے دیکھ کر اندازہ نہیں ہو رہا۔'' اس کے زخمی دل پر کسی نے مٹھی بھر نمک چھڑک دیا تھا۔ اس کے کٹاؤ دار ہونٹوں پر بھرپور مسکان رقصاں تھی۔ بے بے جی بغور اس کی آنکھوں میں جھانک رہی تھیں۔ آخر ماں تھیں، اُن کے دل پر اک بوجھ آن پڑا تھا۔

''بے بے جی میں بہت خوش ہوں۔ وہ میرا بہت خیال رکھتے ہیں۔ کسی چیز کی کمی نہیں ہونے دیتے مجھے۔ سیر کرانے لے جاتے ہیں۔ شاپنگ بھی کراتے ہیں۔'' وہ مسکرا رہی تھی لیکن اندر سے عذاب لمحوں کے بچھو اُسے ڈس رہے تھے۔ اُسے ہر صورت اپنے ان پیاروں کی خاطر چہرے پر ہنسی کی جل ترنگ سجانی تھی۔ اندر نوحہ کرتی، دہائیاں دیتی ٹیسوں کو اس نے روکنا تھا۔ اُمِ زارا پُر تکلف سی چائے تیار کر چکی تھی۔ تھوڑی دیر بعد مولوی ابراہیم اور بلال حمید باتیں کرتے اندر داخل ہوئے۔

''میرا بچہ آیا ہے۔'' مولوی ابراہیم کی آنکھوں کی قندیلیں روشن ہو گئی تھیں۔ وہ کتنی دیر تک اس کے سر کو اپنے

کندھے سے لگائے رہے۔ اُمِ فروا بڑے سے دوپٹے کی بکل مارے اُن کے سامنے تھی۔ باپ کے پُرنور چہرے سے اُس کی نگاہیں نہیں ہٹ رہی تھیں۔ کیا اس پُرتقدس باپ کی پگڑی میں مٹی میں رولنے چلی تھی۔ اس سے تو اچھا تھا میں پیدا ہی نہ ہوئی ہوتی۔ پیشانی پر تفکرات کی لکیریں نمایاں ہونے سے پہلے اُس نے کمالِ ضبط سے اُن کو چھپا لیا تھا۔ اسماعیل بھی آ گیا تھا۔ چائے کے دوران باتیں ہوتی رہیں۔

''بے بے جی آپ کی بیٹی ایک ہفتہ آپ کے پاس رہے گی۔ میں نے فیکٹری کے کام کے سلسلے میں شہر سے باہر جانا ہے۔ اُمِ فروا نے کہا میں اتنے دن یہاں رہ لیتی ہوں۔''

''پُتر یہ تم نے اچھا کیا۔ ہم اس کے لیے بہت اُداس تھے۔''

''اب میں چلوں گا۔''

''بلال بھائی کھانا کھا کر جائیں۔''

''بہنا اتنا کچھ تم نے کھلا دیا ہے۔ اب تو کھانے کی گنجائش نہیں۔ فیکٹری کا ڈرائیور بھی ساتھ ہے ناں۔ وہ انتظار کر رہا ہوگا۔ تمہارا کھانا اُدھار رہا۔ جب اُمِ فروا کو لینے آؤں گا تب کھالوں گا۔''

''چلیں پھر آپ کو اس وعدے پر چھوڑ دیتی ہوں۔'' بلال حمید سب کو خدا حافظ کہتا جا چکا تھا۔

☆......☆......☆

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد اُمِ زارا اُمِ فروا کا ہاتھ پکڑے اُسے اُس کمرے میں لے گئی جو ان دونوں بہنوں کا تھا۔

اندر پیر رکھتے ہی اُمِ فروا کو یوں محسوس ہوا جیسے کسی گداز چیز نے اُس کے پاؤں اپنے اندر گم کر لیے ہوں۔ اُمِ زارا نے لائٹ آن کر دی۔ کمرہ روشنیوں سے جگمگا اٹھا۔

''یہ کیا۔'' اچانک اُمِ فروا کے منہ سے نکلا۔ یہ وہ کمرہ لگ ہی نہیں رہا تھا۔ ٹی کلر ڈسٹمبر ہو چکا تھا۔ چھت پر ہارڈ بورڈ لگوا کر سفید کلر کروا دیا گیا تھا۔ ٹوٹے پھوٹے فرش کی جگہ نرم قالین بچھا ہوا تھا۔ سامنے انتہائی نفیس اور خوبصورت صوفہ سیٹ تھا اور ڈیکو پینٹ شدہ دو اسٹائلش کرسیاں کارنر سائیڈ پر رکھی تھیں۔ سینٹر میں گلاس ٹیبل اور سائیڈ ٹیبل بھی تھے۔ سامنے فرنٹ پر لوحِ قرآنی خطاطی میں بڑے سے ڈبل فریم میں کمرے کی خوبصورتی میں اضافہ کر رہی تھی۔ یہ کمرہ کافی بڑا تھا درمیان میں موتیوں کا پردہ لگا کر دوسری طرف ڈریسنگ ٹیبل رکھا ہوا تھا۔ کمرہ مختلف ڈیکوریشن پیس سے سجایا ہوا تھا۔ اُمِ فروا کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ وہی کمرہ ہے جس میں ان دونوں بہنوں کے پرانے زمانے کے دو پلنگ بچھے ہوئے تھے۔ دو بید کی کرسیاں اور ایک میز پڑا ہوا تھا۔

''یہ سب کہاں سے آیا۔'' اُس نے اُمِ زارا کی طرف دیکھا۔

''اسماعیل بھائی بچوں کو ٹیوشن پڑھانے کے ساتھ ساتھ خطاطی کا کام بھی کرتے ہیں۔ آپ کو تو پتا ہی ہے شروع سے ہی وہ کس قدر خوش خط تھے۔ انہوں نے بہت سارے فن پارے بنا کر ایک دوست کے بھائی کی دکان میں رکھوا دیے تھے۔ وہاں ہاتھوں ہاتھ بک گئے اور بھائی کے پاس ایک دم سے آرڈر آنے شروع ہو گئے اور ہدیہ بھی بہت اچھا ملنے لگا۔ ایک دفعہ ایسے ہی میرے منہ سے نکل گیا تھا۔ بھائی میرا دل چاہتا ہے ہمارے گھر میں بھی صوفہ ہو۔ بھائی کے ایک دوست کی فیملی کراچی شفٹ ہو رہی تھی وہاں سے بھائی کو یہ سامان مناسب پیسوں میں مل گیا تو انہوں نے خرید لیا۔''

''اباجی نے کچھ نہیں کہا۔'' اُم فروا نے پوچھا۔

''انہیں بُرا تو لگا کہ یہ سب دنیاوی چیزیں ہیں اگر ان سے محبت کرنے لگو گے تو اسی دنیا میں دل لگ جائے گا۔ خواہشیں بڑھتی چلی جائیں گی۔ انہوں نے خاصا لمبا لیکچر دیا تھا۔ بعد میں میری خوشی دیکھ کر کچھ نہیں بولے تھے۔''

''اُم زارا اسماعیل کو پہلے اباجی سے پوچھ لینا چاہیے تھا۔''

''باجی بہت سستا مل رہا تھا۔ ایک سال پہلے انہوں نے خریدا تھا۔''

''تم اور اسماعیل کہاں سوتے ہو؟''

''آئیں اب آپ مابدولت کا بیڈروم دیکھیں۔'' اُم زارا اُسے برآمدے میں لے آئی برآمدے کے شمال کے حصے میں دروازہ لگا دیا گیا تھا۔ اُم فروا نے اندر قدم رکھا تو حیران رہ گئی یہ وہی برآمدے کے کارنر والا حصہ تھا جہاں گھر کا فالتو سامان رکھ کر پردہ لگایا ہوا تھا۔ اب اس کی دیواریں چمک رہی تھیں۔ فرش پر عنابی اور سفید پھولوں والی چاندنی بچھی ہوئی تھی۔ دیوار کے ساتھ اُم زارا کا ایک پلنگ تھا۔ وہی دو پرانی کرسیاں اور ایک میز رکھا ہوا تھا جس پر میز پوش بچھا ہوا تھا۔ دوسرے کونے میں ان کی کتابوں والی الماری بھی ساتھ ہی خطاطی کے چند فریم آویزاں تھے۔

''آپی یہ میرا بیڈروم ہے۔'' اُم زارا بہت خوش دکھائی دے رہی تھی۔ اسماعیل بھائی ہمیشہ کی طرح اباجی کے کمرے میں سوتے ہیں۔'' اسماعیل اَب کمانے لگا تھا۔ اُس نے پورے گھر کو رنگ روغن کروا دیا تھا۔ گھر پہلے سے کہیں زیادہ اچھا لگ رہا تھا۔ اُم زارا اُم فروا سے باتیں کرتی صحن میں آ گئی تھی۔ موتیے اور رات کی رانی کے پودے کلیوں سے بھرے ہوئے تھے البتہ امربیل کچھ اُداس دکھائی دے رہی تھی۔ اُس کے پتے کافی کم رہ گئے تھے۔ اُم فروا محبت سے اُس کے پتوں پر ہاتھ پھیرتی رہی۔

''اُم فروا تم امربیل کا خیال نہیں رکھتی ہو۔''

''بہت خیال رکھتی ہوں۔ روزانہ پانی دیتی ہوں۔ جب بھی اِدھر آؤں ان سے باتیں بھی کرتی ہوں۔ آپ کا ذکر بھی اکثر کرتی ہوں۔ انہیں تسلی دیتی ہوں کہ باجی کے بغیر اُداس مت رہو، وہ جلدی آئیں گی تم سب سے ملنے۔''

''اُم زارا پودے بہت حساس ہوتے ہیں۔ کل سے میں انہیں پانی دیا کروں گی۔'' کافی دیر تک وہ دونوں پودوں کے پاس کھڑی باتیں کرتی رہیں۔

اُم زارا نے میٹرک کر لیا تھا۔ وہ کالج میں ایڈمیشن لینا چاہتی تھی لیکن مولوی صاحب اجازت نہیں دے رہے تھے۔ اب اُم زارا گھر پر اسماعیل سے پڑھتی تھی۔ وہ ایف اے کی تیاری کر رہی تھی۔ اُم زارا نے اپنے پلنگ کے ساتھ اُم فروا کا پلنگ لگا دیا تھا جو اُم فروا کے جانے کے بعد برآمدے میں رکھا ہوا تھا۔ رات دیر تک دونوں بہنیں باتیں کرتی رہیں۔ اُم زارا تو جانے کس وقت سو گئی لیکن اُم فروا کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ بڑی بڑی دو براؤنش آنکھیں بار بار اُس کی خیال گاہوں میں اُتر رہی تھیں۔ وہ بے چینی سے پہلو بدلتی، اب کی بار وہ شہد آگیں آنکھیں اپنی جاذبیت بھرے چہرے سمیت اس کے سامنے تھیں۔ وہ ٹکر ٹکر اسے دیکھ رہے تھے اور اس کی گھنیری پلکیں وہ حدتیں سہار نہ پاتے ہوئے جھکی جا رہی تھیں۔

(عشق کی راہداریوں میں، زندگی کی سچ بیانیوں کی چشم کشائی کرتے اِس خوبصورت ناول کی اگلی قسط، انشاء اللہ آئندہ ماہ فروری میں ملاحظہ کیجیے)

میں تو ایک بیٹی بیاہ رہی ہوں تو دل درد کا پھوڑا بنا ہوا ہے اور میری ماں ...... جس نے آٹھ بیٹیاں اپنے آنگن سے رخصت کیں۔ تین بیٹیاں انگلینڈ میں ہیں، سالوں بعد ملنا ہوتا ہے۔ بے شک اب فون کی سہولت ہے۔ دن میں کئی بار فون ہوتا ہے، بات کرتے ہیں مگر وہ......

اقبال بانو کے قلم سے، ایک ماں کے جذبات سے گندھا افسانۂ بے مثل

اور آج جب میری بیٹی ڈولی کے لیے وسیم کا پروپوزل آیا تو ایک لمحے کے لیے میں شاکڈ رہ گئی۔ حیرت سے سامنے بیٹھی ڈولی کو دیکھا۔

'ارے کیا میری ڈولی اتنی بڑی ہوگئی کہ اُس کے پروپوزل آنے لگے! نہیں۔ نہیں ڈولی ابھی بچی ہے۔ ابھی کہاں اُس کی شادی کی جاسکتی ہے۔ بڑی تو ہولے، ابھی کل کی ہی تو بات ہے، ڈولی میری انگلی پکڑ کر چلنا سیکھ رہی تھی۔' میں نے اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر سوچا۔ اور پھر ڈولی کی طرف دیکھا جو اسٹڈی ٹیبل پر بیٹھی نہایت تیزی سے اپنا اسائمنٹ مکمل کرنے میں لگی تھی۔ میری کیفیات سے بے نیاز، حسبِ معمول اپنی پڑھائی میں مگن۔

یہ کتنے برس بیت گئے ہیں۔

پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی گزر گیا ہے۔

میں خود کو آئینے میں دیکھ رہی ہوں۔ لگا آج پہلی بار خود کو دیکھا ہے، خود سے ملی ہوں۔ کنپٹیوں کے سفید بال مجھے میری زندگی کے سفر کی کہانی سُنا رہے ہیں۔

میں نے عاشق حسین کو دیکھا۔ آج تو مجھے وہ بھی بدلا بدلا سا لگ رہا ہے۔ وقت نے ہم دونوں کو کہاں لا کھڑا کیا ہے۔ میرے ہاتھوں کی پشت پر رگیں ابھر آئی ہیں تو عاشق حسین کے چہرے کی جلد بھی ڈھلک گئی ہے۔ مگر ڈولی کا چہرہ کتنا چمک رہا ہے، جیسے چودھویں کا چاند۔ کسی زمانے ایسی ہی چمک میرے چہرے پر بھی تھی، جب میں اپنی ماں کے گھر میں تھی۔ تو ایسی ہی چمک بنا کسی میک اپ کے میرے چہرے پر بھی بکھری رہتی تھی۔ ہاں تو میں بات کر رہی تھی ڈولی کے آئے پروپوزل کی۔

مجھے تو لگتا ہے جیسے کل ہی کی بات ہو جب میری ڈولی، میرے بابل کے آنگن سے عاشق حسین کے آنگن میں اتری۔ (عاشق حسین میرا ماموں زاد بھی ہے)۔ انتہائی نفیس، Loving اور کیئرنگ شخص، انتہائی پیارا انسان، جس سے محبت کرنے کو خود بخود دل چاہے۔ ہم دونوں میاں بیوی کم اور دوست زیادہ

ہیں۔ شروع ہی سے ہماری زندگی اتنی خوبصورت اور سوفٹ گزری کہ کسی دُکھ پریشانی کا پتا ہی نہ چلا۔ زندگی گزرتی گئی۔ بچے ہوئے اور بڑے ہوگئے۔ ڈولی بھی بڑی ہوگئی۔

میری مامی یعنی ساس اور عاشق حسین کی خواہش ہے کہ ڈولی کا پروپوزل قبول کرلیا جائے کیوں وسیم اچھا لڑکا ہے۔ پھر اپنا ہے۔ نیویارک میں بینک میں اعلیٰ عہدے پر فائز ہے اور پھر وسیم میں ایسی کوئی بات نہیں کہ اُسے Base بنا کر اُس کا پروپوزل Reject کردیا جائے۔

میں اِن ماں بیٹے کی باتیں سنتی ہوں اور باہر آجاتی ہوں۔ پتانہیں کیوں مجھے میرا ذہن ماضی کی طرف دھکیل رہا ہے۔ میں لان چیئر پر آبیٹھی ہوں۔ میرے سامنے یادیں جگنوؤں کی مانند ناچ رہی ہیں۔

مجھے یاد ہے جب ڈولی کا وجود قدرت نے میرے اندر ڈالا۔ تو مجھے ایک عجیب سا احساس ہوا۔ حالانکہ میں اب دوسری بار ماں بننے جارہی تھی۔ پہلے اویس پیدا ہوا تھا۔ میرا بیٹا، میرے اللہ کا انعام...... میرا بیٹا...... میری جان...... مگر جب ڈولی کے وجود کا احساس ہوا تو میں ایک دم گھبرا گئی۔ ابھی اویس بہت چھوٹا تھا مگر......

نہیں...... اس بار میری کیفیت اویس سے الگ تھی اور ہم جو آٹھ بہنیں ہیں، ماشاء اللہ! اُس کے باوجود مجھے بیٹی کی خواہش تھی۔ ہے نا حیرت کی بات اور پھر جب مجھے ڈاکٹر نے خوشخبری سنائی کہ اس بار میں بیٹی کی ماں بنوں گی تو میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ جی چاہا وہیں سجدہ ریز ہوجاؤں۔ میاں کو یہ خوشخبری سنائی۔ میرے میاں بہت نائس ہیں۔ وہ میری خوشی میں خوش رہنے والے ہیں۔ انہوں نے دیکھا کہ بیٹی کی خبر سُن کر میں خوش ہوں تو وہ بھی بہت خوش ہوئے۔

میں بیٹی کی ماں بننے جارہی تھی، جس کے بارے میں میرے پیارے رسول محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ''بیٹی رحمت ہے!'' اور میرے گھر اللہ کی رحمت آرہی تھی۔ رحمتوں کا کیا حساب اور جواب؟ ہم آنے والی بچی کا نام سوچتے، کتنے نام سوچے اور Reject کیے۔ اویس بھی کبھی کبھی اگنور ہوجاتا تو مجھے دکھ ہوتا۔ اویس کو مامی جی سنبھالتیں اور میں اپنی آنے والی بچی کے لیے شاپنگ کرتی۔ ہم اُس کا کمرہ سیٹ کررہے تھے (جیسے کہ اُس نے پیدا ہوتے ہی الگ رہنا ہے) میرے اندر وجود کی حرکت مجھے ایک خوبصورت احساس سے نوازتی اور کبھی کبھی میں اپنی Feelings پر ہنس پڑتی۔ ہر بات میں اپنے میاں سے شیئر کرتی۔ ہم دونوں بچی یعنی بیٹی کے لیے کتنے ایکسائیٹڈ تھے یہ بتا نہیں سکتی۔

کبھی کبھی میں یہ سوچتی وہ کیسا دن ہوگا جب میرے وجود میں پلتا وجود، میری بچی میری گود میں ہوگی۔ میں نت نئی اُس کی شکلیں بناتی اور مسکراتی رہتی۔

پھر ایک خوبصورت اُجلے اور سرد دن میں، میں نے ہوسپٹل میں بچی کو جنم دیا۔ نرس نے مجھے بتایا۔

''یورز بے بی از اے باربی ڈول۔'' میں ہنس دی جیسے مجھے پتا ہو کہ وہ ڈول ہی ہوگی۔ پھر نرس نے وہ جیتی جاگتی خوبصورت آنکھوں اور روئی کے گالوں جیسی نرم سی ڈول میری گود میں ڈالی۔ تو مجھے لگا جیسے ہفت اقلیم کی دولت میری جھولی میں آگئی ہو۔ کبھی میں اُس کے گال نرمی سے چھوتی اور کبھی اُس کے چھوٹے چھوٹے ہاتھ چومتی، اُس کی ننھی ننھی، نرم نرم انگلیاں اپنے لبوں پر پھیرتی۔ سرخ ایڑیوں والے خوبصورت پاؤں چومتی۔

اور پھر سب کے متفقہ فیصلے سے اُس کا نام لاریب حیدر رکھا گیا۔ مگر وہ میری ڈول تھی جو ڈولی بن گئی اور اُسے بھی اِسی نام کی پہچان ہوئی۔ لاریب نام پس پشت چلا گیا۔ میری بیٹی سب کی ’ڈولی‘ بن گئی۔

یوں ہی دن گزرتے گئے۔ میں مامی سے پوچھتی۔ ’’یہ کب بولے گی...... کب مجھ سے باتیں کرے گی۔‘‘ اور وہ ہنس دیتی۔

اور...... وہ دن کبھی بھی میں نہ بھولوں گی جب ڈولی نے مجھے ’ماما‘ کہا۔

میرے پاؤں زمین پر نہ ٹکتے تھے۔ بار بار دل چاہتا کہ وہ مجھے ’ماما‘ کہے اور میرا رواں رواں ’جی‘ کی تکرار کرے۔ مگر وہ تو بچی تھی، میری خواہش کیسے جانتی؟ اپنے موڈ کی مالک تھی۔ شروع سے ہی ماشاء اللہ ذہین تھی۔ بھوک لگی ہوتی تو ماما...... ماما...... کی رٹ لگا لیتی اور مجھے پتا چل جاتا کہ اُسے فیڈ چاہیے۔

اور پھر جب ڈولی نے پہلا قدم اٹھایا تو مجھے لگا جیسے میرے اردگرد رنگوں کی برسات اتر رہی ہو۔ میرے اطراف خوشنما پھول کھل اٹھے ہوں۔ میں اُسے بار بار چلتا دیکھنا چاہتی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی، کھلکھلاتی اور میرے بازوؤں میں آ جاتی۔ ڈولی کے چلنے پر ہم نے سب میں مٹھائی تقسیم کی۔

ڈولی کا پہلا برتھ ڈے شاندار طریقے سے سیلیبریٹ کیا بلکہ ہر سال اُس کی سال گرہ منائی۔ مجھے یہ کہنے میں عار نہیں ہے کہ ڈولی میری زندگی پر حاوی تھی اور اویس میری توجہ کا منتظر ہی رہتا۔

ڈولی چھوٹی سی تھی تو اُس کے خوبصورت ریشم جیسے بالوں میں، میں رنگ برنگی پونیاں لگاتی تو وہ چھوٹی سی گڑیا اور بھی پیاری لگتی۔ پھر میں اُس کی تصویریں بناتی۔ اُس کی ایک ایک حرکت کو کیمرے کی آنکھ میں محفوظ کرتی اور جب میں شاپنگ اسٹور جاتی تو اُس کے لیے چیزیں لیتی۔ اُس کے یونیفارم دیکھتی کہ اب میری خواہش تھی کہ ڈولی اسکول جائے۔

ڈولی کے لیے میرے خواب! نہایت سچے، کھرے، اور روشن تھے، میں چاہتی وہ جلد اسکول جائے، خوب پڑھے۔ فر...... فر انگریزی بولے۔ ڈیبیٹ میں حصہ لے اسکول میں Top کرے تا کہ اُس سے وابستہ میرے خواب پورے ہوں۔

ڈولی اب توتلی زبان میں بات کرتی۔ چیزوں کے بارے میں وہ جاننا چاہتی تھی۔

’’ماما وہ تا ہے، ماما وہ تا ہے؟‘‘

پھول، درخت، کار، دروازہ وہ بار بار سوال کرتی اور میں اُس کا منہ چوم چوم لیتی۔

’’ڈولی وہ Tree ہے، یہ Flower ہے، Car ہے، مختلف چیزوں کے نام لیتی۔ غرض کہ وہ اس طرح سیکھ رہی تھی اور میں اُسے سکھا رہی تھی۔

ڈولی کے اسکول کا پہلا دن...... اویس کو مامی کے پاس چھوڑ کر ہم دونوں ڈولی کو اسکول داخل کروانے گئے۔ میری بیٹی کا ننھا سا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا۔ علم کی جانب میری سویٹ ہارٹ کا پہلا قدم، ڈولی بہت ذہین رہی ہے۔ کلاس کی Topper بچیوں میں اِس کا شمار ہوتا۔ ڈولی کا ہر رزلٹ مجھے وہ خوشی دیتا جو صرف ایک ماں ہی محسوس کر سکتی ہے۔

مجھے ڈولی پر پڑھائی کے معاملے میں کبھی سختی نہیں کرنی پڑی۔ کسی بھی معاملے میں ڈولی نے مجھے شکایت کا موقع نہیں دیا۔ بہت حساس ہے۔ Loving پرسن ہے۔ ہم نے کبھی اس پر زبردستی نہیں کی کہ تم یہ پڑھو، یہ بنو...... ڈولی کا شوق تھا کہ اُس نے میڈیسن پڑھنی ہے، ہم نے اُسے اسی میدان میں بڑھنے کے لیے تعاون کیا۔

آج ایک بات بتاؤں! ڈولی میرے لیے کیا ہے؟ وہ صرف میری بیٹی ہی نہیں میری دوست ہے، بہن ہے۔ ڈولی سے میرے دل کے کئی رشتے ہیں۔ ہم دوستوں کی طرح ہر بات شیئر کرتے ہیں۔ بہنوں کی طرح دُکھ سکھ بولتے ہیں اور کبھی مجھے ڈولی میری پریشانی پر ماں کی طرح دلاسہ دیتی ہے۔

بھلا بیٹیاں ایسی ہوتی ہیں؟ خدا کا احسان ہے کہ اُس نے مجھے ڈولی جیسی پیاری بیٹی دی۔

اور اب کیا ڈولی کا 'اپنے گھر' جانے کا وقت قریب ہے۔ ہاں اُس کا پرپوزل آیا ہے۔

میں سالوں کا سفر گھنٹوں میں طے کر چکی ہوں۔

☆......☆......☆

اور پھر پاکستان میں امی، بہنوں بھائی سے مشورہ کیا۔ سُسرال والوں سے پوچھا اور یوں ڈولی کا پرپوزل قبول کر لیا گیا۔ پھر دھوم دھام سے ڈولی کی منگنی کی، تو مجھے مسکراتی، ہنستی ڈولی کو دیکھ کر اطمینان تو ہوا مگر دل میں ایک کانٹا سا بھی چبھا۔ ڈولی امریکہ چلی جائے گی۔ مجھ سے دور...... دل پر ہاتھ رکھ کر میں نے ڈبڈبائی نظروں سے ڈولی کو دیکھا۔ جو اپنی سہیلیوں سے باتوں میں مصروف تھی۔

دل نے کہا۔ ''تم بھی تو اپنی ماں سے دور ہو۔'' ہم تین بہنیں انگلینڈ میں ہیں۔ میری ماں کا بھی، تو دل گردہ ہے۔

ڈولی کی منگنی کے بعد مجھے اپنی ماں شدت سے یاد آئی۔ اُس کا حوصلہ، اُس کی ہمت یاد آئی۔ ارے میں تو ایک بیٹی بیاہ رہی ہوں تو دل درد کا پھوڑا بنا ہوا ہے اور میری ماں ...... جس نے آٹھ بیٹیاں اپنے آنگن سے رخصت کیں۔ تین بیٹیاں انگلینڈ میں ہیں، سالوں بعد ملنا ہوتا ہے۔ بے شک اب فون کی سہولت ہے۔ دن میں کئی بار فون ہوتا ہے، بات کرتے ہیں مگر وہ ماں سے چپکی ڈالنا، اُس کی گود میں سر رکھ کر اب بھی لیٹ جانا، اُس کا لمس محسوس کرنا...... وہ تو فون پر نہیں ہوتا؟

تجھے سلام ماں...... تیرا دل بہت بڑا ہے اور تیرا حوصلہ پہاڑ جیسا۔ دعا کر ماں تیرے والا حوصلہ مجھ میں بھی آ جائے۔ میں تیری طرح سینے پر ہاتھ رکھ کر دل کو سنبھال لوں۔ تُو نے بھی تو آٹھ ڈولیاں اٹھوائی ہیں۔ کیسے سنبھلی ہوگی ماں۔ آج مجھے احساس ہو رہا ہے تیرے دُکھ کا، تیرے درد کا۔

ہاں تو میں بتا رہی تھی کہ وسیم کا پرپوزل قبول کیا، منگنی ہوئی اور پھر جلدی جلدی شادی کا شور......

ڈولی جس نے منگنی چپ چاپ کروالی تھی اب بول پڑی کہ میری تعلیم کے مکمل ہونے تک شادی نہیں۔''

آخر وسیم نے وعدہ کیا کہ وہ اُس کی پڑھائی میں رکاوٹ نہیں بنے گا۔ اور وہ جب چاہے گی انگلینڈ آ کر اپنی تعلیم مکمل کرلے گی۔ مگر میں ابھی شادی کروں گا۔''

پھر ڈولی مان گئی۔

جیسے ہی ڈولی مانی شادی کی تاریخ مقرر کر دی گئی اور پھر تیاریاں......

☆......☆......☆

سمجھ نہ آ رہا تھا کہ کیسے کروں سب کچھ......

پاکستان میں بہنوں کو فون کھڑکا دیے۔ ارشاد...... گوگی...... سونیا...... میرا پیارا اور اکلوتا بھائی افتخار الحسن، جیسے ہم پیار سے بابر کہتے ہیں۔ سب کو بتایا کہ 14 اگست کو میری ڈولی اپنے گھر جائے گی۔''

امی نے کہا وہ بھی ڈولی کو رخصت کرنے آئیں گی اور میں خوش ہوگئی۔

بہنوں کو بتایا کہ فلاں، فلاں چیز لو...... میں رقم وہاں بینک میں ٹرانسفر کراتی رہی اور میری بہنیں بازاروں کے چکر لگاتی رہیں۔ ارشاد تو پنڈی، پشاور

باڑے سے چیزیں لیتی۔ کبھی کسی کے ہاتھ بھیجتی تھیں اور کبھی ممتاز بھائی کو ریئر کرتے۔ اپنے طور پر میں نے ڈولی کی پسند کی ہر چیز لی ہے۔ جہیز میں کوئی کمی نہیں چھوڑی۔ اللہ میری ڈولی، میری دوست کا نصیب اچھا کرے۔ اپنے گھر کی رونق وسیم کے گھر کو خوشنما کرنے کے لیے بھیج رہی ہوں۔ مجھے یقین ہے وسیم میری ڈولی کو خوش رکھے گا۔

☆......☆☆......☆

آج میں اپنے فرض سے سبکدوش ہو رہی ہوں۔ میں بہت خوش ہوں...... ارے آپ میری آنکھوں کی نمی پر نہ جائیں۔ یہ تو خوشی کے آنسو ہیں کہ میری بیٹی اپنے گھر، اپنی راج دھانی میں جا رہی ہے کہ اپنے گھر جیسا کوئی گھر نہیں۔

سُنو ڈولی! میری جان! پاپا کی عزت! اب تم اپنے گھر جا رہی ہو۔ اپنے گھر کو سنوارنا، سجانا اور میری دعا ہے کہ اپنے گھر کی سلطنت میں تم ملکہ کی طرح رہو۔ میرے ہاں تو تم Doll تھیں، اب تم وہاں کوئین ہوگی۔ ڈول نازک ہوتی ہے اور کوئین کو بہت مضبوط ہونا چاہیے۔ میری دعا ہے کہ اللہ تمہیں خوش رکھے آمین۔

☆......☆☆......☆

آج جو مہمان آئے ہیں وہ سب تمہیں اپنی دعاؤں کی چھاؤں میں رخصت کرنے آئے ہیں۔

مجھے خوشی ہے کہ میری ماں بھی آج میری ڈولی کو رخصت کرنے کے لیے موجود ہے۔ میری ماں نے آٹھ بیٹیاں رخصت کی تھیں، اور آج جب میں نے پوچھا۔

''ماں آج تُو میری پہلی بیٹی کو اپنی دعاؤں میں رخصت کرنے آئی ہے تو کیسا لگ رہا ہے۔ کیسا محسوس ہو رہا ہے؟''

تب میری ماں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''ڈولی میری پہلی نواسی ہے اور مجھے لگ رہا ہے جیسے آج میں اپنی نویں بیٹی رخصت کر رہی ہوں۔''

کتنا حوصلہ ہے میری ماں کا...... اور میں چاہتی ہوں میری ماں یہ حوصلہ مجھے دے دے۔

''میری ڈولی کے لیے''

ہر اِک ماں یہ چاہے
نچھاور میں کر دوں
کرن، روشنی ہو صبا یا ستارے
میں ڈولی تجھے، اِس سے کیا دعا دوں
سدا خوش رہے لاڈلی تُو سدا ہی
کوئی آنچ دکھ کی کبھی چھو نہ پائے
کبھی کوئی غم بھی نہ چوکھٹ پہ آئے
مری لاڈلی ہر جگہ سُکھ تُو پائے
ہو بابل کا آنگن یا ساجن کا گھر ہو
ہر اِک ماں یہ چاہے
ہر اِک ماں یہ چاہے
Love You ڈولی

☆☆......☆☆

افسانہ

فرزانہ آغا

اِک کوہِ گراں اور۔۔۔

بالآخر ویگن پنڈی اڈے پر آن کھڑی ہوئی۔ شہر ویسا ہی بھرا بھرا اور پُر رونق تھا جیسے وہ چھوڑ کر گئی تھی۔ اسلام کا بول بالا تھا۔ اگرچہ بہتر فرقے اپنی اپنی بولیاں بول رہے تھے پھر بھی عام انسان بھٹکتا پھر رہا تھا۔ عالم بے عمل زیادہ ہوں تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ نفیسہ ظہر کے بعد......

سال گرہ نمبر کے لیے، ایک بہت خاص افسانہ، جو دلوں سے مکالمہ کرے گا

رجو نے کسمساتے ہوئے آنکھیں کھولیں اور کچھ دیر بے حس لیٹی غائب دماغی سے چھت کی کڑیوں کی طرف دیکھتی رہی۔ ہلنے کی کوشش کی تو لگا کہ جوڑ جوڑ ٹوٹا پڑا ہے۔ اوپر کھڑکی یا روشندان؟

فٹ بائے فٹ کے چوکھٹے کو کچھ بھی کہا جاسکتا تھا۔ اس میں سمائی دھوپ کی زردی بتاتی تھی کہ دوپہر ڈھلنے کو ہے۔ جامد سناٹا تھا اور ہوائیں...... ٹیکے کی تکلیف کے باعث بازو ہلایا بھی نہ جاتا تھا۔ اپنی تکلیف اور بے بسی پر رجو کے آنسو بہہ نکلے۔ اُس نے سوچا کیا ہی اچھا ہوتا جو اللہ جی نے عورت میں چاہے جانے کی، کسی سہارے کی چاہت نہ رکھی ہوتی اور جو رکھ ہی دی تھی تو پیٹ کا جہنم تو نہ دہکایا ہوتا۔ چاہے جانے کی خواہش اپنی اور اس سے بڑھ کر بھرا پیٹ بچوں کا! یہ دو خواب ہی تو عذاب کے در وا کرتے ہیں جو...... عورت کی قسمت یاوری نہ کرے تو۔

☆......☆......☆

رجو کی جاگتی آنکھوں میں خواب سمائے زیادہ وقت نہ گزرا تھا۔ پر موٹی موٹی شربتی آنکھوں کا کاجل پھیلتے ہی خاموشیاں دھیمے سروں میں گنگنانے لگیں۔ کام پر پہنچنے کی رفتار پر موبائل کی رنگ ٹون رخنے ڈالنے لگی اور دھڑکن کی تیزی، قدموں کی سستی میں بدلنے لگی پر دیر سے پہنچنے پر باجیوں کی پھٹکار بھی گالوں کے گلال کو واپس زرد کرنے میں ناکام ہوئی۔

درمیانے قد، بھرے بھرے جسم اور موٹی موٹی شربتی آنکھوں کے ساتھ رجو ویسی ہی زندگی گزار رہی تھی، جیسے بیوہ ہوجانے کے بعد اس خطے کی عورتوں کی اکثریت گزارتی ہے۔ روایتی شرافت، عقیدت کا لبادہ اوڑھ کر کہ ہاں، ہاں ہماری زندگی مرنے والے کے ساتھ ہی ختم ہوگئی۔'' خواہ وہ کتنی ہی نوعمر یا نوجوان کیوں نہ ہوں کہ معاشرے کا المیہ ہی یہ ہے کہ وہ انہیں اپنے طے شدہ فریم میں فٹ دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ فریم جو مذہب تک کی روح سے لگا نہیں کھاتا۔ رجو پندرہ برس کی تھی جب شفیق سے بیاہ کر اِدھر شہر آئی تھی۔ پہلے چار سالوں میں چار بچے اور پانچویں برس روڈ ایکسیڈنٹ میں شفیق کی موت

نے اُس پر بہت سے اَن دیکھے در وا کر دیے۔ کچھ برس تو مہیب سناٹے چھائے رہے پھر پیٹ کی پکار صدمے پر حاوی ہوئی۔ گزرتے برسوں میں کبھی کبھار جیٹھ نے کچھ پکڑا دیا۔ کبھی پیچھے گاؤں سے ماں یا بھائی کچھ بھجوا دیتے۔ کچھ خود گھر بیٹھے ٹوکریاں بننے سے بمشکل گزارہ چل رہا تھا۔ پر جب جیٹھ کی فروٹ کی دونوں ریڑھیاں سی ڈی اے والے اُٹھا کے لے گئے اور ماں نے آنکھوں کا آپریشن کروایا تو ایسے بڑے معاشی جھٹکے کھانے کے بعد اُن کی طرف سے گھٹتی امداد نے رجو پر گہری سوچیں مسلط کر دیں۔ رجو کے محلے سے تین چار عورتیں قریبی آبادی میں کام کی غرض سے جاتی تھیں اور تین چار بجے واپسی پر ہاتھوں میں بہر حال تھیلے تو ہوتے ہی تھے۔ ماہانہ تنخواہ کے یقین کے ساتھ ساتھ، رجو نے پہلے اُن سے بات کی اور پھر بڑی کل کل کے بعد ساس سے گھروں میں کام کرنے کی اجازت لے ہی لی۔ جیٹھانی کے ترلے منتیں کیں کہ وہ اُس کے پیچھے بچوں کا خیال رکھے گی۔ اُس کے اپنے ہی تین بچے تھے تاہم تھوڑی پس وپیش کے بعد اُس نے حامی بھر لی۔ ویسے بھی وہ ایک نرم دل عورت تھی۔ 'نہ' اُس کے لبوں پر کم ہی آتی تھی۔ تو اب گزشتہ چار برسوں سے سردی ہو کہ گرمی، لُو ہو کہ برسات، رجو علی الصبح نکلتی اور دوپہر تین سوا تین تک اسٹاپ پر آجاتی۔ مختلف گھروں سے ملنے والی چیزوں، کپڑوں، جوتوں میں ساس اور جیٹھانی کو انصاف سے کچھ نہ کچھ ملنے لگا تو ساس کے وقت بے وقت کے واویلوں پر غرض اور وقت کی دھول جمنے لگی اور یوں زندگی بہر طور بہتر انداز میں بسر ہونے لگی۔

رجو کو تو مزید اگلے چار برس بھی تھکاوٹ کا احساس نہ ہوتا وہ اسی طرح پلاسٹک کے بوٹوں تلے کڑکڑاتے، کورے اور فنا کر دینے والی لُو میں اپنا سفر جاری رکھتی، پر نئی سوچ کے دھانی رنگ راستے تو تب کھلے جب مقررہ وقت پر آنے والی ویگن کی اگلی سیٹ مستقل خالی ملنے لگی۔ رجو پہلے پہل اسے اتفاق سمجھی پر یہ اتفاق بڑی جلدی یقین میں ڈھلتا چلا گیا کہ ڈرائیور کی منتظر نگاہیں ویگن کا دروازہ کھلتے ہی فراق اگلنے کے بعد اب شہد اُگلتے 'پیا' بجنے لگی تھیں۔ اِدھر ویگن رُکتی، دروازہ کھلتا اُدھر یہ گیت فضاؤں میں بکھرتا۔

''ہیلو، ہیلو جی...... ہیلو! ہیلو جی! آ گئے ہم دلدار کے واسطے'' گیت کا سُنہرا افسوں دن بدن رجو کو پر چانے لگا تھا۔

پہلے فیڈ شدہ نمبر کے ساتھ موبائل موصول ہوا اور پھر رشید کی نہ ختم ہونے والی منت ذاریاں شروع ہو گئیں اور رجو صحرا جیسی اُجاڑ زندگی میں رنگ برنگی چنری جیسی قوس وقزح باتیں کچے دھاگے میں پروتی چلی گئی اور نتیجہ ایک پارک میں ملاقات کی صورت نکلا۔ حالانکہ پارک کے گیٹ سے پہلے نصب شدہ بڑے سفید بورڈ پر دیگر ہدایات کے ساتھ درج تھا۔ ''پارک میں جانو کو ساتھ لانا منع ہے۔'' کسی ستم ظرف نے 'ز' کو مٹا دیا تھا۔ پھر رجو اور رشید کو کیا فرق پڑتا تھا کہ کبھی کبھی کچھ نہ جاننا بھی کیسا باعث تقویت ہوتا ہے۔

خزاں کے خشک چرمراتے پتوں کے بیچ، سرمئی پگڈنڈیوں پر نئے قمیض شلوار میں ملبوس، چادر کو ایک زعم سے بار بار کندھے پر ڈالتے ہوئے پکی عمر کے اونچے لمبے سانولے رشید کے کرخت چہرے پر ایک فاخرانہ مسکراہٹ تھی۔ اور رجو؟ وہ اس کے سائے سائے چلتی خود کو ایسے محسوس کر رہی تھی کہ جیسے دھوپ میں کڑے سفر کے بعد برگد کا گھنا، مہرباں سایہ نصیب ہو گیا ہو۔

ایسے پُر تحفظ لمحات میں گزرے بسرے شفیق کی یاد کا سایہ چند قدم کو ہمقدم ہوا اور پھر راستے کی دھول میں مدغم ہوتے بالآخر دھیان کی نیم مندھی آنکھوں

سے او جھل ہو گیا۔

واپسی پر بہت کچھ تھا دامن میں، احساس تحفظ کی چھتر چھاؤں کے ساتھ ساتھ جہاں دھانی رنگ راستوں میں برف تنہائی پگھلتی، بہتی دور دفعان ہوئی تھی۔ تھیلے میں قیمتی خوشبو تھی، نئے کپڑے تھے اور پرس میں اتنے روپے ضرور تھے کہ رجو کی چھ ماہ کی کمائی سے اوپر بنتے تھے۔

اُس رات رجو سوئی کب؟ خیالوں خیالوں میں کبھی چھوٹے قاسم کے کوٹ سوئٹر خریدتی پھری۔ کبھی لڑکیوں کے جوتے کپڑے اور...... اور کھانے پینے کی کتنی ہی چیزیں تو خرید ڈالی تھیں...... صبح ابھی دور تھی۔

☆......☆......☆

بارہا اجنبی، مہربان راستوں پر اٹھتے قدم اندر ہی اندر تھوڑے خوفزدہ ضرور تھے پر حسنِ اتفاق کہ ان ہی دنوں ساس کی پھٹکاروں کے طفیل درس پر جانا ہوا۔ درس والی باجی رجو کی ساس کی دور پار کی رشتہ دار تھی، وہاں درس پر سو عورتوں کی ویڈیو دکھانے پر درس والی باجی کو این جی او سے ملنے والے راشن کا گراف دوگنا ہو جاتا تھا۔ وہ بعد میں آدھا تو ضرور ہی عورتوں میں بانٹ دیا جاتا تھا۔ اِسی آس میں قاسم کو گھٹنے سے لگائے بے دلی سے بیٹھی رجو کا روم روم سماعت بن گیا جب 'نکاح کی فضیلت' کا بیان شروع ہوا۔

درس والی باجی بتا رہی تھیں کہ 'نبی پاک عدت کے اگلے روز ہی ضرورت مند بیوہ عورت کے نکاح کے حق میں تھے تا کہ عورت اور اس کے بچے بے آسرا نہ رہیں۔ اسلام میں اسی لیے نکاحِ ثانی کی گنجائش رکھی گئی ہے کہ......'' رجو نے اس سے آگے کا بیان سُنا کب۔ بس یہ ہوا کہ رشید کے اصرار اور اپنے دل سے اٹھنے والی خواہش پر جب دین کی واضح مہر لگی دکھائی دی تو سکون اور طمانیت اندر تک اُتر گئی۔

اگلے ہی جمعے رجو نے چپ چاپ رشید سے نکاح کر لیا۔ شرعی حق مہر کے عوض...... اور سکھ کا گہرا لمبا سانس لیا۔

رشید! کہ جس کا کہنا تھا کہ پہلے وہ صرف اُسے گاؤں لے کر جائے گا اپنی ماں سے ملوانے اور پھر بچوں کو بعد میں ساتھ لے جائے گا۔ بڑی دونوں لڑکیاں ویسے بھی اِن دنوں نانی کے پاس پیچھے پنجاب کے دور اُفتادہ گاؤں میں تھیں۔ ہاں! چھوٹے دونوں کے ہاتھ جیٹھانی کے ہاتھ میں تھماتے۔ اُس کے کانوں میں سرگوشیاں کرتے اپنا راز دار بناتے رجو کہنے لگی کہ وہ بس چار پانچ دن میں لوٹ آئے گی۔ جیٹھانی حیرت زدہ کھڑی پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُسے دیکھ رہی تھی۔ جاتے ہوئے رجو نے بھری بھری کلائی میں ٹھنسا ٹھنس چوڑیوں والے ہاتھ سے چادر سر پر اوڑھی تو ہزار اندیشوں میں لرزتی جیٹھانی نے ہولے سے پوچھا۔

''اماں کو بتا دوں؟''

''بتا دینا شام کو جلدی کیا ہے؟'' رجو بے پروائی سے بولی۔ ''چار پانچ دن بعد آ کر بچوں کو لے جاؤں گی۔'' اُس کا انگ انگ ایک لہک میں تھا۔ وہ جاتے جاتے کواڑ بھیڑ گئی۔ جیٹھانی اور بچوں کی آنکھیں بند کواڑ پر ٹکی تھیں۔

☆......☆......☆

پہاڑوں پر سورج کے اوٹ میں ہوتے ہی شام تیزی سے ملگجانے لگی۔ رجو نے لکڑی کی پرانی سی میز کھینچی اور اُس پر کونے سے اُٹھا کر چار چار اینٹیں رکھیں، پھر اُن پر کھڑی ہو کر فٹ بائے فٹ کی کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ پہاڑوں پر بین کرتی ویرانی تھی۔ گھنی کانٹے دار جھاڑیوں کے اوپر یخ ہوا کی سرکشی تھی اور بڑھتا اندھیرا ایسا جو کلیجہ پھاڑے ڈال رہا ہو۔ رجو نے مایوسی سے نیچے اترتے ہوئے نیلوں نیل دُکھتے بدن پر چادر دوبارہ لپیٹی۔ یخ بستگی موسم کی بھی

تھی اور دغا بازی کی تو تھی ہی، جس کو سہتے، سوچتے وہ گاہے بگاہے، کپکپانے لگتی اور رات تو پھر سر پر تھی۔

رجو نے تھوک نگلتے ہوئے دیے کی طرف دیکھا اور سر جھکا لیا۔ وہاں دیکھنے کو تھا بھی کیا؟ کچی اینٹوں کا کمرہ جس کی درزوں سے ہوا آر پار جاتی تھی اور جس میں جانوروں کی بُو بسی تھی۔ بدبو اور بساند سے بھرے دو تین بستر تھے۔ کمرے کے کونے میں گندا چیکٹ چولہا جس کے گرد چار آٹے دالوں کے ڈبے پڑے تھے اور اس کے عین پیچھے چھوٹا سا کچا غسل خانہ تھا۔ ہاں! کونے میں دو شاپر بھی تو تھے جو وہ گھر سے لے کر چلی تھی۔ اس شاپر میں جوڑوں کے ساتھ کچھ سُنہری خواب بھی نیلوں نیل ہوئے پڑے تھے کہ تن کا جوڑا تو پہاڑ چڑھتے چڑھتے کانٹے دار جھاڑیوں سے لیروں لیر ہو گیا تھا اور تن پہاڑ چڑھ کہ......

باہر کسی کے چلنے کی آواز آئی۔ پہلے رجو کا دل پورے کا پورا ڈوبا پھر وہ چوکنی ہو کر بیٹھ گئی۔ یہ تو کوئی ایک آدمی لگ رہا تھا۔ رجو حتی الامکان تیزی سے اُٹھی اور میز پر چڑھ کر باہر دیکھنے کی کوشش کی۔ کچھ دکھائی نہ دیا پر، سنائی دیا۔ پہلے ایک بھاری ڈنڈے کی آواز جھنک کے ساتھ کہ شاید ڈنڈے پر گھنگھرو بندھے تھے، پھر پھٹے بھاری جوتوں میں بڑے قدم اٹھاتا بڈھا دکھائی دیا۔ رجو کھڑکی سے آواز پست کرتی ہوئی بولی۔

''رُکو......سنو!''

پھٹے ہوئے جوتے تھم گئے اور ان میں پاؤں سمائے بوڑھا بھی، جس کے تن چیتھڑے بھی باقاعدہ کپڑے رہے ہوں گے۔ جیسی رنگ برنگی خستہ لیریں ڈنڈے کے گرد تھیں ویسی ہی سر پر کھچڑی بالوں کے گرد لپٹی تھیں۔ بڈھے نے زنانہ آواز شاید برسوں بعد سنی تھی کہ قدم ساکت ہو جانے پر بھی بوڑھے وجود میں دھنسی آنکھیں سامنے ہی تکے جا رہی تھیں۔

''اِدھر......'' سہمی ہوئی آواز پر بڈھا مڑا اور چندھی آنکھوں سے کھڑکی کی سمت دیکھنے لگا۔

''تم کون ہو؟'' رجو نے خوفزدہ سرگوشی میں پوچھا۔ چہرے کی جھریوں میں دھنسی نیم اندھی، دھند لائی سی آنکھیں گہری سوچ میں ڈوب گئیں جیسے وہ یاد کرنے لگا ہو کہ وہ کون ہے؟''

''کوکا!'' بوڑھے ہونٹوں میں جنبش ہوئی اور خلافِ توقع جو آواز نکلی وہ مہربان تھی، ظاہری وضع قطع سے قطع نظر...... بڈھا کچھ قدم بڑھاتا کھڑکی سے قریب ہوا۔ رجو پر ایک خوف اُترا اور پھر بے خوفی بن کر اطراف میں پھیل گیا۔ خوف حد سے زیادہ بڑھ جائے تو بے خوف کر دیتا ہے۔

''میں رجو ہوں، رشید مجھے نکاح کر کے یہاں لایا تھا پر...... وہ اب آدمی ساتھ لاتا ہے۔ چار...... چار...... اور اُن سے پیسے لے کر۔'' اٹک اٹک کر بولتی رجو رونے لگی۔ نہیں پہلے کانپنے لگی پھر لرزتے لرزتے التجا کرنے لگی۔

''مجھے یہاں سے نکال دو...... باہر سے دروازہ کھول دو۔ وہ، وہ جاتے جاتے مجھے ٹیکا دے کر بے ہوش کر جاتے ہیں۔ وہ پھر آئیں گے۔ میں مر جاؤں گی۔'' کوکا نہ سمجھ میں آنے والی کیفیت میں کھڑا اُسے تکے جا رہا تھا۔

رجو روتے روتے بولی۔ ''وہ تین چار دن بعد آتے ہیں۔ میں تمہیں اللہ اور اُس کے نبیؐ جی کا واسطہ دیتی ہوں۔ میں واپس جانا چاہتی ہوں۔''

''واپس کہاں؟'' کوکے کے بُت وجود میں سے عجیب سی آواز آئی جیسے وہ طنز کر رہا ہو۔ جیسے وہ جانتا ہو کہ عورت کی واپسی کے راستے کتنے مخدوش ہوتے ہیں۔

''اپنے گھر واپس، بچوں کے پاس یا......'' وہ

کچھ سوچتی ہوئی بولی۔ ''پیچھے...... گاؤں! کہیں بھی کہیں بھی چلی جاؤں گی۔ کوئی تو رکھ لے گا۔ وہ بھیڑیے مجھے ادھیڑ دیں گے۔ میں بے موت ماری جاؤں گی۔ تمہیں اللہ سچے کا واسطہ ہے۔ دروازہ کھول دو۔'' رجو ہذیانی انداز میں گریہ کرتی ہوئی بولی پھر یک لخت خاموش ہوتے ہوئے پوچھنے لگی۔

''تم کیا کرتے ہو؟''

''میں تو فقیر ہوں بی بی! فقیروں نے کیا کرنا ہے؟''

''تم مجھے ساتھ لے چلو، تم نیچے کا، اس پہاڑ سے نیچے کا راستہ جانتے ہو؟''

''راستہ؟'' کوکا عجیب سے لہجے میں بولا۔ ''ہر راستہ ایک ہی طرف جاتا ہے۔ جب میں نے یہ جان لیا تو راستہ ڈھونڈنا چھوڑ دیا بس چلنا شروع کر دیا۔'' کوکا نیچے گہری ترائیوں میں دیکھتا جیسے خود سے مخاطب تھا۔

رجو نے پھر منت داری شروع کر دی۔ کوکا بولا۔

''باہر بھاری تالا پڑا ہے۔ میں دیکھتا ہوں اگر کوئی ملا تو۔'' بڈھے نے تسلی دی۔

''نہیں...... نہیں کوئی رشید کو نہ بتا دے۔'' رجو ہولا کر بولی۔

''کسی نہ کسی پر بھروسہ تو کرنا پڑتا ہے۔ بھروسہ تو غرض کی زکوٰۃ ہے۔ میں جاتا ہوں پر میرا انتظار نہ کرنا، دُعا کرنا۔''

''ہیں؟ انتظار نہ کرنا؟ کیوں؟'' رجو گھبرا کر بولی۔

''اجل آ گئی تو تیرا انتظار رائیگاں ہو جائے گا۔ دعا مستجاب ہو گئی تو کوئی اور مدد کو آ جائے گا۔ یہ کہتے ہوئے کوکے نے ایک جھٹک سے ڈنڈے کو جھٹکا اور قدم بڑھاتے ہوئے اندھیر پگڈنڈیوں میں گم ہو گیا۔

☆......☆......☆

رات کی کالک دور ہوئی اور ٹھنڈے برف سورج نے پہاڑ کی اوٹ سے سر اونچا کیا۔ رجو کب سے سویر کی منتظر تھی۔ ذرا روشنی ہوئی تو اُس نے چولہے پر پانی رکھا اور تیز پتی ابال کر گھونٹ گھونٹ پینے لگی۔ سوکھی روٹی کو گرم کر کے کھانے کی کوشش کی پر وہ حلق سے اترتی نہ تھی۔ وقت گزرتا رہا، رجو ہلکی سی آہٹ پر بھی چونک اٹھتی اور پھر سناٹا ہو جانے پر مایوس ہو کر بیٹھ جاتی۔ سورج کی روشنی چار سو جگمگا رہی تھی۔ جب اُسے لگا کہ کوکے کے ڈنڈے کی جھنک کی آواز آئی ہے۔ اُس کا روم روم سماعت بن گیا۔ وہ سارے درد سمیٹتی جلدی سے، میز اور اُن پر رکھی اینٹوں تک پہنچی اور اُسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا جب اُس نے کوکے کے ساتھ ایک ٹھگنے سے آدمی کو تھیلے سے اوزار نکالتے دیکھا۔ وہ ہذیانی انداز میں بولی۔

''جلدی...... جلدی کھولو۔'' رجو نے تیزی سے نیچے اترتے ہوئے بوٹ پہنے اور شاپر میں رکھے کپڑوں سے ایک شلوار کے نیفے سے تڑے مڑے نوٹ جلدی سے نکالے۔ ہتھوڑے کی زوردار ضرب سے تالا کھل چکا تھا اور کھلے دروازے سے آزادی بھری تازہ ہوا اندر داخل ہو رہی تھی۔

رجو باہر نکلی تو کوکا اُس آدمی کو کچھ تھما رہا تھا۔

''رین دیو بزرگو...... راہے مولا سہی۔'' (رہنے دو بزرگو، یہ کام اللہ کے لیے ہی سہی) رجو نے اُسے کچھ روپے تھمائے اور بولی۔

''اپنی اِس نیکی کا کسی سے ذکر نہ کرنا اور سنو! مجھے نیچے اتار دو۔ میں ان راستوں میں گم نہ ہو جاؤں۔''

''بی بی! مجھے ذرا جلدی جانا ہے۔ میں فوتگی سے اُٹھ کر آیا ہوں، اِن بزرگوں کے لحاظ میں۔ تم اِدھر سے دائیں ہو کر تو ڑتک چلتی رہو۔'' رجو بے بسی سے اُس کا منہ تکنے لگی تو کوکا آگے ہوا اور بولا۔

''چل چل آگے لگ وقت نہ ضائع کر، تیرا یہاں سے جلدی نکلنا ضروری ہے۔'' کوکا آگے

آ گے تھا اور رجو پیچھے پیچھے۔

"چار ساڑھے چار گھنٹے کی اُترائی کے بعد کچی پکی سڑک تھی جس کے کنارے بڑے پتھر پر دونوں بیٹھ گئے۔

"کوئی بس کب آئے گی؟" خوفزدہ، بھوکی، تھکی رجو نے اُمید افزا لہجے میں پوچھا۔ کوکا جواباً خاموش رہا۔ رجو نے قریبی چشمے پر سے پانی پیا اور کچھ چھینٹے منہ پر مارے تو کچھ حواس بہتر ہوئے۔ گھنٹہ گزرا ہوگا کہ دور سے ٹیوٹا ہائی لیکس کے انجن کی زور لگاتی آواز آئی۔ ویگن دیکھ کر رجو کی جان میں جان آئی۔ کوکے نے ویگن کو ہاتھ دے کر روکا اور ویگن کی طرف تیزی سے قدم بڑھاتی رجو کے سر پر ہاتھ رکھا۔ رجو نے شکر گزاری کے طور پر کچھ کہنا چاہا پر آنسو حلق تک بھر آئے۔ کلینر نے ویگن کا اگلا دروازہ کھولا۔ رجو ہچکچاتی ہوئی بولی۔

"پیچھے ...... پیچھے بیٹھنا ہے۔" کلینر نے بڑبڑاتے ہوئے پچھلا دروازہ کھولا اور سنگل سیٹ پر بٹھادیا۔ ویگن چل پڑی۔

"کتنی ہی دیر بعد چھانگلا گلی، چھانگلا گلی کی آواز پر رجو چونکی۔ اس چھوٹے سے اڈے پر رشید نے اُسے چائے پلائی تھی۔ رجو کچھ شانت ہو کر بیٹھ گئی۔ پنڈی قریب تھا، اُسے ذرا سکون بھی ہوا اور اب آگے کی فکر بھی ستانے لگی۔ کیا...... کیا ہوگا؟ اُس نے خود سے پوچھا۔ پھر سوچنے لگی قاسم کو پہلے سینے سے لگاؤں گی کہ چندا کو؟ یہ سوچتے ہی آدھے منہ پر لپٹی چادر آنسو جذب کرنے لگی۔ باقی وقت اسی اُدھیڑ بن میں گزرا۔ بالآخر ویگن پنڈی اڈے پر آن کھڑی ہوئی۔ شہر ویسا ہی بھرا بھرا اور پُر رونق تھا جیسے وہ چھوڑ کر گئی تھی۔ اسلام کا بول بالا تھا۔ اگر چہ بہتر فرقے اپنی اپنی بولیاں بول رہے تھے پھر بھی عام انسان بھٹکتا پھر رہا تھا۔ عالم بے عمل زیادہ ہوں تو ایسا ہی ہوتا ہے۔

نفیسہ ظہر کے بعد سکون سے دھوپ میں بیٹھی اخبار پڑھ رہی تھی کہ بیل بجی۔ ملازمہ لڑکی نے آ کر بتایا کہ کوئی رضیہ آپ سے ملنا چاہتی ہے۔

"رضیہ؟ کون رضیہ؟" نفیسہ نے پوچھا۔

"باجی! وہ رجو، جو پہلے کونے والے گھر میں ثمینہ باجی کے پاس کام نہیں کرتی تھی۔ وہ کہہ رہی ہے بہت ضروری بات ہے۔"

"اچھا بلاؤ۔"

رجو سر پیٹتی، روتی بے حال ہوتی نفیسہ کے قدموں میں بیٹھ گئی اور مختصراً اپنی کتھا سناتے ہوئے التجا کرنے لگی کہ اُسے کچھ دن اپنے گھر میں چھپالیں۔ ساس نے بیٹا چھین لیا ہے۔ لڑکیوں کو گاؤں بھیج کر مجھے گھر سے نکال دیا ہے۔ میں کہاں جاؤں۔ رشید اور اُس کے غنڈے مجھے ڈھونڈ لیں گے۔ تو پھر ساتھ لے جائیں گے۔ میں آپ کو تکلیف نہ دیتی میری باجی ہوتیں تو تڑپ جاتیں، مجھے اس حال میں دیکھ کر۔" رجو روتے روتے اپنے زخم، نیل اور چوٹیں بھی دکھا رہی تھی۔ کچھ زخم اور چوٹیں بالکل نئی تھیں جو ساس اور جیٹھ کی تواضع سے نمودار ہوئی تھیں۔

نفیسہ نے ملازمہ کو پانی اور کھانا لانے کا کہا وہ اندر ہی اندر پریشان تھی۔ اتفاق کہ اُس کے شوہر ملک سے باہر تھے اور دونوں بچے چھوٹے تھے۔ ایک دوبار اُسے خیال تو آیا کہ اگر رشید یا اُس کے غنڈے پیچھا کرتے آئے تو؟ پر اُس نے فوری طور پر اس خیال کو جھٹکا اور یہ کہتے ہوئے اُٹھ کھڑی ہوئی کہ پہلے تم کھانا کھالو پھر ہوسپٹل چلتے ہیں اور اب بالکل بھی مت ڈرو۔ اللہ مالک ہے۔"

رجو اس قدر خوفزدہ تھی کہ گھر سے باہر نکلنے کا سن کر پھر رونے لگی۔ نفیسہ نے اُسے سمجھایا کہ وہ صبر کرے۔ خاموش ہوجائے یہ اُس کی حفاظت کے لیے ضروری ہے۔" یہ بات اُس کی سمجھ میں ذرا دیر سے آئی۔

نفیسہ نے اُس کی پھٹی چادر بدلوائی۔ ڈرائیور سے کہہ کر گاڑی میں سن شیڈز لگوائے اور قریبی ہوسپٹل میں اُس کی مرہم پٹی کروائی۔

ہلدی ملے گرم دودھ کے ساتھ ادویات لینے سے اُس کی تکلیف میں کمی ہونے لگی۔ پندرہ بیس دنوں میں وہ کافی بہتر ہوگئی تو اُس نے کہنا شروع کیا کہ وہ پیچھے گاؤں جانا چاہتی ہے۔ اُس کے خیال کے مطابق رشید کیونکہ اُس کے گاؤں سے واقف نہیں تو وہ وہاں محفوظ رہے گی۔ نفیسہ نے اُسے مشورہ دیا کہ وہ ہفتہ ایک اور رُک جائے۔ معاملہ تھوڑا اور ٹھنڈا ہونے دو پھر چلی جانا۔

رجو اسے دعا دیتی تو ساتھ ضرور ہی اپنی ثمینہ باجی کو یاد کرتی اور کہتی۔

''ثمینہ باجی تو تڑپ جاتیں مجھے اِس حال میں دیکھ کر۔ وہ امریکہ سے واپس آئیں گی تو آپ کو علاج معالجے کے تمام پیسے ادا کردیں گی۔'' نفیسہ نے دو تین مرتبہ اُسے ٹوکا اور کہا کہ اس کے لیے یہی بات تسلی بخش ہے کہ وہ صحت مند ہوگئی ہے۔

مزید چند دنوں بعد نفیسہ نے اُسے ایک مناسب رقم تھماتے ہوئے روانہ کیا اور احتیاطاً گارڈ کو ڈرائیور کے ساتھ بس کے اڈے تک بھیجا۔ وہ دونوں اُسے مطلوبہ بس پر بٹھا کر آئے۔

☆......☆......☆

اڑھائی تین ماہ کے بعد ثمینہ کی امریکہ سے واپسی ہوئی۔ ایک روز نفیسہ واک سے واپس آرہی تھی تو ثمینہ سے ملاقات ہوگئی۔

نفیسہ طبعاً خود میں مگن رہنے والی عورت تھی اور میل ملاپ میں بھی میانہ روی کی قائل تھی۔ ثمینہ اسی بات کا گلہ کرنے لگیں کہ وقت سے تو برکت اٹھ گئی ہے اور زندگی کچھ ایسی ڈگر پر چل نکلی ہے کہ ملاقات ہی نہیں ہو پاتی۔ ساتھ ہی جب انہوں نے تذکرہ کیا کہ ان دنوں کوئی کام والی نہیں مل رہی تو نفیسہ نے انہیں بتایا کہ آپ نہیں تھیں تو رجو دو تین مرتبہ آپ کی طرف آئی۔ اُس کے ساتھ کچھ حادثہ ہوگیا تھا۔'' ثمینہ چمک کر بولیں۔

''پتا ہے مجھے اُس کے حادثے کا، میں یہاں ہوتی تو اس حرافہ کو گھر میں نہ گھسنے دیتی۔ ایسی آوارہ بدچلن عورتوں کے ساتھ ایسے ہی ہونا چاہیے تھا۔ بے غیرت! پیسے تو نہیں دیے نہ آپ نے اُس کو؟ اچھا دفع کریں۔ آپ چکر لگائیں میری طرف۔ میں بوتیک کھول رہی ہوں ذرا کلیکشن تو دیکھیں۔'' ثمینہ ایک سانس میں بھڑاس نکالتی بولیں۔

''جی! ضرور......ضرور!'' نفیسہ خدا حافظ کہتے اپنے راستے بڑھ گئیں۔

☆......☆......☆

وقت کا پہیہ اُسی تیز رفتاری سے گھومتا رہا۔ تین چار برس گزر گئے۔ ایک 'کمیٹی پارٹی' پر کچھ خواتین نے یہ پروگرام بنایا کہ اس قدر مصروف زندگی میں ملنے ملانے کا وقت ہی نہیں ملتا۔ بہتر ہے کہ ہر مہینے کے پہلے ویک اینڈ پر کسی ایک کے گھر 'گیٹ ٹو گیدر' رکھ لیا جائے۔ زیادہ تکلفات میں نہ پڑا جائے اور ہلکی پھلکی چائے پر گپ شپ ہوجایا کرے۔ سبھی نے اس نیک خیالی پر حامی بھرلی۔ غالباً تیسرا 'گیٹ ٹو گیدر' ثمینہ کے ہاں تھا۔ سب Neighbour کے علاوہ اُن کی کچھ کسٹمرز اور کچھ فرینڈز بھی انوائیٹڈ تھیں۔ دیگر گھروں کی نسبت اُن کے گھر مہمان ذرا زیادہ تھے۔

نفیسہ پہنچیں تو ثمینہ نے سب سے اُن کا تعارف کروایا۔ پھر میل میلاپ اور باتوں کا سلسلہ چل نکلا۔ اس دوران نفیسہ کو لگا کہ کچن سے ڈائننگ ٹیبل پر برتن رکھنے والی عورتوں میں کوئی چہرہ دیکھا بھالا سا بھی ہے، پر؟

جب وہ ثمینہ کے پاس آکر بولی۔ ''باجی!

چائے تیار ہے۔'' تو اِس آواز پر نفیسہ چونکی۔ وہ رجو تھی جس نے بھری محفل میں ایک خالی نظر نفیسہ پر ڈالی۔ وہ نظر اتنی لاتعلق اور انجان تھی کہ نفیسہ کو وہم سا ہوا کہ شاید یہ رجو نہ ہو اُس کی کوئی بہن ہو؟ پر وہ رجو ہی تھی۔ جس کا روشن چہرہ اور بھوری شربتی آنکھیں خود اعتمادی سے جگمگا رہی تھیں اور کہہ رہی تھیں ہم نے کامیابی سے اپنے ظاہری زخموں پر 'سب اچھا ہے' کا لبادہ اوڑھ لیا ہے۔ رہے اندر کے زخم! تو وہ کبھی بھر پائے ہیں کیا؟

سب لوازمات اور چائے سے لطف اندوز ہو رہے تھے اور رجو اُسی لاتعلقی سے گرما گرم پکوڑے اور سموسے لا لا کر میز پر رکھ رہی تھی۔ بہت رونق رہی، ثمینہ بڑھ بڑھ کر سب کی میزبانی کرتی رہیں۔ چائے کے بعد آہستہ آہستہ مہمان رخصت ہونے لگے۔ ثمینہ ذرا فارغ ہوئیں تو نفیسہ کے پاس آ بیٹھیں اور بولیں۔

''شکر ہے سب ٹھیک ہو گیا۔ دراصل لوگ زیادہ تھے تو میں فکر مند تھی۔ وہ تو سلمٰی اور نسرین کے ساتھ رجو خود ہی آ گئی۔ میں نے بھی کہا چلو اچھا ہے۔ اپنی غرض نمٹاؤ، فروٹ چاٹ کے لیے ڈھیروں فروٹ کاٹنا تھا۔'' پھر ذرا آگے کو ہوتی بولیں۔

''یہ رجو کی بڑی بیٹی کی شادی طے ہو گئی ہے نہ تو گاؤں سے پھر اِدھر آ گئی ہے کہ کام کاج سے ذرا کچھ آمدن ہو جائے۔ لڑکا برادری کا ہے پر لمبے چوڑے جہیز کی فہرست بات طے ہوتے ہی تھما دی۔ رجو بھی کہتی ہے کون سی اکلوتی ہے کہ نخرے دکھاؤں۔'' پھر ثمینہ خجالت سے ہنستی ہوئی بولیں۔

''بھئی برادری نے تو اِس سے ایک طرح سے کنارہ کر رکھا تھا، کس مصیبت سے تو اس کی جان چھڑوائی تھی اُس رشید بدمعاش سے۔ جیٹھ اور بھائی تو تھوکتے بھی نہیں۔ اب ڈر کے مارے مری جا رہی ہے کہ جو جہیز پورا نہ ہوا تو؟ اگلے تو تیار بیٹھے ہیں کہیں اور کرنے کو۔'' نفیسہ کچھ بولنے ہی والی تھی کہ اتنے میں باتوں میں مگن دو خواتین اٹھیں اور ثمینہ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اجازت چاہی۔ ثمینہ اِدھر متوجہ ہوئیں تو نفیسہ نے گھڑی دیکھی اور ثمینہ کے فارغ ہونے کا انتظار کرتے پرس سے کچھ پیسے نکالے اور کچن میں جا کر برتن دھوتی سلمٰی اور نسرین کو چپکے سے تھما دیے۔

''رجو کدھر ہے؟'' نفیسہ نے پوچھا۔

''وہ اُدھر سامنے پانی کی ٹنکی سے پانی لینے گئی ہے۔ ہماری پانی کی موٹر جل گئی ہے نہ، اِسے بھی آج ہی خراب ہونا تھا'' سلمٰی دھیمے سے بولی۔

''اوہ! اچھا، چلو تم لوگوں نے کافی کام سمیٹ لیا ہے، باقی کام بھی ہو جائے گا۔''

''جی!'' سلمٰی اور نسرین شکر گزاری سے بولیں۔ نفیسہ آہستہ آہستہ چلتی سامنے گئی اور پیٹھ موڑے رجو کی طرف بڑھی۔ ابھی اُسے آواز دینے والی تھی کہ اُسے رجو کے دبے دبے زندگی سے بھرپور قہقہے کی آواز آئی اور پھر وہ دُلار سے بولی۔

''آ جاؤں گی نہ، کہہ جو دیا ہے۔ اچھا! اچھا ٹھیک ہے آج رات کو ہی سہی، بس وعدہ کر کہ تُو میری روبینہ کی شادی کا خرچہ اٹھالے گا۔'' نفیسہ کے ہلکا سا کھانسنے پر اُس نے جھٹ موبائل آف کر دیا اور پلٹی تو چہرے پر ایک لمحے کے لیے ایک رنگ آیا اور لمحے بھر میں ہی گزر گیا۔ نفیسہ نے پرس کھول کر جلدی سے نوٹوں میں کچھ اضافہ کیا اور رجو کے ہاتھوں میں پکڑاتی بولی۔

''کچھ راتوں کی صبح نہیں ہوا کرتی، میں لوگوں سے بات کروں گی کہ وہ شادی کے اخراجات...... اچھا! تم آنا میری طرف۔'' نفیسہ یہ کہہ کر ان ہی قدموں پلٹ گئی۔ رجو کی گھور گھری سوچ میں ڈوبی شربتی آنکھیں تیزی سے اُٹھتے نفیسہ کے پلٹتے قدموں پر تھیں۔

☆☆......☆☆

رحمٰن، رحیم، سدا سائیں

"آپ کا بدلہ مجھ سے چکایا گیا ہے بھائی۔ عبدالغنی نے شادی کر لی ہے۔ ہر لمحہ مر رہی ہوں میں، میں نہیں کر سکتی یہ سب برداشت......" وہ بری طرح روتے ہوئے اُٹھ کر کمرے میں بھاگ گئی۔ ہارون اپنی جگہ پر ہل کر رہ گیا تھا۔ کچھ دیر غیر یقین، ششدر سا کھڑا رہا پھر......

زندگی کے ساتھ سفر کرتے کرداروں کی فسوں گری، ایمان افروز ناول کا دسواں حصہ

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

بیک وقت حال و ماضی کے دریچوں سے جھانکنے والی یہ کہانی دیا سے شروع ہوتی ہے۔ جسے مرتد ہونے کا پچھتاوا، ملال، رنج، دکھ اور کرب کا احساس دل و دماغ کو شل کرتا محسوس ہوتا ہے۔ جو رب کو ناراض کر کے وحشتوں میں مبتلا ہے۔ گندگی اور پلیدگی کا احساس اتنا شدید ہے کہ وہ رب کے حضور سجدہ ریز ہونے میں مانع رکھتا ہے۔ مایوسی اس کی اتنی گہری ہے کہ رب جو رحمٰن و رحیم ہے، جس کا پہلا تعارف ہی یہی ہے۔ اسے یہی بنیادی بات بھلائے ہوئے ہے۔ دیا جو درحقیقت علیزے ہے اور اسلام آباد چاچا کے ہاں میڈیکل کی تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے مکین ہے۔ یوسف کرسچن نوجوان جو اپنی خوبروئی کی بدولت بہت سی لڑکیوں کو استعمال کر چکا ہے۔ علیزے پر بھی جال پھینکتا ہے۔ علیزے جو دیا بن کر اس سے ملتی ہے اور پہلی ملاقات سے ہی یوسف سے متاثر ہو چکی ہے۔

یہ ملاقاتیں چونکہ غلط انداز میں ہو رہی ہیں۔ جبھی غلط نتائج مرتب کرتی ہیں۔ یوسف ہر ملاقات میں ہر حد پار کرتا ہے علیزے اسے روک نہیں پاتی مگر یہ انکشاف اس پر بجلی بن کر گرتا ہے کہ یوسف مسلمان نہیں ہے۔ دنیا میں آنے والے اپنے ناجائز بچے کو باپ کا نام اور شناخت دینے کو علیزے یوسف کے مجبور کرنے پر اپنا مذہب نا چاہتے ہوئے بھی چھوڑ کر عیسائیت اختیار کرتی ہے مگر ضمیر کی بے چینی اسے زیادہ دیر اس پر قائم نہیں رہنے دیتی۔ وہ عیسائیت اور یوسف دونوں کو چھوڑ کر رب کی ناراضگی کے احساس سمیت نیم دیوانی ہوتی سرگرداں ہے۔ سالہا سال گزرنے پر اس کا پھر سے بریرہ سے ٹکراؤ ہوتا ہے جو خیالات کی چکی میں پس کر خود بھی سراپا تغیر کی زد میں ہے۔ علیزے کی واپسی کی خواہاں ہے اور علیزے کی مایوسی اور اس کی بے اعتباری کو اُمید میں بدلنا چاہتی ہے۔ مگر یہ اتنا آسان نہیں۔

علیزے اور بریرہ جن کا تعلق ایک مذہبی گھرانے سے ہے۔ بریرہ علیزے کی بڑی بہن مذہب کے معاملے میں بہت شدت پسندانہ رویہ رکھتی تھی۔ اتنا شدت پسندانہ کہ اس کے اس رویے سے اکثر اس سے وابستہ رشتوں کو تکلیف سے دوچار ہونا پڑا۔ خاص کر علیزے...... جس پر علیزے کی بڑی بہن ہونے کے ناتے پوری اجارہ داری ہے۔ عبدالغنی ان کا بڑا بھائی ہے۔ بریرہ سے بالکل متضاد صرف پرہیزگار نہیں عاجزی و انکساری جس کے ہر انداز سے جھلکتی ہے اور اسیر کرتی ہے۔ درپردہ بریرہ اپنے بھائی سے بھی خائف ہے۔ وہ صحیح معنوں میں پرہیزگاری و نیکی میں خود سے آگے کسی کو دیکھنا پسند نہیں کرتی۔ ہارون اسرار شوبز کی دنیا میں بے حد حسین اور معروف شخصیت کے طور پر جانا جاتا ہے۔ گھر کی دینی محفل میں وہ بریرہ کی پہلے آواز اور پھر حسن کا اسیر ہو کر

اس سے شادی کا خواہاں ہے۔ مگر بریرہ ایک گمراہ انسان سے شادی پر ہرگز آمادہ نہیں۔ ہارون اس کے انکار پر اس سے بات کرنے خود ان کے ہاں آتا ہے اور شوبز تک چھوڑنے پر آمادگی کا اظہار کرتے ہوئے اسے رضامند کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہیں اس موقع پر اس کی پہلی ملاقات عبدالغنی سے ہوتی ہے۔ ہارون اسرار کسی بھی صورت عبدالغنی کو اس رشتہ پر رضامندی پر التجا کرتا ہے۔ عبدالغنی سے تعاون کا یقین پا کر وہ مطمئن ہے۔ اسے عبدالغنی کی باوقار اور شاندار شخصیت بہت بھاتی ہے۔ محلے کا اوباش لڑکا علیزے میں دلچسپی ظاہر کرتا ہے۔ جس کا علم بریرہ کو ہونے پر بریرہ علیزے کی کردار کشی کرتی ہے۔ علیزے اس الزام پر سوائے دل برداشتہ ہونے کے اور کوئی صفائی پیش کرنے سے لاچار ہے۔

اسامہ ہارون اسرار کا چھوٹا بھائی حادثے میں اپنی ٹانگیں گنوا چکا ہے۔ ہارون کی ممی اپنی یتیم بھتیجی سارہ سے زبردستی اس کا نکاح کراتی ہیں۔ جس کے لیے اسامہ ہرگز راضی نہیں اور نہ ہی سارہ کو اس کے حقوق دینے پر آمادہ ہے۔ لیکن دھیرے دھیرے سارہ کی اچھائی کی وجہ سے وہ اس کا اسیر ہونے لگتا ہے اور بالآخر اس کے ساتھ ایک خوشگوار زندگی کا آغاز کرتا ہے۔ لاریب ہارون کی چھوٹی بہن جو بہت لاابالی نظر آتی ہے۔ ہارون کے ہمراہ کالج واپسی پر پہلی بار عبدالغنی کو دیکھ کر اس کی شخصیت کے سحر میں خود کو جکڑا محسوس کرنے لگتی ہے۔ لاریب کی دلچسپی عبدالغنی کی ذات میں بڑھتی ہے۔ جسے بریرہ اپنی منگنی کی تقریب میں خصوصاً محسوس کر جاتی ہے۔ لاریب محبت کی راہوں کی تنہا مسافر ہے۔ عبدالغنی انجان بھی ہے اور لاتعلق بھی۔ لاریب کے لیے یہ بات بہت تکلیف کا باعث ہے کہ وہ کبھی اس کی حوصلہ افزائی نہیں کرے گا۔ علیزے لاریب کی ہم عمر ہے۔ دونوں میں دوستی بھی بہت ہو چکی ہے۔ وہ لاریب کی اپنے بھائی میں دلچسپی کی بھی گواہ ہے مگر وہ لاریب کی طرح ہرگز مایوس نہیں ہے۔

شادی کے موقع پر بریرہ کا رویہ ہارون کے ساتھ بھی بہت لیا دیا اور سرد مہری نہیں حاکمیت آمیز بھی ہے۔

اسے ہارون کے ہر اقدام پر اعتراض ہے۔ وہ اس پر ہر قسم کی پابندیاں عائد کرنے میں خود کو حق بجانب سمجھتی ہے اور اس کی ساتھی اداکارہ سوہا کی ہارون سے بے تکلفی اسے سخت گراں گزرتی ہے۔ ممی کو اپنی بیٹی کا عبدالغنی جیسے نوجوان میں دلچسپی لینا ایک آنکھ نہیں بھاتا جبھی ایک معمولی بات پر وہ لاریب کے سامنے عبدالغنی کی بے حد تحقیر کرتی ہیں۔ اس سے پہلے وہ لاریب کو بھی جتلا چکی ہوتی ہیں کہ وہ ایسے خواب دیکھنا چھوڑ دے۔ لاریب کو عبدالغنی سے روا رکھا جانے والا ممی کا رویہ بغاوت پر ابھارتا ہے۔ وہ تمام لحاظ بھلائے جواب تک اس کے قدموں کو اس راہ پر آگے بڑھنے سے روکے تھے اپنا گھر چھوڑ کر عبدالغنی کے پاس آ کر عبدالغنی سے خود کو اپنانے کی گزارش کرتی ہے۔ عبدالغنی اس کی جذباتی کیفیت کو سمجھتے ہوئے اسے بہلا، سمجھا کر واپس بھیجتا ہے۔ مگر لاریب اس مصالحانہ عمل کو سمجھے بغیر اسے اپنی ریجیکشن اور تذلیل سمجھتے ہوئے شدید ہیجان میں مبتلا ایکسیڈنٹ کروا بیٹھتی ہے۔ ممی اس کی حالت پر حراساں جبکہ لاریب اسی ہسٹریائی کیفیت میں مبتلا عبدالغنی کے حوالے سے اپنی ہر شدت اور شدت پسندانہ بے بسی ان کے سامنے عیاں کر جاتی ہے۔ ممی جو بریرہ کے حاکمانہ رویے اور ناشکرانہ انداز کی بدولت سخت دل برداشتہ ہیں اور اپنی بیٹی کو اس کے بھائی کے حوالے کرنے میں شامل ہیں۔ لاریب کی خوشی کی خاطر اس شادی پر بالآخر آمادہ ہونے پر ایک بار پھر مجبور ہو جاتی ہیں۔ لاریب کی دائمی مسکراہٹ کی چاہ انہیں عبدالغنی کے سامنے ہاتھ پھیلانے پر مجبور کرتی ہے۔

بریرہ لاریب کو ناپسند کرتی ہے۔ جبھی اسے یہ اقدام ہرگز پسند نہیں آتا مگر وہ شادی کو روکنے سے قاصر ہے۔ لاریب عبدالغنی جیسے منکسر المزاج بندے کی قربتوں میں جتنا سنورتی ہے۔ ہارون بریرہ کے حوالے سے اسی قدر اذیتوں کا شکار ہے۔ لیکن اس وقت تنہا ہوتی ہے۔ جب وہ علیزے کے حوالے سے اس پر الزام عائد کرتی ہے۔ صرف ہارون نہیں...... اس سطحی حرکت کے بعد علیزے بھی بریرہ سے نفرت پہ مجبور ہو جاتی ہے۔ وقت کچھ اور آگے سرکتا ہے۔ بریرہ کے دل شکن رویے کے باوجود ہارون اس کی توجہ کا منتظر بار بار اس کی طرف پیش رفت کرتا ہے۔ اس خواہش کے ساتھ کہ وہ بھی لاریب کی طرح سدھار کا متمنی ہے۔ مگر بریرہ جو علیزے کی بے راہ روی کا باعث خود کو گردانتی ہے اور احساسِ جرم میں مبتلا رب کو منانے ہر صورت علیزے کی واپسی کی ملتمس ہے۔ ہارون کے ہر احساس سے گویا بے نیاز ہو چکی ہے۔ ہارون اس بے نیازی کو لاتعلقی اور بے گانگی سے تعبیر کرتے ہوئے مایوسی کی اتھاہ گہرائیوں میں اترتا نا صرف شوبز کی دنیا میں دوبارہ داخل ہوتا ہے بلکہ ضد میں آ کر بریرہ کو جھنجوڑنے کی خاطر سوہا سے شادی بھی کر لیتا ہے۔ علیزے کے حوالے سے بالآخر بریرہ کی دعائیں مستجاب ہوتی ہیں۔ لیکن تب تک ہارون کے حوالے سے گہرا نقصان اس کی جھولی میں آن گرا ہوتا ہے۔

علیزے کی واپسی کے بعد عبدالغنی سمیت اس کے والدین بھی علیزے کے رشتے کے لیے پریشان ہیں۔ علیزے قرآن پاک کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد خود بھی یہ علم بانٹ رہی ہے۔ عبدالہادی اپنے روحانی استاد کے زیرِ تربیت ایک کامل مومن کی شکل میں ان کے سامنے ہے۔ وہ اسے نور کی روشنی پھیلانے کو ہجرت کا حکم دیتے ہیں۔

عبیر ایک بدفطرت عورت کے بطن سے جنم لینے والی باکردار اور باحیا لڑکی ہے۔ جسے اپنی ماں بہن کا طرزِ زندگی بالکل پسند نہیں۔ وہ اپنی ناموس کی حفاظت کرنا چاہتی ہے۔ مگر حالات کے تارِ عنکبوت نے اسے اپنے منحوس پنجوں میں جکڑ لیا ہے۔ کامیاب علاج کے بعد اسامہ پھر سے اپنے پیروں پر چلنے میں کامیاب ہو چکا ہے۔ اسامہ چونکہ فطرتاً کاملیت پسند ہے۔ کسی بھی چیز کا ادھورا پن اسے ہرگز گوارا نہیں مگر اس کے بیٹے میں بتدریج پیدا ہونے والی معذوری کا انکشاف اسے سارہ کے لیے ایک سخت گیر شوہر، متکبر انسان کے طور پر متعارف کراتا ہے۔ وہ ہرگز اس کمی کے ساتھ بچے کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں۔

(اب آپ آگے پڑھیے)

عبدالغنی نے محض سر کو اثبات میں جنبش دی تھی۔ وہ اس کے خدشات کو بنا کہے سمجھ سکتا تھا۔

''آپ اجازت دیں تو میں بات کرلوں اُن سے؟'' عبیر کے سوال پر عبدالغنی نے اچھا خاصا حیران ہو کے اسے دیکھا تھا اور کچھ دیر یونہی دیکھتا رہ گیا۔ اس کے چہرے پر بلا کی جاذبیت اور معصومیت تھی۔ بے ریا، پُرکشش آنکھیں، انتہائی متناسب جسم اور چہرے کے خدوخال بے حد دلکش تھے۔ اس کی رنگت میں قدرتی سُنہرا پن جھلکنے لگا تھا، اِس توجہ اور صفائی ستھرائی کے باعث جو اس سیاہی سے نجات پانے کی صورت خود بخود نکھرنے لگا تھا۔ عبدالغنی کو اس میں تبدیلی تو محسوس ہوئی مگر بے خیالی اور اُدھیڑ بن کی بنا پر یہ تبدیلی درحقیقت تھی کیا وہ نہیں سمجھ پایا تھا۔ اس کی نظروں کا اٹھنا اور پھر ٹھہر جانا۔ عبیر کی پلکوں کو لرزانے اور جھکانے کا باعث بنا تھا۔

''کیا بات کریں گی آپ اُن سے؟'' عبدالغنی کی حیرانی ہنوز تھی۔ عبیر نرمی سے مسکرانے لگی۔

''وہ آپ مجھ پر چھوڑ دیں، لیکن دیکھ لیجیے گا، میں انہیں منالوں گی۔'' اُس کا لہجہ پُریقین تھا۔ عبدالغنی اس کی سادہ لوحی پر مسکرا ہی سکتا تھا۔ اس سے پہلے کہ دونوں میں سے کوئی کچھ بولتا، عبدالغنی کا سیل فون وائبریٹ کرنے لگا تھا۔ عبیر نے اُٹھ کر میز سے فون اُٹھا کر اسے دیا۔ بریرہ کی کال تھی۔

''اسلام وعلیکم! کیا حال ہیں بریرہ؟'' وہ مخصوص نرم آواز میں گویا ہوا تھا۔

''وعلیکم السلام بھائی! الحمد للہ! بھائی آپ اس وقت آسکتے ہیں؟'' بریرہ کا لہجہ گوکہ معتدل اور متوازن تھا۔ مگر عبدالغنی کو پھر بھی کسی گڑبڑ کا احساس جیسے شدت سے ہوا تھا۔ جبھی یکدم سنبھل کر کھڑا ہو گیا۔

''تم کہاں ہو بریرہ؟ سب خیریت ہے؟''

''جی بھائی! گھر پر ہی ہوں میں۔ آپ آجائیے کچھ بات کرنی تھی ضروری۔'' بریرہ کی آواز اسے قدرے بھرائی ہوئی لگی تھی اس بار۔ عبدالغنی نے ایک نظر عبیر کو دیکھا تھا۔

''اوکے، میں آرہا ہوں۔'' کال منقطع کرتے ہوئے اس نے سیل فون واپس عبیر کو تھما دیا۔

''مجھے ضروری کام سے جانا ہوگا عبیر! آپ دروازہ بند کرلیں۔ گھبرائیے گا نہیں۔ میں جلد لوٹ آؤں گا۔ اگر آپ اکیلی رہنا مناسب نہیں سمجھتیں تو آپ کو حافظ صاحب کی طرف بھی چھوڑ سکتا ہوں۔ بلکہ میرا خیال ہے یہی زیادہ مناسب ہے۔'' گہری ہوتی رات پر نگاہ ڈالتا ہوا وہ جیسے فیصلہ کن انداز میں بولا تھا۔ عبیر نے کوئی رد وکد نہیں کی۔ چپ چاپ الماری سے عبایا نکال کر پہننے لگی۔

''آپ خیریت سے تو جا رہے ہیں ناں شاہ؟'' وہ راستے میں تفکر سے ڈولتی آواز میں یہی سوال کر سکتی تھی۔

''ہوں، بریرہ نے بلوایا ہے۔ وجہ تو جا کر معلوم ہوگی۔'' عبدالغنی خود پریشان تھا۔

''آپ واپس صبح لے کر جائیں گے یا آج ہی؟'' عبیر نے حافظ صاحب کے دروازے کو کھٹکھٹانے کے بعد بھیگی آنکھوں سے سوال کیا تھا۔

عبدالغنی نے جواب میں اس کا ہاتھ نرمی سے پکڑ کر دبا دیا تھا۔

''بھروسہ رکھیں عبیر! اللہ نے چاہا تو ہر آزمائش کے باوجود ساتھ نہیں چھوڑوں گا آپ کا۔'' دروازہ کھل گیا تھا۔ عبیر اب کھل کر مسکرائی تھی۔ عبدالغنی نے حافظ صاحب کو سلام کیا اور مختصراً وجہ بتا کر عبیر کو ٹھہرانے کا کہا تھا اور خود بائیک کو کک لگا دی تھی۔

☆......☆......☆

''اتنا سب کچھ ہو گیا اور مجھے کسی نے بتانا بھی گوارا نہیں کیا۔ بہت خوب۔'' ہارون کمرے کے بیچوں بیچ ٹہل رہا تھا اور غصے میں پھنکارتا ہوا بریرہ کو گھورتا تھا۔ وہ مجرم بنی کھڑی تھی۔ خاموش لب بستہ، شام کو جس وقت وہ آیا۔ یہ اتفاق تھا کہ لاریب وہیں لان میں تھی۔ اسے دیکھ کر ہارون ادھر ہی آ گیا تھا۔

''کیسی ہو سویٹی......؟ تمہارا دل کر گیا یہاں آنے کو؟'' وہ اس کا گال سہلا کر مسکرایا تھا۔ لاریب نے جواب میں منہ پھیر لیا تھا۔ اس کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا۔ اس میں وہ سب سے زیادہ مجرم ہی ہارون کو سمجھتی تھی۔

''تمہارا کامریڈ کیسا ہے اور تمہارے صاحب بہادر......؟ ڈیشنگ مین؟'' لاریب کی آنکھیں پانیوں سے بھر گئیں۔ ہارون متوجہ ہی تھا۔ بے ساختہ ٹھٹھک گیا۔

''تم رو رہی ہو؟'' وہ کتنا حیران تھا۔

''ہاں، کیونکہ میری قسمت میں ہمیشہ کا رونا لکھ دیا گیا ہے۔'' وہ درشتی سے بولی تھی۔ ہارون کی صبیح پیشانی پر شکن نمودار ہوئی۔

''واٹ ڈو یو مین، خدانخواستہ کیسی بات کر رہی ہو تم؟'' وہ ناگواری سے بولا تھا۔

''آپ کیوں سمجھیں گے؟ بھائی...... آپ کو ہم سے دلچسپی بھی کیا ہے۔ حالانکہ دیکھا جائے تو آپ کا کیا دھرا ہی بھگت رہے ہیں ہم سب۔'' وہ ضبط کھو کر چیخنے لگی۔ ہارون کو دھچکا لگا تھا۔

''میں سمجھا نہیں، تم کہنا کیا چاہتی ہو؟'' اب کی بار اس کا لہجہ ناگواری سمیٹ لایا تھا۔ لاریب کا گستاخی سے لبریز بدتمیز قسم کا لہجہ بمشکل برداشت کر سکا تھا وہ۔

''آپ کا بدلہ مجھ سے چکایا گیا ہے بھائی۔ عبدالغنی نے شادی کر لی ہے۔ ہر لمحہ مر رہی ہوں میں، میں نہیں کر سکتی یہ سب برداشت......'' وہ بری طرح روتے ہوئے اُٹھ کر کمرے میں بھاگ گئی۔ ہارون اپنی جگہ پر ہل کر رہ گیا تھا۔ کچھ دیر غیر یقین، ششدر سا کھڑا رہا پھر تیز قدموں سے چلتا ہوا اندر آیا تھا۔ بریرہ کمرے میں موجود تھی اور عبداللہ کو کپڑے پہنا رہی تھی۔ اس نے جاتے ہی اسے بازو سے پکڑ کر جارحانہ انداز میں اپنے مقابل گھسیٹ کر کھڑا کر دیا۔

''عبدالغنی نے کب شادی کی اور کیوں؟'' اس کا لہجہ شدید تھا۔ آنکھوں میں لمحوں میں خون اُتر آیا تھا۔ بریرہ کی جان اسی پل جیسے ہوا ہونے لگی۔

''ک...... کتنے دن ہو گئے اور......'' اس کی بات ہارون کے اٹھے ہوئے ہاتھ کی بدولت ادھوری رہ گئی تھی۔

''تم بتا سکتی تھیں مجھے، مگر تم کیوں بتاتیں اپنے بھائی کے کرتوت......'' وہ حلق کے بل چیخا۔ بریرہ گال پر ہاتھ رکھے ساکن کھڑی تھی۔ عبداللہ نے رونا شروع کیا تھا مگر اس میں جرأت نہیں تھی آگے بڑھ کر اسے چپ کرانے کی۔

''اس نے سوچا بھی کیسے میری بہن کو دکھ دینے کا......؟'' وہ اس قابل نہیں تھا کہ لاریب جیسی لڑکی ڈیزرو کرتا مگر اوقات سے بڑھ کر ملنا ہی انسان کو آپے سے باہر کیا کرتا ہے۔ بلاؤ اسے یہاں میں خود بات کروں گا اس سے۔'' وہ قہر بھرے انداز میں

صرف اپنی سُنا کر باہر نکل گیا تھا۔ اس کا رُخ ممی کے کمرے کی جانب تھا۔ چہرہ غصے کی زیادتی سے بے تحاشا سرخ ہو رہا تھا۔ ممی اسے دیکھ کر ہی گہرا سانس بھر کے رہ گئیں۔

''یہاں اتنا کچھ ہو گیا اور آپ نے مجھے بتانا بھی گوارا نہیں کیا۔ ممی آخر آپ مجھے مرا ہوا کیوں سمجھنے لگی ہیں؟'' وہ چھوٹتے ہی برس پڑا تھا۔ ممی نے بے حد ناراض نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

''آپ کیا کر لیتے بیٹے!'' اُن کا سرد انداز خاصا تیکھا اور طنزیہ تھا۔ ہارون کو نشتر بن کر لگا تھا۔ گویا در پردہ وہ بھی اسے ہی قصوروار سمجھ رہی تھیں۔

''میں جو کروں گا وہ ہر کوئی دیکھ لے گا۔ بلوایا ہے میں نے اس طرم خان کو۔ فیصلہ میرے حسبِ منشا ہوگا۔ یا تو وہ اس عورت کو طلاق دے گا۔ ورنہ اپنی بہن کو طلاق کا لیبل سجا کے ساتھ لے کر جائے گا۔ سمجھا کیا ہوا ہے انہوں نے ہمیں۔'' اس کے سرد لہجے میں بھیڑیے کی سی غراہٹیں در آئی تھیں۔ ممی نے بے اختیار کلیجہ تھام لیا۔

''اللہ کے غضب سے ڈرو ہارون بیٹے! اللہ کو بڑے بول پسند نہیں آتے۔'' وہ دہل کر کہہ رہی تھیں۔

''ممی میرے ضبط کی انتہا ہو چکی ہے۔ میں مزید برداشت نہیں کر سکتا۔ یہ دونوں بہن بھائی کمزور سمجھتے ہیں ہمیں۔'' وہ پھر پھنکارا۔ ممی نے جواباً اسے غصے سے گھورا تھا۔

''کیا برداشت کیا ہے تم نے؟ کیسا ضبط! جس کی انتہا ہوئی؟ ہارون جو کام خود کریں اس کے لیے دوسروں پر قدغن کیسے لگائی جا سکتی ہے۔ پھر تمہارے اور عبدالغنی کے عمل میں اور نیتوں میں تو زمین آسمان کا فرق ہے۔'' ان کا لہجہ طنزیہ تھا۔ ساتھ ہی انہوں نے عبدالغنی کے اس فیصلے کی وجوہات بتانا شروع کی تھیں۔ جن کا ہارون پر کچھ خاص اثر نظر نہیں آیا تھا۔

''دنیا میں بس یہی تو ایک نیکی کے علمبردار رہ گئے ہیں۔ اور آخری شریف انسان بھی۔'' اس کے لہجے میں حقارت بھری ہوئی تھی۔ ممی کو بے تحاشا دُکھ نے آن لیا۔ انہیں لگا وہ بہت بدل گیا ہے۔ وہ اتنا گمراہ، اتنا متکبر تو کبھی نہ تھا۔

''میم! عبدالغنی صاحب تشریف لائے ہیں۔'' ملازمہ اطلاع سمیت آئی تھی۔ ہارون کے چہرے پر کچھ اور تلخی بڑھی تھی یہ سُن کر۔

''یہیں بھیج دو۔'' اس نے ملازمہ کو ہاتھ سے جانے کا اشارہ کیا۔

''ہارون! تحمل اور تمیز سے بات کرنا۔ عبدالغنی داماد ہے اس گھر کا۔'' ممی کا انداز تنبیہی تھا۔ ہارون نے محض سر جھٹک دیا۔ اس سے قبل کہ ممی مزید اسے کچھ سمجھاتیں عبدالغنی ہلکے آسمانی کرتا شلوار میں ملبوس وہاں چلا آیا تھا۔ جھکی نظریں، خوبرو شاندار سراپا، باوقار انداز اس نے اپنے مخصوص دھیمے انداز میں سلام کیا تھا۔

''وعلیکم السلام بیٹے! جیتے رہو۔ آؤ بیٹھو۔'' عبدالغنی کے مصافحے کو بڑھے ہاتھ کو ہارون کا نظر انداز کرنا ممی کو شدید قسم کے دکھ اور تاؤ کا شکار کر گیا تھا۔ جبھی بالخصوص نرمی اور سبھاؤ سے کہا تھا۔ عبدالغنی کے اندر غضب کی برداشت اور تحمل تھا۔ وہ بہت خوبی سے ہارون کے رویے کی بدصورتی کو نظر انداز کر گیا۔ ممی کے مدِ مقابل بیٹھتے ہوئے وہ ان سے اُن کی طبیعت کے علاوہ عبدالعلی اور لاریب کا بھی احوال دریافت کرنے لگا تھا، جب ہارون نے پھر اسی برہمی سے اسے جھڑک ڈالا۔

''لاریب کا نام مت لو۔ اگر اتنی پروا ہوتی اس کی تو یہ قدم نہ اٹھایا ہوتا۔'' اس کا جتلاتا ہوا انداز ممی کو بے حد گراں گزرتا تھا۔ جبھی پھر سرزنش کے انداز میں

ٹوکا۔

''ہارون......!'' ہارون نے اپنی جھلستی نگاہوں کو عبدالغنی کے چہرے سے ہٹا کر اُن کی جانب موڑا اور بے حد برافروختہ ہونے لگا تھا۔

''ممی میرا خیال ہے آپ چلی جائیں یہاں سے۔محترم سے میں اکیلا ہی کافی ہوں بات کرنے کو۔'' ممی نے سخت مضطرب ہوکے عبدالغنی کو دیکھا تھا۔ جو بہت خاموش تھا۔اس کے ضبط کی ممی پھر قائل ہوئی تھیں۔کبھی اس کی یہی خوبی انہیں اس کا قائل اور اسیر کرچکی تھی۔

''کسی کی شرافت کو اس کی کمزوری نہیں سمجھنا چاہیے ہارون اسرار۔تم انصاف کے علمبردار نہیں ہو جو فیصلہ کرنے آ گئے ہو۔ایسا فیصلہ عبدالغنی بھی کرسکتا تھا تمہارے متعلق، جب تم نے بے جا اور فضول یہ قدم اٹھایا تھا مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔'' ممی کا ضبط بالآخر رخصت ہوگیا تھا۔انہوں نے ہارون کو ایسی سنائی تھیں جو اسے آگ لگانے کو کافی تھیں۔

''آپ میری توہین کررہی ہیں ممی!'' وہ بری طرح بھڑکا تھا۔

''ایسا نہیں ہے میرے بیٹے! میں نے صرف تمہیں آئینہ دکھایا ہے۔'' ممی کا لہجہ سرد تھا۔

''اپنے پیروں پر تم کلہاڑی مار چکے۔ اب لاریب کو بھی حماقت کرنے دینا چاہتے ہو؟ میں تمہیں اس کی زندگی سے نہیں کھیلنے دوں گی۔'' غصے میں وہ لحاظ مروت بالکل بھول گئی تھیں۔ہارون غصے سے سرخ چہرے کے ساتھ ایک جھٹکے سے اُٹھ کر وہاں سے چلا گیا۔عبدالغنی جو سخت جز بز ہورہا تھا۔گہرا متاسفانہ سانس بھر کے انہیں دیکھنے لگا۔

''میری وجہ سے آپ کو ہارون صاحب سے تلخ کلامی نہیں کرنی چاہیے تھی۔''

''بیٹے ہارون کی وجہ سے میں آل ریڈی بہت شرمندہ ہوں آپ لوگوں سے، مزید اجازت نہیں دے سکتی اسے۔'' ممی کا لہجہ بے حد تھکن زدہ تھا۔ عبدالغنی اس بات کے جواب میں گہرا سانس بھر کے رہ گیا۔لاریب کسی کام سے اپنے دھیان میں اُدھر آئی تھی۔ ادھ کھلے دروازے سے سامنے بیٹھے عبدالغنی پر نگاہ پڑتے ہی دل بہت بے ترتیبی سے دھڑکا۔ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر بیٹھا ہوا وہ بہت ریزروڈ نظر آتا تھا۔گہری مگر بے حد خوبصورت آنکھوں میں غضب کی سنجیدگی نمایاں تھی۔بے تحاشا دھڑک اٹھنے والے دل پر ہاتھ رکھے وہ وہیں سے پلٹ گئی۔ یہ طے تھا کہ اسے اس سے نہیں ملنا تھا۔اتنی ہی خفا تھی اس سے (آپ کی جانب کا میں سارا سفر اختیار کرچکی ہوں۔عبدالغنی! اب آپ کی باری ہے) کمرے میں آکر بے چینی سے ٹہلتی ہوئی وہ کڑھتی رہی۔آنکھیں بار بار بھیگ رہی تھیں۔

(آپ جیسے انصاف پسند، متقی مومن سے یہ توقع تو رکھی ہی نہیں جاسکتی کہ میری خفگی کے پیش نظر اس عورت کو خود سے قریب نہ کیا ہوگا۔عبدالغنی کاش میں اس سے پہلے مری ہوتی جب آپ نے میری جگہ کسی اور کو دی تھی) اسے اتنے دنوں بعد دیکھنے کی ساری خوشی دھری رہ گئی تھی۔

''السلام وعلیکم!'' معاً وہ اس کے سامنے آن ٹھہرا۔ مانوس خوشبو لاریب کے اطراف میں چکرانے لگی۔ لاریب نے چونک کر آنسوؤں سے چھلکتی آنکھوں سے اسے دیکھا۔ جو لہو رنگ ہورہی تھیں۔اتنے دنوں کی دوری تھی۔دل تڑپا تھا اس کے کشادہ سینے میں مدغم ہوجانے کو مگر وہ اسے اپنا عبدالغنی لگا ہی نہیں۔وہ تو بیگانہ تھا۔کسی اور کا، وہ فاصلے پر کھڑی اپنے اندر ٹوٹ کر بکھرتے کانچ کی صدا سنتی رہی اور ضبط آزماتی رہی۔ دل کسی پکے ہوئے پھوڑے کی مانند رسنے لگا تھا۔

''ابھی تک خفا ہو لاریب! آئی مس یُو یار۔'' وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اس پر جھکا تھا۔ آواز میں وارفتگی تھی۔ جذبات سے معمور لہجہ، طلسماتی آنکھوں میں ڈولتا محبت کا عکس۔ وہ یک ٹک اسے دیکھتی رہی۔ اس کی خوبصورت آنکھوں میں اسے اپنے علاوہ بھی کسی کا عکس نظر آنے لگا۔ اتنے بڑے نقصان پر اس کا دل کٹنے لگا۔ کچھ کہے بغیر وہ گھٹ گھٹ کر رونے لگی۔ عبدالغنی نے بے قرار ہوتے اسے بازوؤں میں بھرلیا۔

''ایسا مت کرو لاریب!'' وہ اس کے کان میں سرگوشی کرنے لگا۔

''آپ ایسا مت کریں عبدالغنی! مجھ پر یہ ظلم مت کریں۔'' اس کی سسکیاں ہچکیوں میں ڈھلنے لگی تھیں۔

''اسے چھوڑ دیں عبدالغنی! طلاق دے دیں۔'' وہ اس کے گریبان کو مٹھیوں میں جکڑ کر گزارش کر رہی تھی۔ عبدالغنی کے اندر عجیب سی تھکن اُتر آئی۔

''بیوی ہے وہ میری، نکاح کی ذمہ داری معمولی نہیں ہوتی۔ اس کے حقوق سے کیسے آنکھیں بند کرلوں۔ میں ڈرتا ہوں قیامت کے دن آدھا مفلوج جسم لے کر خدا کے پاس جانے سے۔'' اس کا انداز سمجھاتا قائل کرتا ہوا تھا، جو لاریب کے اندر بے تحاشا دُکھ اتار گیا۔ اس نے پہلے اپنا سر عبدالغنی کے سینے سے اٹھایا تھا۔ پھر دونوں ہاتھوں سے پوری قوت سے اسے پیچھے دھکیل دیا۔

''آپ کو میرا نہیں..... اُس کا احساس ہے۔ جانے میں کیوں کسی دھوکے میں مبتلا رہی، پتا نہیں کیوں؟ حالانکہ مجھے ہمیشہ سے علم تھا کہ محبت آپ نے نہیں میں نے کی ہے آپ سے۔ مجھے یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے تھا کہ مرد کبھی اُس عورت کو اہمیت نہیں دیا کرتا جو خود اس کی خاطر مری جاتی ہو۔ مرد کی ترجیح، اس کی فوقیت اپنا انتخاب ہوتا ہے۔ وہ کبھی نہیں جس نے اسے منتخب کیا ہو۔'' وہ پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ عبدالغنی بے بس سا کھڑا تھا۔

''میں کیا کروں کہ مجھے میرے مقدر نے ہرایا ہے۔ میں آپ کی زندگی میں پہلے آ کر بھی، آپ کے بچوں کی ماں ہو کر بھی اس بعد میں آنے والی عورت سے ہار گئی، اس لیے کہ آپ نے ہرایا ہے مجھے۔''

''لاریب تم......''

''آپ چلے جائیں عبدالغنی! مجھے مزید دکھ نہ دیں۔'' اس نے شدید اور غصیلے انداز میں کہا تھا اور یونہی روتی ہوئی جا کر واش روم میں بند ہوگئی۔ عبدالغنی کے واپسی کو پلٹتے قدموں میں اضمحلال بھی تھا اور گہرا دکھ بھی۔

☆......☆......☆

میں تمہیں پربتوں کی چوٹیوں پر تلاش کرتا رہا
اور تم مجھے ملے بھی تو کہاں؟
گہری اندھی کھائی میں
جہاں تمہیں پانے کی کوشش کرتے ہوئے
میں خود کو بھی کھو بیٹھا
سو میں اور میری تنہائی اب
آپس میں پہلے سے زیادہ تنہا ہو جانے کے خوف سے
آپس میں کوئی بات نہیں کرتے

اُسے یاد تھا اُس نے کہیں پڑھا تھا۔ محبت ایک سحر نہیں ہے بلکہ وہ کالا جادو ہے جس کا توڑ دنیا کے کسی ساحر کے پاس نہیں ہے۔ یا شاید موت کی طرح محبت بھی واپس نہ پلٹنے والے عمل کے طور پر دنیا میں وارد ہوتی ہے۔ وہ بھی اسی ظالم اور سفاک محبت کے وار کا گھائل ہوا تھا۔ ایسا...... ایسا کہ پھر جانبر نہ ہوسکا۔ یہ اس کی قسمت تھی کہ بریرہ کی محبت اسے

سنوار نہ سکی۔ وہ بگاڑ کا باعث بنی اور وہ بگڑتا..... بکھرتا چلا گیا۔ وہ اسے دکھ دیتی تھی تو اسے رونا آتا تھا۔ پھر وقت پلٹ گیا۔ وہ مرہم رکھنے والی بنی تو دکھ دینے کا اختیار اس کے حصے میں آگیا۔ مگر تبدیلی کے اس مرحلے سے پہلے وہ اذیت، کرب اور دکھ کے ساتھ فراموشی کی کن منزلوں سے گزرا تھا یہ کون جانتا تھا اس کے سوا۔

یہ ایسی داستان تھی۔ جس پر وہ نگاہ ڈالنا بھی پسند نہیں کرتا تھا۔ وحشت اور بے مائیگی کا ایسا لا حاصل سفر جس میں حاصل وصول کچھ بھی نہیں تھا۔ اس کی ذات کتنے حصوں میں بٹ گئی تھی۔ وہ بریرہ کو دکھ دیتا تب بھی سکون نہیں ملتا تھا۔ وحشت ساتھ نہیں چھوڑتی تھی۔ جانے کیسی نفسیاتی گرہ پڑی تھی، جو کھلتی ہی نہ تھی۔ لاریب کا دکھ اسے پاگل بنانے کو کافی تھا۔ اسے یہ احساس تک بھول گیا تھا۔ وہ کیا کر رہا ہے۔ اس کی آنکھ کے آنسو کافی تھے اسے سب کچھ فراموش کرانے کو ممی کی مداخلت رکاوٹ ڈال گئی تھی ورنہ وہ پتا نہیں اسی مجنونانہ کیفیت میں مزید کیا حماقتیں کر جاتا۔

یہ جنون اُترا تو بجائے نادم ہونے کے اسے دوسرا احساس مل گیا تھا۔ لاریب کا مطالبہ اسے یاد تھا۔ وہ بضد تھی کہ عبدالغنی اس لڑکی کو طلاق دے۔ یعنی وہ سوکن کا دکھ برداشت کرنے کو تیار نہ تھی۔ وجہ واضح تھی وہ عبدالغنی کو چاہتی تھی اور اسے شیئر کرنے کو آمادہ نہیں تھی۔ یہی سب اس نے بریرہ سے چاہا تھا اسی احساس کی طلب کی تھی مگر مایوسی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اسے اس کا جواب نہیں ملتا تھا۔ اس میں کیا شک تھا کہ وہ بریرہ سے آج بھی محبت کرتا تھا۔ اس میں بھی شک نہیں تھا کہ وہ آج بھی بریرہ کی توجہ کا متقاضی تھا۔ کوشش میں ناکامی اور شکست ہی اسے پاگل بناتی تھی۔ آخر وہ اتنی انوکھی کیوں تھی۔ اتنی مضبوط کیوں تھی۔ کس مٹی سے بنی تھی۔ وہ عام کیوں نہ تھی۔ یا پھر...... یا پھر اسے واقعی ہارون کی پروانہ تھی۔ اس سے محبت نہ تھی۔ اس کی لہو رنگ آنکھیں آنسو لٹانے لگیں۔

وہ دل نواز ہے لیکن نظر شناس نہیں
میرا علاج مرے چارہ گر کے پاس نہیں
تڑپ رہے ہیں زباں پر کئی سوال مگر
میرے لیے کوئی شایانِ التماس نہیں
تیرے جلو میں بھی دل کانپ کانپ اٹھتا ہے
میرے مزاج کو آسودگی بھی راس نہیں

کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ جو اُلجھنیں تمہارے دماغ میں آتی ہیں انہیں دور کیا کرو۔ جو شخص شکوک و شبہات میں مبتلا رہتا ہے۔ اس کے لیے علم کے دروازے نہیں کھلتے۔'' اس کے معاملے میں بالکل ایسا ہی تھا۔ وہ صرف سوچتا تھا، قیاس کرتا تھا۔ بدگمانی پالتا تھا۔ وضاحت طلب نہیں کرتا تھا۔ شک کرتا تھا، یقین باندھ لیتا تھا۔ دکھ محسوس کرتا تھا، کڑھتا تھا اور خاموش رہتا تھا۔ یہ ذہنی کڑھن ہی تھی، جو بیماری کی صورت ظاہر ہوئی تھی۔ اس کا فیور بگڑتا جا رہا تھا۔ بستر اس کی جان چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھا۔ ایسے میں بریرہ کی بے چینی اور اضطراب دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ ہر پل، ہر لمحہ اس کی پٹی سے لگی تیمارداری میں مصروف نظر آتی۔ مگر گریزاں، جھجکتی ہوئی، خائف سی۔

''دوا لے لیں ہارون!'' وہ اسے پکار رہی تھی۔

اس نے نیم وا آنکھوں سے اسے دیکھا۔ گلابی دوپٹے کے ہالے میں اس کا چہرہ بھی گلابی ہی لگ رہا تھا۔ صبح نوخیز جیسا شفاف اور اُجلی کرن جیسا نکھرا ہوا۔ وہ اسے بے مقصد دیکھے گیا۔

''آپ کی دوا کا ٹائم ہے۔'' وہ پھر بولی تھی۔

ہارون اُٹھ کر نیم دراز ہوگیا۔ بریرہ نے جلدی سے اس کی کمر پر تکیے لگائے تھے۔

''عبداللہ کہا ہے؟'' وہ سیل فون اُٹھا رہا تھا کہ اسی پل اس پر کال آنے لگی تھی کسی کی۔

''سوہا کالنگ۔'' بریرہ نے ایک نظر اسکرین پر ڈالی تھی۔

''تم جاؤ، دروازہ بند کر جانا۔'' ہارون نے بے اعتنائی سے اس کا ہاتھ ہٹا دیا۔ بریرہ کے چہرے پر خفت کا رنگ آ کر گزر گیا تھا۔

''بی بی جی عبداللہ بابا گر گئے ہیں۔ سر پر چوٹ لگی ہے۔'' ملازمہ عبداللہ کو اٹھائے اندر آئی تھی۔ بریرہ نے لپک کر اسے پکڑا۔ عبداللہ گلا پھاڑ کر رو رہا تھا۔ ماتھے پر ہلکا زخم بھی تھا۔ جس سے خون رِس رہا تھا۔

''بس بس بیٹے! کچھ نہیں ہوا۔ ابھی ٹھیک ہو جاتا ہے۔''

''بات سنو!'' بریرہ اس کی بے آرامی کے خیال سے عبداللہ کو لیے باہر جا رہی تھی جب ہارون نے پکار لیا تھا۔ بریرہ نے قدرے چونک کر گردن موڑی۔ سیل فون کان سے ہٹائے، مٹھی میں دبوچے وہ عبداللہ کی جانب دیکھ رہا تھا۔

''جی!'' بریرہ نزدیک آئی تھی انداز سوالیہ تھا۔

''میڈیکل باکس لے کر آؤ۔ پاپا کے پاس آؤ بیٹے!'' بریرہ کو کام سے لگا کر اس نے عبداللہ کو اس سے لینا چاہا تھا۔ عبداللہ بریرہ سے چپک گیا۔ گو کہ وہ اب قدرے ہارون سے مانوس ہو چکا تھا مگر اس وقت ماں کے پاس سے کسی اور کے پاس جانے پر آمادہ نہیں لگ رہا تھا۔

''آپ پریشان نہ ہوں، معمولی زخم ہے۔ میں خود دوا لگا دیتی ہوں۔'' بریرہ نے تسلی دی تھی۔ ہارون نے جواباً سلگتی نظروں سے اسے دیکھتے ہنکارا ابھرا۔

''کوتاہ نگاہی ہے تمہاری، ورنہ کوئی بھی زخم معمولی نہیں ہوتا۔ لاپروائی اسے ناسور بنا دیا کرتی ہے مگر تم کیا جانو۔ ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنا کر بہت مطمئن رہنے والی عورت ہو تم۔'' اس کی پھنکار میں بھی جیسے کوئی بے بسی کا عنصر تھا۔ بریرہ کا چہرہ یکلخت بے تحاشا پھیکا پڑ گیا۔ روح میں دور تک اس کے لہجے کی کڑواہٹ کا زہر پھیلا تھا۔

''آپ مجھے معاف کر دیں ہارون! مجھے اعتراف ہے کہ میں......''

''عبداللہ کو لے جاؤ، دوا لگاؤ۔ خیال رکھا کرو اس کا، ایک بات یاد رکھنا، اگر اس کے کسی معاملے میں تم نے وہی بے پروائی برتی تو کبھی معاف نہیں کروں گا تمہیں۔'' انگلی اٹھا کر وہ تنبیہی انداز میں گویا تھا۔ بریرہ نم آنکھوں سے اسے دیکھتی پلٹ کر چلی گئی۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد جب عبداللہ کو سُلا کر لوٹی تب بھی ہارون فون پر مصروف تھا۔

''کچھ کھائیں گے آپ؟'' ہارون نے نگاہ اٹھائے بغیر سر کو نفی میں جنبش دی تھی۔ پھر ہاتھ کے اشارے سے اسے اپنے پہلو میں آنے کا کہا تھا۔ بریرہ نے قدرے چونک کر اس کے چہرے کو دیکھا۔ جو سپاٹ تھا۔

اسے وہ رات نہیں بھولی تھی جب اس طرح پاس بلا کر وہ حواس کھو کر وحشت کا انوکھا باب رقم کر چکا تھا۔ اس کی زندگی کی کتاب پر، اللہ جانے وہ غیض و غضب پھر پھوٹ پڑتا۔ اس کی ٹانگیں آگے بڑھتے ہوئے باقاعدہ لرز رہی تھیں اور ہاتھ بالکل سرد ہوتے جا رہے تھے۔

''جج...... جی۔'' بولی تو آواز بھی کانپ رہی تھی۔ ہارون نے فون کی اسکرین سے نگاہ ہٹا کر اس کا چہرہ دیکھا تھا۔ کچھ دیر یونہی دیکھتا رہا۔

''ڈر رہی ہو؟'' عجیب سوال تھا۔ بریرہ نے حلق مزید خشک محسوس کیا۔

''یعنی تم میری محبت تو کبھی تسلیم کر ہی نہیں

سکیں۔ میری وجاہت کی بھی انکاری ہو؟'' ہارون نے اپنا بھاری ہاتھ بڑھا کر اس کا گال سہلایا تھا۔ بریرہ نے پوری جان لڑا دی تھی مسکرانے کی کوشش میں۔

''آپ یہ کیوں سمجھتے ہیں ہارون کہ صورتِ حال ہمیشہ ایک ہی رہے گی۔ وقت کے ساتھ حالات بھی بدل جاتے ہیں۔ غلطی کرنے والا ضروری نہیں ہمیشہ غلطی پر قائم رہے۔ یہ تو کبھی نہیں تھا کہ میں نے آپ سے نفرت کی تھی، محبت تو تھی۔ ہاں پوزیسو تھی تب، پھر خود کو چینج کر لیا تو......''

''ہوں...... یہ چینج ذات کی تبدیلی تک تھا یا سوچ میں بھی در آیا تھا؟ نفرت اگر پہلے نہیں تھی تو بعد میں پیدا ہو گئی تھی؟'' ہارون نے اس کی بات قطع کر دی۔ انداز سرد مہری لیے، تیکھا پن سموئے تھا۔ بریرہ نے بہت سکون سے سنا تھا۔ اسی سکون سے اسے ایسے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں اپنی آنکھیں ڈال دیں۔

''محبت میں اضافہ بھی ہو سکتا تھا ہارون! اور ایسا ہی ہوا ہے۔ مگر میں آپ کو کیسے یقین دلاؤں کہ محبت کی پیمائش کا ابھی تلک کوئی پیمانہ ایجاد نہیں کر سکی سائنس۔'' اس کا مدھم لہجہ خوشبو جیسا تھا۔ ہارون نے گہرا سانس بھرا اور سر کو تکیے پر ڈال دیا۔ نظریں البتہ اس پر ہی فوکس تھیں۔

''تو ٹھیک ہے، میرے ساتھ چلو میرے گھر، چلو گی؟'' اس کا انداز کریدتا ہوا تھا۔ اندر کا بھید پانے والا، بریرہ نے بغیر کسی رد و کد کے سر کو اثبات میں ہلا دیا۔

''مجھے ہرگز اعتراض نہیں ہے۔ میرے لیے آپ کی خوشی اور حکم اہم ہے۔''

اور ہارون کے پاس جیسے کہنے کو کچھ باقی نہیں رہا تھا۔ کروٹ بدل کر اس نے منہ تکیے میں دبا لیا۔ ایک بار پھر وہ ناکام رہا تھا اس لڑکی کا غرور توڑنے میں۔ وہ ایک بار پھر اسے پچھاڑنے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ اسے اس بات سے بھی فرق نہیں پڑتا تھا کہ وہ اس کی بیوی کے ساتھ رہے گی۔ اس کے خیال میں وہ جھوٹی تھی۔ وہ ہرگز بھی اس سے محبت نہیں کرتی تھی۔ اگر محبت کرتی ہوتی تو لاریب کی طرح طوفان نہ بھی اٹھاتی، کم از کم احتجاج تو کرتی۔ وہ واقعی جھوٹی تھی۔ وہ واقعی منافق تھی۔

☆......☆......☆

تمنا کے بھی سلسلے عجیب ہیں
محبت در محبت دائرے ہیں
رابطے ہیں
کسی الہام کی صورت اُترتی روشنی ہے
بے خودی ہے
تمنا ایک کچا راستہ
تم سے میرا پہلا اور آخری واسطہ
روایت در روایت بے بسی ہے
بے کلی ہے
جو مجھے تم تک لے جائے وہ چال
محبت نے چلی ہے

اس نے گہرا سانس بھرا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے شکست تسلیم کر لی تھی۔ اسے بالآخر شکست تسلیم کرنی ہی تھی۔ محبت جب اپنا آپ منوانے پر آ جائے تو پھر کوئی رکاوٹ اس کا راستہ نہیں روک سکتی۔ وہ اس احساس کا کیا کرتی جو عبدالہادی کے حوالے سے دل میں اٹھتے تھے۔ وہ اس گداز کو کیسے نوچ دیتی جو عبدالہادی کے لیے پیدا ہو چکا تھا دل میں۔ محبت اور نفرت محض احساس کی تبدیلی کا جذبہ ہے ورنہ دونوں کا قیام ایک ہی دل میں ہوتا ہے۔ پہلا احساس محبت تھا۔ جو گناہ اور غلطی کے احساس کے باعث تبدیل ہوا اور نفرت کا روپ دھار گیا۔ یہی

احساس پھر سے کسی سچائی کو پا کر اپنا رنگ اور پختگی کھونے لگا تھا۔

وہ اسے سوچتی...... وہ اسے دیکھتی اور جیسے خود سے ہارنے لگتی۔ کیا تھا وہ؟ سچ واقعی اپنا آپ منوالیا کرتا ہے۔ وہ اس کا ایک ایک انداز جانچتی۔ وہ کتنی نرمی سے بولتا تھا۔ وہ اتنا متحمل مزاج تھا۔ کتنی دھیمی طبیعت ہوچکی تھی اس کی کہ ماضی کا کوئی عکس ڈھونڈے سے بھی نہیں مل پاتا تھا۔ وہ واقعی بدل گیا تھا۔ پھر نفرت کیسے قائم رہتی۔ جب نفرت نہیں رہی تو محبت سے کیسے بچتی۔ اسے لگتا تھا اس کا پیر مکڑی کے جالے پر آ گیا ہے اور وہ دھنستی جارہی ہے۔ جکڑتی جارہی ہے۔ اس نے اب بچنے کی کوشش نہیں کی۔ اس نے سنبھلنے کی کوشش ترک کردی۔ ایک محبت وہ تھی جو اس نے خود کی تھی۔ جو سراسر نافرمانی تھی۔ بے راہ روی تھی۔ حدوں کو پھلانگنا تھا۔ ہوس تھی۔

ایک انتخاب اس نے کیا تھا۔ جو غلط تھا، ناجائز تھا، بُرا تھا، پھر ایک انتخاب اللہ نے کیا تھا۔ جو صحیح تھا۔ برحق تھا۔

یہ محبت اسے رب نے دی تھی۔ جس میں کوئی نقصان نہیں تھا، کچھ غلط نہیں تھا، کوئی گناہ یا جرم نہیں تھا۔

اس نے یہ سمجھا تھا تو جیسے بے قراری قرار پاگئی۔ سارے ڈر خوف جاتے رہے۔ اب وہ اسے دیکھتی تھی تو کچھ بھی ملمع نہیں لگتا تھا۔ وہ اندر باہر سے ایک تھا۔ شفاف آئینے کی مانند، بنا کسی خوشبو کے معطر وجود، خط ہوئی سیاہ ریشمی داڑھی، آنکھوں میں سرخ ڈورے، لہجے میں موم جیسی نرمی، کشادہ صبیح روشن پیشانی، جس پر محراب کا نشان واضح تھا۔

نور کے ہالے میں مقید سفید چہرہ، نکھرے لباس میں گویا انسانی روپ میں فرشتہ۔

رات کا دوسرا پہر تھا۔ پوری کائنات گھور اندھیاروں میں ڈوبی ہوئی تھی۔ طویل قامت درخت پھول پودے، ہر شے غیر معمولی طور پر سنسنان اور گھمبیر چپ کی زد میں ڈوبی تھی۔ اور وہ اس کو پوری جزئیات سے سوچ رہی تھی۔ پہلی بار مسکراتے ہوئے، مکمل خوشی کے ساتھ۔ کتنے دن ہوئے تھے اس نے ڈھنگ سے دیکھا بھی نہیں تھا اسے۔ ممی کی وفات نے جہاں عبدالہادی کو بہت غمگین کیا ہوا تھا۔ وہ اسی قدر مصروف بھی تھا۔ پُرسے کے لیے آنے والے لوگوں سے ملاقات اور وسیع جائیداد کے قانونی بکھیڑے۔

علیزے نے چند مرتبہ دور دور سے ہی اسے دیکھا تھا۔ ملازمہ سے اسے معلوم بھی ہوا تھا۔ اس کی طبیعت بھی بہتر نہیں تھی۔ علیزے چاہنے کے باوجود اس کی طبیعت پوچھنے نہیں جاسکی۔ ایک غیر محسوس سی جھجک اور حجاب، اس کی راہ میں حائل ہوجاتا تھا۔ مگر رات ہی وہ یہ فیصلہ کرچکی تھی اس سے ملنے کا۔ اسے درحقیقت عبدالہادی پر غصہ تھا۔ اتنے دن سے پلٹ کر خبر نہ لینے پر...... یہاں تک کہ وہ کمرے میں کبھی نہیں آیا تھا۔ ان سب باتوں کا جو بھی جواز تھا مگر یہ حقیقت تھی کہ وہ بہت ہرٹ ہورہی تھی۔

''آپ! میم کیوں زحمت کی؟ جو بھی چاہیے تھا حکم کیا ہوتا، حاضر کردیا جاتا۔'' علیزے خود کچن میں آ گئی تھی۔ جہاں ماہر شیف ناشتے میں مصروف تھی، اپنے مددگاروں کے ساتھ۔ علیزے کو روبرو پا کے وہ سٹپٹا گئی تھی، کسی کوتاہی کے خیال سے۔

''عبدالہادی کہاں ہیں؟''

''سر اپنے روم میں ہیں میم!'' شیف نے حیرانی دبا کر جواب دیا تھا۔

''میری وہاں تک راہنمائی کردیں اور ہاں...... ناشتا وہیں پہنچا دیجیے گا، تھینکس۔'' اس کا لہجہ نرم تھا۔ شیف کے اشارے پر ایک ملازمہ اس کے ہمراہ ہولی

تھی۔ مختلف راہداریوں سے ہوتے وہ بالآخر ایک براؤن منقش دروازے کے آگے جا کر رک گئی۔

''یہ سر کا روم ہے میم! مجھے اجازت؟'' علیزے نے سر ہلا دیا تھا۔ ملازمہ کے جانے کے بعد اس نے غیر شعوری استحقاق آمیز انداز میں ناب گھما کر بغیر دستک کے دروازہ کھولا تھا۔

''میں پہلے سے بہت بہتر ہوں! آپ اتنی فکر نہ کریں پلیز!'' اس نے عبدالہادی کی سنجیدہ آواز سنی تھی۔ وہ اسے سامنے بستر پر دراز نظر آیا۔ بال بے ترتیب ہو کر پیشانی پر بکھرے ہوئے تھے اور آنکھوں میں غیر معمولی سرخی نمایاں تھی۔ دروازہ کھلنے کی آواز پر دونوں متوجہ ہوئے تھے۔ علیزے کی نگاہ سنہرے بالوں والی بے تحاشا حسین لڑکی پر ٹھہر گئی۔ جو عبدالہادی کے بیڈ سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑی نظر آ رہی تھی۔

''آ جائیں علیزے!'' عبدالہادی اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کا انداز خیر مقدمی تھا۔ علیزے کے اندر عجیب سا غبار پھیلنے لگا۔ وہ سارے نرم گرم جذبے جیسے بھاپ بن کر اُڑ رہے تھے۔

''یہ کون ہے؟'' لزا کی نظریں اس کے چہرے پر جم گئی تھیں۔

''یہی بات اگر میں تم سے پوچھوں؟ تم کون ہو؟ اور یہاں ان کے کمرے میں کیا کر رہی ہو؟'' علیزے یکدم بھڑکی تھی۔ اتنا کہ عبدالہادی بھی حیران پریشان رہ گیا۔ لزا کے وجود کو بھی جھٹکا لگا تھا۔ اس کی استعجابی نظریں ہراسگی کے عالم میں عبدالہادی کی جانب اٹھیں۔

''یوسف!''

''دس از علیزے مائی وائف، اور علیزے یہ لزا ہے میری فرسٹ کزن۔'' لزا کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا۔ کچھ کہے بغیر وہ ایک جھٹکے سے پلٹی اور تقریباً دوڑتی ہوئی باہر نکل گئی۔ علیزے کی نگاہوں نے دروازے تک اس کا پیچھا کیا تھا پھر واپس عبدالہادی پر آن ٹھہریں۔

''آپ کی طبیعت کا پوچھنے آئی تھی۔ اندازہ نہیں تھا آپ کی مصروفیات اس قسم کی ہوں گی۔'' اس کا لہجہ بے حد سرد تھا۔ عبدالہادی نے گہرا سانس بھرا اور واپس تکیے پر سر ڈال دیا۔

''آپ کا شکریہ، لزا بھی میری خیریت معلوم کرنے آئی تھی۔ رات ہی پہنچی ہے وہ یہاں۔'' عبدالہادی کا انداز نارمل تھا۔ اس کے باوجود علیزے کو ان دیکھی آگ جھلسانے لگی۔

''بند کمرے میں...... آپ کے سر پر چڑھ کے وہ آپ کی خیریت دریافت کر رہی تھی؟'' وہ چپ نہیں رہ سکی۔ عبدالہادی نے ترچھی نظروں سے اس کا سرخ پڑتا چہرہ دیکھا۔

''وہ براڈ مائنڈڈ ہے۔ ان نزاکتوں کو نہیں سمجھتیں۔'' عبدالہادی کا انداز سمجھانے والا تھا۔ وہ اور چڑی۔

''آپ تو اب براڈ مائنڈڈ نہیں ہیں۔ ان نزاکتوں کو تو سمجھتے ہیں۔''

''آپ اگر کچھ دیر نہ پہنچتیں تو میں اُٹھ کر ان سے یہی کہنے والا تھا کہ باہر لاؤنج میں چل کر بات کرتے ہیں۔'' عبدالہادی نے عاجز ہو کر وضاحت دی۔ علیزے تمسخرانہ انداز میں ہنس پڑی۔

''بہت خوب، میں نے جتلا دیا تو آپ نے کہہ دیا ورنہ......''

''علیزے......! پلیز! کیوں شک کر رہی ہیں مجھ پر؟'' عبدالہادی جھلا اٹھا تھا۔

''تو کیا اُس پر کروں؟'' وہ اسے گھورنے لگی۔ عبدالہادی نے سرد آہ بھری۔

''کسی پر بھی نہ کریں۔ بدگمانی بھی گناہ ہے۔''

''اوہ! میں تو بھول ہی گئی تھی۔ اعلیٰ حضرت بہت نیک ہستی ہیں۔'' وہ جھنجلا گئی تھی۔ عبدالہادی اسے دیکھ کر رہ گیا۔ تب ہی دستک ہونے لگی۔ عبدالہادی اِدھر متوجہ ہوگیا تھا۔ ملازمہ کو ناشتے کی ٹرالی گھسیٹ کر لاتے دیکھ کر حیران ہوا۔

''یہ کس لیے؟ میں نے تو ناشتا نہیں منگوایا تھا۔''

''سر......! میم نے آرڈر کیا تھا۔ یہ آپ کے ساتھ بریک فاسٹ کا ارادہ رکھتی ہیں۔'' ملازمہ کی اطلاع پر عبدالہادی نے اسی حیرانی و غیر یقینی کے ساتھ علیزے کو دیکھا تھا۔ جو ہونٹ بھینچے کسی قدر خفا موڈ کے ساتھ کھڑی نظر آئی۔

''میرا خیال ہے ان کا ارادہ خاتون کے ساتھ کھانے کا تھا۔ آپ ایسا کریں محترمہ کو یہاں بھیج دیں۔'' علیزے اسی خفا انداز میں ملازمہ سے مخاطب ہوئی تھی اور ایک جھٹکے سے جانے کو پلٹی تھی کہ عبدالہادی نے سرعت سے حرکت میں آتے اس کا ہاتھ گرفت میں لے لیا۔ ملازمہ اس کا اشارہ پاکر جا چکی تھی۔

''مجھے ڈھنگ سے خوش تو ہولینے دو پیاری لڑکی!'' وہ اُٹھ کر خود اس کے مقابل آ گیا تھا۔ علیزے نے نظریں چار نہیں کیں۔

''آج ممی کی روح یقیناً بہت خوش ہوگی۔ ان کی نک چڑھی بہو نے ان کے بیچارے بیٹے کو ذرا سی لفٹ کرائی ہے۔'' وہ مسکرا رہا تھا۔ علیزے کی دھڑکنوں میں اس کی اتنی توجہ پاکر ہلچل سی مچنے لگی۔ اسے اپنی یہ کیفیت پہلی بار اچھی لگی تھی۔

''مم...... میں طبیعت پوچھنے آئی تھی۔'' گلابی پڑتے چہرے کے ساتھ نظریں چراتی وہ بہت پیاری لگی تھی۔ عبدالہادی یک ٹک اسے دیکھے گیا۔

''بس......؟ ملازمہ تو کچھ اور بتا رہی تھی۔'' وہ گہری مسکان کے ساتھ بولا۔

''ہاں تو ناشتا کرنے میں کیا حرج ہے؟ پتا نہیں اتنے دنوں سے ڈھنگ سے کچھ کھایا بھی ہے یا نہیں۔ ممی کی ٹینشن کیوں لیتے ہیں۔ وہ مسلمان ہوچکی تھیں۔ اللہ نے اُن کے سابقہ تمام گناہ معاف کردیے ہوں گے۔ وہ خوش قسمت تھیں، نجات پاگئیں۔'' علیزے کا لہجہ نرم اور محبت سے لبریز تھا۔ عبدالہادی کی آنکھیں نمی کے احساس سے چمکنے لگیں۔ کچھ کہے بغیر وہ ہونٹ بھیچے سر جھکائے بیٹھا رہا تھا۔

''طبیعت کب سے ٹھیک نہیں؟ ڈاکٹر کو دکھایا؟'' علیزے نے ہاتھ بڑھا کر اس کی پیشانی چھوئی تھی۔ عبدالہادی نے پھر چونک کر اسے دیکھا تھا۔ وہ اس تبدیلی پر حیران تھا اور یہ فطری بات تھی۔

''فیور تو ابھی بھی ہے۔ دوا لے رہے ہیں؟'' وہ اسے دیکھنے لگی۔ عبدالہادی نے جواب نہیں دیا۔

''کیا ہوا؟ بولیں؟'' وہ چڑی۔

''یہ خواب ہے لیزے؟'' اس کا لہجہ مدھم تھا۔ علیزے کے چہرے پر یکدم سرخی چھا گئی۔ پلکیں جھک گئی تھیں۔ کچھ دیر ہونٹ کپکپاتی رہی تھی۔ اگر حجاب مانع نہ ہوتا تو لازمی اپنی کیفیت آشکار کردیتی۔

''میں پتھر نہیں ہوں، عام سی انسان ہوں۔ آپ مجھے شاید بہت ظالم سمجھتے ہیں۔ آپ بیمار ہیں۔ صدمے میں ہیں۔ اتنی سی توجہ یا احساس تو فرض بنتا ہے میرا۔ بلکہ میں تو انتظار کرتی تھی آپ کا، آپ آئے نہیں۔'' نظریں اٹھائے بغیر وہ بہت مدہم انداز میں گویا تھی۔ عبدالہادی مبہوت رہ گیا۔

''مجھے اندازہ ہی نہیں تھا اپنی اس خوش بختی کا، اب تو دل چاہ رہا ہے ہمیشہ بیمار رہوں۔'' وہ شرارت سے مسکرایا تھا۔ علیزے اس شرارت پر جھینپ کر سرخ پڑنے لگی۔

''اچھا فضول نہ بولیں۔ ناشتا کریں، ٹھنڈا ہورہا ہے۔''

''اپنے ہاتھ سے کراؤ، اب تو غالباً صلح ہوگئی ہے

ہماری۔'' عبدالہادی نے برجستہ فقرہ کسا۔ علیزے پھر جھینپ گئی۔

''اتنا پھیلنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آرام سے کھائیں کچھ، پھر دوا لیجیے گا۔'' علیزے نے اٹھتے ہوئے ٹرالی اپنی جانب گھسیٹ لی اور اس کے لیے چائے مگ میں نکالنے لگی۔ عبدالہادی نے کاندھے اچکائے تھے۔ اور ہاتھ دھونے کے ارادے سے واش روم کی جانب بڑھ گیا۔ تولیے سے ہاتھ صاف کرتے کچھ خیال آنے پر اس نے انٹرکام اُٹھا کر کچن میں رابطہ کیا تھا۔

''لزا نے ناشتا کرلیا؟'' علیزے نے سلائس پر مکھن لگاتے ہاتھ روک کر ناگوار تاثرات کے ساتھ اسے دیکھا تھا۔

''آپ اُن کی پسند کے مطابق ناشتا اُن کے کمرے میں پہنچادیں۔ ٹھیک ہے؟''

ریسیور رکھ کر وہ واپس اپنی جگہ پر آیا تو علیزے ہاتھ میں سلائس لیے گم صم بیٹھی تھی۔ عبدالہادی نے اس کے انداز کو تحقیر سے دیکھا۔ پھر اس کی آنکھوں کے آگے ہاتھ لہرایا تھا۔ وہ چونک سی گئی۔ اور خالی نظروں سے اسے تکنے لگی۔

''کہاں گم ہیں؟''

''بہت خیال نہیں ہے آپ کو اس کا؟'' وہ ناگواری دبا نہیں سکی۔ عبدالہادی سادگی سے کاندھے اُچکا گیا۔

''ہونا چاہیے، وہ مہمان ہے یہاں۔''

''مہمان کچھ غیر معمولی حسین ہو تو اس کا خیال بھی غیر معمولی ہوجاتا ہے غالباً۔'' اس کا لہجہ طنزیہ اور چبھتا ہوا تھا۔ عبدالہادی اپنی جگہ پر بل کر رہ گیا۔ ہاتھ میں پکڑا ہوا چائے کا مگ اس نے واپس رکھ دیا تھا۔ چہرے پر اتنی سنجیدگی، ایسی خوفناک گھمبیرتا در آئی تھی کہ ایک لمحے کو علیزے بھی دبک سی گئی۔

''آپ ناشتا کرلیں تو اپنے کمرے میں چلی جائیے گا۔ یہاں مجھ سے ملنے کچھ دیر میں میرا لائر آنے والا ہے۔'' وارڈ روب کھول کر اپنے کپڑے نکالتا ہوا وہ یکسر بدلے ہوئے انداز میں کہہ رہا تھا۔ علیزے کو بے تحاشا سبکی کے احساس نے گھیر لیا۔ کچھ کہے بغیر وہ سرخ چہرے کے ساتھ سب کچھ چھوڑ کر اٹھی تھی اور تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔ عبدالہادی ہونٹ بھینچے کھڑا رہا تھا۔

☆......☆......☆

وہ ایک شخص جس سے شکایتیں تھیں بہت
بہت عزیز تھا اس سے محبتیں تھیں بہت
وہ یوں ملا کہ جیسے کبھی ملا ہی نہ تھا
ہماری ذات پر اس کی عنایتیں تھیں بہت
وہ جب ملا تو دل میں کوئی طلب ہی نہ تھی
بچھڑ گیا تو ہماری ضرورتیں تھیں بہت

اس کا دل جیسے کوئی مٹھی میں لے کر بھینچے جاتا تھا۔ کسی طور قرار نہ تھا۔ عبدالغنی آیا تھا ہارون کی عیادت کے واسطے، عبدالعلی سے بھی ملا۔ بس اس سے ملنا ضروری خیال نہ کیا۔ کوئی آگ تھی جو اس کے اندر بھڑک اٹھی تھی۔ رو رو کر جو حالت خراب کی وہ الگ۔ یعنی نوبت اب یہاں تک آ پہنچی تھی۔ بیوی کی کمی نہیں تھی بس۔ شکایت کس سے کرتی بھلا؟ ممی اُلٹا اسے سمجھانے، نصیحتیں کرنے بیٹھ جاتی تھیں۔ اسے اپنا آپ کسی تنکے سے بھی حقیر اور بے مایا لگ رہا تھا۔ عبدالغنی سے یہ توقع کہاں تھی۔

کم مائیگی کا احساس تو ایک اَن دیکھی اذیت ہے۔ جو جیتے جاگتے انسانی ذہن کو مسلسل اضطراب میں لے جاتا ہے۔ اس کے اعصاب کو مضمحل کردیتا ہے۔ محض اس تاریک احساس کی بدولت انسان اپنی صلاحیتوں کو بھی پہچاننے سے قاصر ہوجاتا ہے۔ اس احساس سمیت بے بسی میں سسکتا رہتا ہے۔ ایسے کہ

فطرت بھی اُداس ہو جائے۔ وہ اس احساس سے گھلتی جا رہی تھی۔ کتنے دن ہوئے وہ نیند کی گولی لیے بغیر سو نہیں سکتی تھی۔ اتنا رونے کے باوجود اس کے اندر کا غم نہیں دھلا تھا۔ اس وقت بھی سارہ نے اسے اُداس، ملول کھڑکی میں کھڑے دیکھا تو ٹہلنا موقوف کر کے اس کے پاس آ گئی۔ اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر پیار سے اسے دیکھا تھا۔

''کیسا لگتا ہے نا بھابی جب وہ شخص جسے آپ کے سوا کچھ نظر نہ آتا ہو اور پھر اسے آپ ہی نظر نہ آؤ۔ جو آپ کے سوا کسی کی پروا نہ کرتا ہو۔ وہ آپ سے اس طرح بے پروا ہو جائے۔'' وہ سسک پڑی تھی۔ سارہ نے کچھ کہے بغیر اسے ساتھ لگا رکھا تھا۔

''وہ مجھے کبھی نہیں بھولتے اور...... اور میں انہیں یاد ہی نہیں رہی۔ اس سے بڑھ کر ستم کیا ہوگا۔'' وہ باقاعدہ ہچکیوں سے رونے لگی۔ سارہ کی آنکھیں بھی نم ہوئی تھیں۔ اس نے ہاتھ کی نرم پوروں پر اس کے آنسو چننا شروع کیے۔

''کیا مجھے اسی طرح آزمایا جانا تھا؟ کیا آزمائش ہے کہ ایک بیوی کے ہوتے ہوئے اس کے شوہر کے دل پر دوسری عورت قابض ہو جائے، راج کرے۔ کوئی احساس دنیا میں اس سے بڑھ کر تکلیف دہ نہیں ہو سکتا۔ بہت مشکل ہے صبر کرنا۔ نہیں کر پا رہی۔ بہت بے بس ہوں۔'' وہ اور شدتوں سے بلک رہی تھی۔

''مگر صبر کرنے والوں کے ساتھ تو اللہ ہوتا ہے۔ کیا تم اللہ کو اپنے ساتھ رکھنا نہیں چاہتیں؟'' سارہ نے نرمی و محبت سے کہتے اسے دیکھا۔ لاریب آنسوؤں کے درمیان زخمی انداز میں مسکرائی۔ بڑا مجروح انداز تھا۔

''یہ بہت تلخ سچ ہے۔ بہت گستاخی آمیز بھی۔ جس کے سامنے اور اقرار سے ہم ہمیشہ کتراتے ہیں۔ ہم اللہ سے درحقیقت محبت نہیں کرتے ہیں بھابی! ہم بس اپنی خواہشوں کے غلام ہیں۔ نفس کے پیروکار، اگر میں اللہ سے محبت کرتی ہوتی تو آج غم سے اتنی بے حال نہ ہوتی۔ میں اللہ سے عبدالغنی سے زیادہ محبت کرتی ہوتی تو یوں وحشت زدہ اور بے صبری نہ ہو رہی ہوتی۔ کاش میں عبدالغنی کی بجائے اللہ سے محبت کرتی، پتا ہے میں نے کہیں پڑھا تھا۔ عورت کے لیے مرد دروازہ ہوتا ہے۔ دروازے کا کام راستہ روکنا یا راستہ دینا ہوتا ہے۔ عبدالغنی نے میرا راستہ روک لیا۔ مجھے آگے جانے ہی نہ دیا۔ ہر عورت کی زندگی میں ایسا کوئی نہ کوئی مرد آتا ہے۔ جبھی تو عورت پیغمبر ہوتی ہے نہ ولی۔ وہ دروازہ کھولنے کی کوشش ہی نہیں کرتی۔ وہیں چوکھٹ پر بیٹھی رہتی ہے۔ اسے ہی چومتی رہتی ہے۔ سجدہ کرتی رہتی ہے۔ میں نے بھی نہیں کھولا۔ میں بھی وہیں بیٹھی رہی۔ اسے دیکھتی، اُس پر فدا ہوتی، اسے چومتی، اسے سجدہ کرتی ہوئی۔ یہ سب تو ہونا تھا۔ یہ سزا تو ملنا تھی مجھے۔''

وہ جیسے ایک وحشت کے عالم میں گویا تھی۔ سارہ گنگ رہ گئی۔ کتنی گہری بات تھی۔ کس قدر سچی مگر اس پر غور کون کرتا ہے۔

''میں بریرہ بھابی کی طرح نہیں تھی۔ جنہوں نے عشق مجازی کو عشق حقیقی پر فوقیت نہیں دی۔ آپ نے دیکھا؟ کتنی پُرسکون ہیں وہ۔ اتنے بڑے بڑے نقصان بھی انہیں نہیں ڈگمگاتے۔ بھائی کا انتہا کو پہنچا ہوا ناروا سلوک بھی کس ہمت سے سہہ جاتی ہیں۔ مگر میں ایسا نہیں کر سکتی۔ میں ایسا کیسے کروں؟ پتہ نہیں کہ میں نے صبر کی کوشش نہیں کی؟ مجھے اس میں سخت ناکامی ہوئی ہے۔''

اس کے لہجے میں بے بسی کرلا رہی تھی۔ ہارون نے ہونٹ بھینچے تھے اور وہیں سے پلٹ گیا تھا۔ اپنے

کمرے میں آ کر اس نے سیل فون اُٹھا کر عبدالغنی کا نمبر ڈائل کیا۔

''السلام وعلیکم!'' عبدالغنی کی سنجیدگی سے بھرپور آواز ابھری تھی۔

''وعلیکم السلام! عبدالغنی! آپ کا کام جتنا بھی ضروری ہے۔ واپس آ جائیں۔ لاریب کے علم میں آ چکی ہے یہ بات کہ آپ یہاں آئے تھے۔ وہ بہرحال لاعلم ہے کہ آپ کسی ایمرجنسی میں اچانک لوٹے ہیں۔ میں نہیں چاہتا وہ مزید خود کو ہلکان کرے۔'' ہارون کے دل میں لاریب کے لیے جتنی محبت تھی وہ اس پل گویا پوری طرح آشکار تھی اس کے انداز سے۔

''جی بہتر، میں انشاء اللہ کچھ دیر میں پہنچتا ہوں۔ السلام وعلیکم!''

ہارون نے سلسلہ منقطع کر دیا تھا۔ اس کے انداز میں عجیب سی شکستگی تھی۔ کچھ دیر کھڑا رہا پھر پلٹ کر کمرے سے چلا گیا تھا۔

☆......☆......☆

وہ تیز قدموں سے چلتی ہوئی عبدالہادی کے کمرے میں آئی۔ کمرہ خالی تھا۔ اس کا غصہ اور فشار خون مزید بڑھ گیا۔

''کہاں ہیں عبدالہادی؟'' اس نے ملازمہ کو پکارا تھا۔ جو کچھ فاصلے پر ڈسٹنگ میں مصروف تھی۔

''سر! میم لزا کے ساتھ ابھی لان کی طرف گئے ہیں۔'' ملازمہ کا جواب اسے آگ لگا کے رکھ گیا۔

''مجھے وہاں چھوڑ کے آؤ، مگر اس طرح کہ...... وہ مجھے نہ دیکھ پائیں۔'' ملازمہ ہونق ہوئی تھی اس مطالبے پر، البتہ بحث نہیں کی۔

''پھر آپ کو پچھلے حصے سے جانا چاہیے، تشریف لائیے!'' علیزے ہونٹ بھیجے اس کے ہمراہ ہولی تھی۔ رہائشی حصے سے نکل کر وسیع وعریض سرسبز لان کا آغاز ہوا تو موسم کی خوشگواری کا اندازہ بھی ہوتا تھا۔ مگر اس کا ذہن اتنا تنا ہوا تھا کہ ماحول اور موسم کی خوشگواری کا احساس نہیں کر سکی۔ کچھ فاصلے پر اسے عبدالہادی لزا کے ہمراہ نظر آ گیا تھا۔ امریکن گھاس پر سفید بے حد اسٹائلش چیئرز پر بیٹھے وہ دونوں بلاشبہ اس حسین ترین ماحول میں خود بھی ماحول کی دلکشی وسحر انگیزی میں اضافے کا باعث لگ رہے تھے۔ علیزے کے قدموں کی رفتار خود بخود سست پڑ گئی۔ اس نے ملازمہ کو وہاں سے جانے کا اشارہ کر دیا تھا۔ ان دونوں کا رُخ دوسری جانب تھا۔ جبھی وہ اس کی آمد سے بھی بے خبر تھے۔

''میں خود کو بہت مشکلوں سے سمجھا سکی ہوں یوسف کہ تم میرے نہیں ہو سکے۔ نہیں ہو سکتے۔ تم جانتے ہو میں نے کتنی محبت کی تم سے۔ مگر میری محبت کس کام کی۔ کاش اس لڑکی سے ملنے سے قبل موت آ جاتی مجھے۔'' علیزے نے اس کی بھاری آواز سنی تھی۔ وہ جانے بہت دیر سے روتی رہی تھی۔

''میں معذرت خواہ ہوں لزا کہ میں تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔ اگر میں یہ کہوں تمہارا راستہ غلط تھا تو بے جا نہیں ہوگا۔ میری مثال سامنے ہے تمہارے۔ وہ محبت کس کام کی جو آپ کو صحیح اور غلط میں فرق نہ سمجھا سکے۔ یقین کر سکتی ہو۔ کبھی میں بھی تمہارے جیسی وحشت کا شکار تھا۔ جن دنوں میں چاچو کے پاس گیا بہت آغاز میں...... مجھے ان کی کسی بات کی سمجھ نہں آتی تھی۔ کوئی بات اچھی نہیں لگتی تھی۔ میں ہر وقت ایک بات سوچتا تھا۔ کچھ ایسا ہو جو علیزہ مجھے مل جائے۔ یا میں یہ سوچتا تھا مجھے خدا مل جائے۔ میں اللہ سے ضرور پوچھوں گا اُس نے مجھے کیوں بنایا۔ اس فرسودہ دنیا میں لا کر مجھے کیا دکھلانا چاہا۔ مجھے تو یہاں کے ذرے ذرے سے کوفت

ہو رہی ہے۔ یہاں جو کچھ نظر آتا ہے، وہ حقیقت میں ہوتا نہیں ہے۔ یہاں تو جھوٹ پر پردہ پڑا ہے۔ انسان اپنی جیب بھرنے کے لیے غلط راستہ نکالتا ہے۔ اگر دیا سے ہی مجھے محبت ہونا تھی اور وہ بھی ایسی تو پھر پہلے اس کے دل میں میری نفرت کیوں ڈال دی۔ تیرے قانون اتنے تکلیف دہ کیوں ہیں۔ میں شب بھر رب سے رو رو کر، گڑگڑا کر یہی سوال کرتا رہا۔ مجھے موسیٰ کی طرح کوہِ طور پر جانے کی ضرورت نہیں پڑی کہ رب تو میری شہ رگ سے قریب تھا۔ میں نے پکارا تھا۔ اتنی شدتوں سے، اتنی بے قراری سے لزا......! تم یقین کرسکتی ہو؟ مجھے اتنے ہی قریب سے جواب ملا، مجھے اتنے ہی سکون سے تسلی دی گئی۔ مجھے لگا تھا، میرے پھڑکتے ہوئے وحشت بھرے دل پر کسی نے ہاتھ رکھ دیا ہو۔ ایسا قرار تھا۔ جسے الفاظ میں بیان ہی نہیں کیا جاسکتا۔ میں تمہیں کیا کہوں سوائے اس کے کہ میں خدا سے تمہارے سکون کی دعا کروں گا۔''

''ضرور کرو، اور مجھے یہ بتاؤ یوسف! کیا اگر میں بھی تمہاری طرح مسلم ہو جاؤں تو مجھے میری محبت مل جائے گی؟ تم اپنا لو گے مجھے؟'' بے چینی کے مظہر اس سوال نے جہاں عبدالہادی کو چکرا کے رکھ دیا وہاں علیزے سناٹے میں گھر گئی تھی۔ اگلے کئی ثانیوں کو خاموشی چھا گئی تھی۔ جو سب سے زیادہ علیزے کے لیے گراں تھی۔ ایک ایک لمحہ قیامت خیز تھا۔ وہ عبدالہادی کے تاثرات، اس کے احساسات سے آگاہ نہیں تھی۔ جبھی پل صراط پر تھی جیسے ایک لمحے کو اس کا جی چاہا تھا۔ لزا کے منہ پر تھپڑ رسید کرے اور عبدالہادی کو لے کر یہاں سے دور چلی جائے۔

''تم غلط سمجھی ہو لزا۔ میں مذہب کی جانب اس لیے مائل نہیں ہوا تھا کہ مجھے علیزے درکار تھی۔ میں مسلم ہو کر علیزے کو پاسکتا تھا۔ میں نے اسلام اس لیے قبول کیا تھا کہ میں جان گیا تھا کہ اس مذہب میں ہی دائمی و قلبی سکون ہے۔ میں سکون کی تلاش میں وہاں گیا تھا اور بلاشبہ مجھے سکون عطا ہوا۔ یہ سچ ہے۔ انسان کی محبت میں سوائے ذلت، بربادی اور بے سکونی کے اور کچھ نہیں جبکہ اللہ کی محبت میں سکون بھی ہے اور وقار بھی، انسان معرفات اور درجات اسی محبت میں پاتا ہے۔''

''مجھے تمہاری باتیں سمجھ نہیں آرہی ہیں۔ مجھے تم بس میری بات کا جواب دو کیونکہ یہ طے ہے میں اب تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔ یا تو میں تمہیں حاصل کروں گی یا پھر خودکشی کرلوں گی۔'' وہ پھر سے رونے لگی تھی۔ علیزے میں مزید کچھ سننے کی تاب نہیں رہی تو منہ پر ہاتھ رکھے واپس اندرونی حصے کی جانب بھاگ آئی۔ آنکھوں کی نمی پلکوں کی باڑھ پھلانگ کر گالوں پر اُتر آئی تھی۔ اسے سخت خوف اور بے بسی کے احساس نے گھیر لیا تھا۔

وہ کس کس زیاں پر آنسو بہاتی بھلا؟ کتنے دنوں سے وہ عبدالہادی کی پہلی سی توجہ کی منتظر تھی اور اس کے پاس وقت ہی نہ تھا۔ حالانکہ اس نے احساس دلانے کو اسے ایک نظم بھی سینڈ کی تھی۔ جس میں اگر وہ سمجھنا چاہتا تو اس کے جذبات عیاں تھے۔ اس نے جھجکتے ہوئے سہی مگر لکھ بھیجا تھا۔

ہم ناراض ہیں تم سے
بہت ناراض ہیں تم سے
کہ بہت مصروف ہوناں تم
ہمیں تو یاد کرنے کا تمہیں ٹائم ہی کب ہے
نہ تم کو یاد آتے ہیں
پر اب تو معاف کرنا تم
ہمیں نہ یاد کرنا تم
تمہیں نہ یاد آئیں گے

نہ تم کو اب ستائیں گے
جب جب تم بلاؤ گے یا ہم سے ملنے آؤ گے
تو ہم تم کو بتائیں گے
بہت مصروف ہیں ہم بھی
ہمیں بھی کام ہیں کتنے
ہمیں نہ ہی بلاؤ تم
نہ ہم کو یاد آؤ تم
کہ ہم ناراض ہیں تم سے
بہت ناراض ہیں تم سے

اس کی ہر آس مٹ گئی تھی۔ عبدالہادی کی جانب سے کوئی رسپانس نہ پا کر وہ کتنی دکھی ہوئی تھی۔ کسی قدر روہانسی ہوئی تھی۔ مگر ہمت نہیں ہاری تھی۔ جانے کیوں اسے لگ رہا تھا یا اُس نے دل کو تسلی دی تھی۔ ممکن ہے اسے ٹیکسٹ نہ ملا ہو۔ ممکن ہے اس نے کھولا ہی نہ ہو مصروفیات کی بنا پر۔ جبھی وہ کسی اور بہانے سے اس کے پاس چلی گئی تھی۔ وہ عجلت میں لگتا تھا۔ کہیں جانے کو تیار۔

''علیزے...... آیئے۔'' وہ اسے دیکھ کر نرمی سے مخاطب ہوا تھا۔

''مجھے کچھ بات کرنی تھی۔ آپ تو نظر ہی نہیں آتے۔'' وہ نا چاہتے ہوئے بھی شکوہ کر گئی تھی۔

''جی ضرور بولیے، معذرت خواہ ہوں علیزے! دراصل مصروفیات بہت ہیں، ہر وقت بھاگ دوڑ لگی رہتی ہے۔ آپ کے سامنے ہی ہے۔'' کچھ کاغذات فائل میں لگاتا ہوا وہ اسے دیکھے بغیر بات کر رہا تھا۔ علیزے کو دکھ سا ہوا۔ کام اب اس کے نزدیک شاید علیزے سے زیادہ اہم ہو گئے تھے۔

''میں یہاں ایڈجسٹ نہیں ہو پا رہی۔ ہم واپس کب جائیں گے؟''

''ابھی نہیں لیزے! یہاں مصروفیات بہت ہیں۔ میں نے کہا ناں میں کچھ ذمہ داریوں کو نبھانے کا پابند ہوں، تھوڑا انتظار کر لیں۔'' عبدالہادی نے نرمی و سبھاؤ سے بات کی تھی۔ علیزے بے چین نظر آنے لگی۔ اس کا گویا بس نہیں چلتا تھا اسے گھسیٹ کر یہاں سے دور لے جائے۔ اسے عبدالہادی کا لزا کے قریب رہنا ایک آنکھ نہیں بھا رہا تھا۔ مگر وہ اب یہ بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس روز جتنا اس کا موڈ خراب ہوا تھا۔ عقلمندی کا تقاضا تھا اس کے تذکرے کو نہ چھیڑا جاتا۔

''ام جان اور بابا جان حج سے واپس آنے والے ہیں۔ ان سے ملنے کو بہت بے قرار ہوں۔'' علیزے نے اک اور کوشش کرنی چاہی تھی۔ اسے راضی کرنے کی۔ عبدالہادی نے فائل کو گرہ لگائی اور سیدھا ہو کر اسے دیکھا تھا۔

''لیزے یہاں میں ممی کی خواہش پر مسجد اور مدرسہ بنوانا چاہ رہا ہوں۔ اسی مقصد کی تکمیل کی شروعات میں یہ مصروفیات ہیں۔ ہاں اگر آپ نہیں رُک سکتیں تو میں آپ کو بھجوا سکتا ہوں۔'' علیزے کا دل جل کر لمحوں میں خاکستر ہوا تھا اس تجویز پر۔ یعنی وہ اس گھٹیا لڑکی کے حوالے کر کے اسے خود یہاں سے چلی جائے۔ اسے عبدالہادی پر بھی غصہ آیا۔ اسے فرق ہی نہیں پڑتا تھا کہ وہ اس کے قریب ہو یا نہ ہو۔ وہ سخت روہانسی ہو گئی۔

''میرا خیال ہے آپ کو میرے بجائے اپنی کزن کو واپس اس کے گھر بھیجنا چاہیے۔ جو ہر وقت آپ کے ساتھ نظر آتی ہے۔'' غم و غصے اور اشتعال کی کیفیت میں وہ بنا سوچے سمجھے بولی تھی۔ عبدالہادی جو لاکر کھول کر کچھ ڈھونڈ رہا تھا۔ ایک لمحے کو ساکن رہ گیا۔ اگلے لمحے وہ ایک جھٹکے سے سیدھا ہوا تھا اور کسی قدر متبسم نظروں سے اسے دیکھا۔

''اف...... اتنا غصہ؟ لیزے...... وہ آرکیٹیکچر ہے۔ میرے کام میں میری مدد کر رہی ہے ڈیٹس آل۔ ویسے مجھے کیوں لگ رہا ہے کہ تم جیلس ہو رہی

ہو۔ اور یہ جیلسی تو محبت کے بغیر ممکن نہیں ہے ناں؟ کریکٹ؟'' علیزے یوں ہوگئی گویا گھڑوں پانی آ پڑا ہو۔ خفت کی زیادتی سے وہ نظریں اٹھانے کے قابل نہیں رہی تھی۔ جھنجلاہٹ جو تھی وہ الگ۔

''مجھے بس اتنا پتا ہے کہ مجھے یہاں نہیں رہنا۔'' اس کا انداز ضدی اور ہٹ دھرمی والا تھا۔

''یار کہا تو ہے بھیج دیتا ہوں آپ کو۔'' عبدالہادی نے بھی اسے کسی بچے کی طرح ہی بہلایا تھا۔ جبھی وہ بے تحاشا غصے میں آ گئی تھی۔

''گڈ...... تاکہ تم یہاں اس سنہری چڑیل کے ساتھ گل چھرے اڑاؤ۔''

''لیزے......!'' عبدالہادی کا لہجہ جتنا سرد تھا اسی قدر برہم بھی۔ علیزے نے مطلق پروا نہیں کی۔

''آرکیٹیکچر دنیا میں مر نہیں گئے۔ بہت ملیں گے۔ اسے فوراً سے بیشتر چلتا کریں۔'' سرخ چہرے کے ساتھ مٹھیاں بھیچے وہ جیسے آرڈر کر رہی تھی۔

''اپنے ذہن کو آلودہ مت کریں لیزے! ہماری اس جائیداد میں رشتے داروں میں لزا کا بھی حصہ ہے۔ میں اس سے ایز اے کزن ملتا ہوں۔ اسی نظر سے دیکھتا ہوں آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔'' اب کے اس کا لہجہ دھیما اور مفاہمتی تھا۔ علیزے کا اشتعال پھر بھی کم نہیں ہوا۔

''مگر ضروری نہیں وہ بھی آپ کو اس نظر سے دیکھتی ہو۔ میں نے کہا ناں...... مجھے وہ آپ کے ساتھ پسند نہیں۔'' عبدالہادی نے گہرا سانس بھرا اور خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔

''اوکے فائن! میں خیال رکھوں گا۔ اب آپ کمرے میں جاؤ۔ میں ضروری کام سے جا رہا ہوں۔'' اس کا سر تھپک کر اس نے کہا تھا اور بریف کیس اٹھائے کمرے سے نکل گیا تھا۔

مگر علیزے نے اس کے بعد بھی متعدد بار انہیں اکٹھا دیکھا تھا۔ اور اب...... اب تو جیسے حد ہوگئی تھی۔ محترمہ اسے شادی پر اُکسا رہی تھیں۔ پتھر پر بھی اگر مستقل پانی کا قطرہ گرے وہاں بھی شگاف پڑ جاتا ہے یہ تو پھر عبدالہادی تھا۔ ایک عام انسان، وہ پھر سے روہانسی ہونے لگی۔ خائف ہونے لگی۔ سیل فون کی وائبریٹنگ پر وہ چونک کر متوجہ ہوئی تھی۔ اسکرین پر لاریب کا نام چمک رہا تھا۔

''السلام وعلیکم! شکر ہے کسی کو تو یاد آئی میری۔ ورنہ مجھے خود لگنے لگا تھا مر گئی ہوں میں۔'' اس کا سارا غصہ لاریب پر نکلنے لگا۔ جواباً سرد آہ بھرنے کی آواز سنائی دی تھی۔

''وعلیکم السلام! جیتی رہو۔ بہت خوشیاں دیکھو۔ محسوس ہونے اور کسی حادثے کے رونما ہو جانے میں فرق ہے علیزے تمہیں صرف لگتا ہے۔ یہاں میں واقعی مر گئی ہوں۔ تمہارے بھائی نے کام ہی ایسا کیا ہے۔'' وہ جیسے پھر سے رو دینے کو تیار تھی۔ علیزے ٹھٹک سی گئی۔

''خدانخواستہ کیا ہوگیا؟ بھائی ٹھیک تو ہیں؟'' علیزے کی جان پر بن آئی تھی۔

''انہیں کیا ہوگا؟ دوسری بیوی کے سنگ بہت خوش ہوں گے۔ مرنے کو، جلنے کو تو مجھے یہاں لا چھوڑا۔'' اس کے لہجے میں طنز تھا، تلخی تھی۔ علیزے سناٹے میں گھر گئی تھی۔ سماعتیں سائیں سائیں کرنے لگیں۔

''کیا کہا؟ شادی کر لی بھائی نے؟ وہ ایسا کیسے کر سکتے ہیں؟'' اسے جیسے یقین نہ آتا تھا۔

''ہاں ٹرسٹ کھولا ہے انہوں نے ذاتی، غریب بے سہارا عورتوں کو اسی طرح تحفظ دیں گے۔'' لاریب کا لہجہ زہر خند ہوا۔ علیزے شاکڈ رہ گئی۔ لاریب تفصیل سنا رہی تھی۔

(باقی انشاءاللہ ماہِ فروری میں ملاحظہ فرمائیے)

تایا جان کے الفاظ میری روح تک کو چھلنی کر جاتے تھے مگر مجھے نہایت صبر سے کام لینا تھا۔ کیوں کہ زندگی نے کبھی مجھے دوسرا آپشن دیا ہی نہیں تھا۔ بہت جلد مجھ پر یہ عقدہ بھی کھل گیا کہ اس ساری سنگ زنی کا مقصد مجھے ذہنی طور پر فہیم سے شادی کے لیے تیار کرنا تھا۔ تائی جان کو......

زیست کی پُر ہول وادی سے اُٹھا ایک سوال، افسانے کی صورت

میں خلقِ خدا کے اس طبقے سے تعلق رکھتی ہوں جو ہر صبح اپنے خوابوں کا گلا گھونٹ کر خود کو دن بھر ملنے والی نئی اذیتوں کے لیے ذہنی طور پر تیار کر لیتا ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ میں نے کم عمری میں ہی اپنی محرومیوں سے دوستی کر کے خواہشات کے جزیرے پر جینا سیکھ لیا تھا۔

امی نے جب کبھی ابو کے سامنے اپنے بے گھر ہونے کا رونا رویا، جواب ہمیشہ یہی ملا کہ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ تم بھی اس رب کائنات کی مصلحت میں خوش رہنا سیکھ لو تو ذہنی اور قلبی سکون محسوس کرنے لگو گی۔''

''ہاں بشرطیکہ میری قلبی حرکت، ذہنی پریشانیوں کے سامنے ہتھیار نہ پھینک دے۔''

چند لمحے توقف کے بعد امی اشاروں کناروں میں اپنے مجازی خدا سلیمان احمد کو اپنی بیماری کا احساس بھی دلا جاتیں تو وہ گہری سانس لیتے ہوئے ناک پر ٹکی عینک اتار کر میز پر رکھتے اور نہایت شفقت بھرے انداز میں سمجھانے کی کوشش کرتے۔

''دل چھوٹا نہیں کرتے تانیہ بیگم۔ حالات کبھی ایک سے نہیں رہتے۔ وقت کا تو کام ہی گردش کرنا ہے۔ تم دیکھنا ایک دن ہم اپنا گھر ضرور بنائیں گے، جہاں ہر وہ قانون نافذ ہوگا جو تم چاہو گی۔''

ابو کے ان دو چار جملوں میں اک عجیب سا کرب اور بے بسی محسوس کیا کرتی تھی میں۔ سچ بھی یہی تھا کہ آخر کون چاہتا ہے کہ وہ اپنے پیاروں کے ہمراہ ساری زندگی کرائے کے مکان میں گزار دے اور اُس کی خزاں رسیدہ زندگی میں بہار کبھی اپنے پنکھ نہ پھیلائے۔ گھر سے محبت بھی ماں کی گود کی طرح ہوتی ہے۔ انسان جہاں پیدا ہوا ہو، جہاں اُس نے اپنے والدین کی انگلی پکڑ کر چلنا سیکھا ہو، جہاں اُس نے اپنے سنہرے مستقبل کے خواب بننا سیکھے ہوں، اس جگہ کو وہ کیسے بھلا سکتا ہے۔ لوگ تو سات سمندر پار سے بھی اپنا آخری وقت آبائی گھروں میں گزارنے کے لیے وطن واپس لوٹ آتے

ہیں۔ایسے میں کسی بے گھر شخص کی معاشرے میں کیا شناخت ہوسکتی ہے۔

سب کچھ جانتے ہوئے بھی ابو سے مختصر بحث کے بعد امی بے بسی کے عالم میں میری جانب دیکھتیں، تو میں فوراً نظریں جھکا کر کسی کام کے بہانے پاس سے اٹھ جایا کرتی تھی۔اس کہ وجہ ڈھکی

چھپی نہیں تھی۔ میں نے دو سال قبل کالج کو خیر باد کہا تھا۔ شکل وصورت بھی بری نہیں تھی شاید اسی وجہ سے انہیں میرا رشتہ کسی اچھی جگہ نہ ہونے کا دکھ بھی اندر ہی اندر کھائے چلا جا رہا تھا۔

'اُس لمحے مجھے اپنی بے قدری کا احساس کئی گنا بڑھ جاتا تھا، جب لوگ میری تعلیم وتربیت کو یکسر نظر انداز کر کے اس بنا پر واپس لوٹ جاتے تھے کہ باپ انکم ٹیکس میں ملازمت کرتا ہے، اکلوتی بیٹی ہے مگر پھر بھی اپنا گھر نہیں ہے۔ جو لوگ زندگی بھر اپنا گھر نہ بنا سکے ہوں وہ بیٹی کو جہیز میں دعاؤں کا علاوہ کیا دے سکتے ہیں۔'

مجھے یاد ہے کہ ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو جیسے ہی ابو تنخواہ لے کر گھر پہنچتے تھے تو امی سب سے پہلے کرائے کی رقم اُس میں سے الگ کرلیا کرتی تھیں۔

''سلیمان احمد! میں ہر ماہ کرایہ کی رقم الگ کرتے ہوئے یہ ضرور سوچتی ہوں کہ ہم تو شاید کماتے ہی مالک مکان کے لیے ہیں۔ اس آزاد ملک میں رہنے کے لیے ہمیں اپنی ایک ایک سانس کی قیمت ادا کرنا پڑتی ہے۔ دو دن کرایہ دینے میں تاخیر ہو جائے تو مالک مکان ماتھے پر آنکھیں رکھ کر دروازہ پیٹ ڈالتا ہے۔ آخر یہ گھروں کے مالک ہمیں خود سے کمتر کیوں سمجھتے ہیں؟''

''یہ سب میرے رب کا نظام ہے تانیہ بیگم۔ وہ کسی کو دے کر آزماتا ہے تو کسی سے واپس لے کر۔''

ابو کے لہجے میں وہی ازلی سکون محسوس کرتے ہی امی زیر لب جانے کیا کچھ بڑبڑا کر رہ جاتیں۔ جب کہ میں ان کی جھنجلاہٹ دیکھ کر مسکرا دیا کرتی تھی۔

☆......☆......☆

جن دنوں فہیم سے میرے رشتے کی بات چل رہی تھی امی کچھ زیادہ خوش نہیں تھیں۔ فہیم کی ایک پرائیوٹ فرم میں اوسط درجے کی ملازمت تھی۔ خاندان شریف تھا اور فیملی بھی زیادہ بڑی نہیں تھی۔ اس کے باوجود امی کو یہ رشتہ دل سے قبول نہیں تھا۔ انہیں اس بات پر شدید اختلاف تھا کہ فہیم کے پاس اپنا گھر نہیں ہے۔ ان کے نکتۂ نظر سے ابو بھی متفق تھے لیکن اپنی قناعت پسندی نے اس بار بھی انہیں فہیم کے حق میں دلائل کا سہارا لینے پر مجبور کر دیا تھا۔

''تانیہ بیگم! رشتہ بہت معقول ہے۔ بچہ اور اس کے گھر والے بھی دیکھے بھالے ہیں۔ اگر گھر نہیں ہے تو کیا ہوا۔ ساری دنیا اپنے گھروں میں تو نہیں رہتی۔ اللہ نے چاہا تو ایک دن فہیم بھی اپنا گھر بنا ہی لے گا۔''

''یہ سب اس قدر آسان ہوتا تو آج ہم لوگ بھی بے گھر نہ ہوتے۔ یہ بہت نفسا نفسی کا دور ہے سلیمان احمد۔ پیسہ ہمیشہ پیسے والے پر ہی مہربان ہوتا ہے۔ جس کے پاس آج ایک مکان ہے کل اُس کے پاس دو ہونے کی اُمید تو رکھی جا سکتی ہے۔ لیکن کرائے دار تو چھید کیے ہوئے برتن کی طرح ہوتا ہے۔ اُس کی کمائی میں برکت نہیں ہوتی کیوں کہ اُسے اپنی ہر سانس کی قیمت چکانا ہوتی ہے۔''

''تم وسوسوں میں پڑنے کے بجائے حقیقت پسندانہ انداز میں سوچو۔ بیٹیوں کو زیادہ عرصہ گھر بٹھائے رکھنا دانش مندی نہیں کہلاتی۔ وہ اپنی تعلیم مکمل کر چکی ہے۔ چند سال مزید گزر گئے تو رشتوں کا کال پڑ جائے گا۔ اور میں نہیں چاہتا کہ میری بیٹی پر کبھی ایسا وقت آئے لہٰذا جلد بازی میں انکار کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہمیں کوئی بھی فیصلہ کرنے سے قبل اس کے ہر پہلو کا جائزہ لینا ہوگا۔''

ابو جان کے اصرار پر امی نے فہیم کے سلسلے میں

فہیم رضامندی کا اظہار تو کر دیا تھا لیکن دل سے خوش نہیں تھیں۔

☆......☆......☆

فہیم کا رشتہ تایا جان کی معرفت آیا تھا۔ بات ابھی کسی فیصلے تک نہیں پہنچی تھی کہ میری زندگی کا منحوس ترین لمحہ آن پہنچا۔ ابو اور امی کسی عزیز کی عیادت کے لیے ہسپتال جا رہے تھے کہ موٹر بائیک پر ایک قاتل بس چڑھ دوڑی۔ عینی شاہدوں کے مطابق حادثہ اس قدر اچانک پیش آیا تھا کہ میرے والدین کو سنبھلنے کا موقع ہی نہ مل سکا۔ امی ابو مجھے ہمیشہ کے لیے بے یار و مددگار چھوڑ کر فلک کے اُس پار جا بسے تو مجھے بھی کرائے کا مکان چھوڑ کر تایا جان کے ہاں منتقل ہونا پڑا۔

تایا جان کو کبھی بھی مجھ سے انسیت نہیں رہی تھی۔ اُن کے مالی حالات ہم سے بہت بہتر تھے یہی وجہ تھی کہ وہ صرف عید شب برات پر ہی ہمارا حال احوال پوچھنے کی زحمت کیا کرتے تھے۔ وہ مجھے اپنے ہاں صرف برادری کا منہ بند کرنے کے لیے لائے تھے۔ رہی سہی کسر تائی جان نے پوری کر دی تھی۔ وہ مجھے اپنی بیٹیوں کے لیے نحوست قرار دے کر جلد از جلد بیاہ دینے پر تلی ہوئی تھیں۔ حالانکہ یہ کیسے ممکن تھا کہ میری موجودگی سے ان کی بیٹیوں کے حقوق غصب ہو جاتے۔

''سلیمان احمد تھا تو میرا سگا بھائی مگر عقل سے بالکل پیدل تھا'' تایا جان ہر چوتھے روز ڈائننگ ٹیبل پر چائے کا کپ ہاتھ میں آتے ہی اس موضوع پر زہر افشانی کرنے لگتے تھے۔

''ساری عمر انکم ٹیکس جیسے محکمے میں ملازمت کرنے کے باوجود اکلوتی بیٹی کو کرائے کے مکان میں چھوڑ گیا۔ لوگ صحیح کہتے تھے کہ جس روز شہر میں سو احمق مرے تھے اُسی روز سلیمان احمد نے دنیا میں آنکھ کھولی تھی...... ساری زندگی ایمانداری کا میڈل سینے پر سجائے خود بھی ذلیل ہوتا رہا اور اولاد کے لیے بھی کچھ نہ کر سکا۔''

تایا جان کے الفاظ میری روح تک کو چھلنی کر جاتے تھے مگر مجھے نہایت صبر سے کام لینا تھا۔ کیوں کہ زندگی نے کبھی مجھے دوسرا آپشن دیا ہی نہیں تھا۔ بہت جلد مجھ پر یہ عقدہ بھی کھل گیا کہ اس ساری سنگ زنی کا مقصد مجھے ذہنی طور پر فہیم سے شادی کے لیے تیار کرنا تھا۔ تائی جان کو مجھ سے مستقل جان چھڑانے کا یہی ایک طریقہ سوجھا تھا کہ فہیم سے شادی کر دی جائے۔

چنانچہ ایک روز تایا جان نے اپنی مجبوریوں کا رونا روتے ہوئے مجھ سے اس رشتے کی بابت حتمی رائے طلب کی تو میں نے ان کے فیصلے کو اپنا فیصلہ قرار دے کر مسئلے کو منطقی انجام تک پہنچا دیا۔ فیصلہ تو شاید وہ پہلے ہی کیے بیٹھے تھے۔ بس رسمی کارروائی کے طور پر میری ہاں سننا باقی تھا۔

☆......☆......☆

کچھ دنوں بعد سادگی سے میرا نکاح فہیم رضا سے کر دیا گیا اور رخصتی بھی ہوگئی۔

فہیم متوسط گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ اُن کے والد وفات پا چکے تھے جب کہ والدہ کا سایہ سر پر موجود تھا۔ وہ دو بہنوں کے اکلوتے بھائی تھے۔ ان کے گھریلو مسائل بھی بالکل وہی تھے جن سے میں ساری زندگی نبرد آزما رہی۔ شاید اسی لیے پیا گھر پہنچ کر مجھے اجنبیت کا احساس بالکل نہیں ہوا تھا۔

فہیم مجھ سے بے حد محبت کرتے تھے۔ وہ اپنی بساط میں رہتے ہوئے میری ہر خواہش کو پورا کرنے کی کوشش میں رہتے تھے۔ میں خود بھی اپنی زندگی سے بہت خوش تھی لیکن یہ کسک اکثر دل کو افسردہ کر دیا

کرتی تھی کہ کاش میرا بھی ایک گھر ہوتا جسے میں بہت محبت اور چاہت سے سنوارتی۔ جس کی ایک ایک اینٹ سے میری جذباتی وابستگی ہوتی اور اس کے در و دیوار ہر پل مجھے تحفظ کا احساس دلاتے۔ لیکن افسوس کہ یہ سب خواب وخیال کی باتیں تھیں۔ شادی کے بعد میرا صرف ٹھکانہ بدلا تھا حالات نہیں۔ ہر ماہ کی یکم تاریخ کو فہیم اپنی خون پسینے کی کمائی لے کر گھر میں داخل ہوتے تو میں اپنی ماں کی طرح سب سے پہلے اُس میں سے مکان کا کرایہ نکال کر الگ کرتی اور پھر باقی ماندہ رقم اور اخراجات کی لسٹ سامنے رکھ کر سر پکڑ لیتی۔

گھر بھر کی کفالت فہیم کے ذمہ تھی اور وہ بہت جاں فشانی سے محنت کر رہے تھے۔ یہ ان کی محنت کا نتیجہ تھا کہ صرف دو سال کے اندر انہوں نے اپنی دونوں بہنوں کو بیاہ کر اپنے اپنے گھر رخصت کر دیا۔ شادیوں کی تقریب گو کہ بہت سادگی سے منعقد ہوئی لیکن پھر بھی قرض کا سہارا لینا ہی پڑا تھا۔

وقت کا پہیہ اپنی مخصوص رفتار سے گھومتا رہا اور یوں زندگی کے دس سال گزر گئے۔ اس دوران اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایک بیٹی نادیہ اور بیٹے قاسم کی انمول نعمت سے بھی نواز دیا۔ جب کہ فہیم کی والدہ اور میرے تایا جان اس دنیا سے منہ موڑ گئے۔

ہم اپنی زندگی سے کافی حد تک مطمئن تھے۔ گو آمدن اتنی زیادہ نہیں تھی کہ ہر آسائش میسر ہوتی لیکن اللہ کا شکر تھا کہ کبھی اُس نے بھوکا نہیں سونے دیا تھا۔ اب ہماری زندگی کا اہم ترین مقصد اپنے گھر کا حصول رہ گیا تھا۔ ہماری اپنی زندگیاں تو جیسے تیسے گزر رہی تھیں مگر دل میں یہ خواہش ضرور تھی کہ اپنی اولاد کو اس ذلت سے بچایا جا سکے۔

فہیم خود بھی اس سلسلے میں پُرعزم تھے۔

☆......☆......☆

انہی دنوں فہیم کے ایک دفتری ساتھی نے اپنا پلاٹ فروخت کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ یہ پلاٹ شہر کے مضافات میں نوتعمیر شدہ ہاؤسنگ سوسائٹی میں تھا۔ فہیم نے مجھ سے مشورے کے بعد وہ پلاٹ خریدنے کا فیصلہ کر لیا۔ اب مسئلہ یہ تھا تمام تر جمع پونجی کا حساب لگانے کے باوجود ہمارے پاس اتنی رقم موجود نہیں تھی کہ پلاٹ کی قیمت ادا کی جا سکتی۔ بہت سوچ بچار کے بعد میں نے اپنا تمام زیور لا کر فہیم کی جھولی میں ڈال دیا۔

''یہ تم کیا کر رہی ہو۔ یہ زیور ہی تو ہمارا واحد اثاثہ ہے۔ اگر آج اسے سنبھال کر رکھ لیں گے تو کل نادیہ کی شادی میں کام آ جائے گا۔''

وہ تو شاید اس زیور کے بارے بہت دور کی سوچ بیٹھے تھے۔ لیکن میں نے مصمم ارادے کرنے کے بعد ہی انہیں زیور فروخت کرنے کے لیے دیا تھا۔ میں نے اُن کا موقف توجہ سے سنا اور پھر قریب بیٹھ کر جواب دیا:

''سونا کبھی بھی غریب کا نصیب نہیں ہوا کرتا۔ یہ صرف ان جھولیوں میں پھلتا پھولتا ہے جہاں ان پر نظر نہیں رکھی جاتی۔ غریب تو اس سلسلے میں سدا کا غبی ہے۔ جب بھی اس کے گھر پر کوئی قیامت ٹوٹتی ہے اُس کی نظر سب سے پہلے کانوں کے جھمکوں، گلے کے ہار اور ہاتھوں کے کنگن پر جاتی ہے۔ آپ اللہ کا نام لیں اور اسے سنار کے حوالے کر آئیں۔ زندگی نے وفا کی اور اگر قسمت میں ہوا تو اوپر والا پھر سے کوئی وسیلہ بنا دے گا۔ ویسے بھی اس وقت سب سے بڑا مسئلہ گھر کا نہ ہونا ہے۔ گھر بن گیا تو کرائے سے جان چھوٹ جائے گی اور بچت بخود ہونے لگے گی۔ جب ہاتھ میں پیسے آنے شروع ہو جائیں تو کوئی بھی مسئلہ مسئلہ نہیں رہتا۔''

فہیم میری ساری تمہید سر جھکائے سنتے رہے، وہ بالکل خاموش تھے۔ بظاہران کے پاس میری تجویز کو رد کرنے کی کوئی معقول وجہ نہیں تھی۔ لیکن میں جانتی تھی کہ ان کی روح میں اُس پل ٹوٹ پھوٹ کا عمل بہت تیز ہو گیا تھا۔ ان کی جھکی ہوئی پلکوں میں ہونے والی تھرتھراہٹ اس بات کا ثبوت تھی کہ ان کی آنکھیں نہیں پر دل ضرور رو رہا ہے۔ شادی کے بعد انہوں نے اپنی بہنوں کی شادیاں کیں تو سر پر قرض بھی چڑھ گیا تھا۔ لیکن انہوں نے ہمت نہیں ہاری تھی بلکہ شام کے وقت ایک پارٹ ٹائم ملازمت تلاش کر کے جیسے تیسے اپنے سر سے قرض کا بوجھ اتار پھینکا تھا ۔ان مشکل حالات میں اگر وہ چاہتے تو مجھ سے زیور لے کر آسانی سے اپنا قرض اتار سکتے تھے اور میں یہ قربانی دینے میں ایک پل کی دیر نہ کرتی مگر انہوں نے خود اپنے لیے مشکل راستہ چنا تھا۔ جو اُن کی خودداری اور فرض شناسی کا منہ بولتا ثبوت تھا۔

قصہ مختصر کافی بھاگ دوڑ کے بعد ہم لوگ زمین کا وہ ٹکڑا خریدنے میں کامیاب ہو گئے جس پر ہمارے خوابوں کو مجسم حالت میں ظہور پذیر ہونا تھا۔ تمام تر جمع پونجی اور زیور فروخت کرنے کے باوجود بھی ہمارے پاس رقم پوری نہیں ہوئی تھی۔ چنانچہ فہیم نے اپنے دوست کی منت سماجت کر کے اُسے قائل کر لیا تھا کہ باقی رقم دو سال کے اندر اقساط میں ادا کر دی جائے گی۔

جس روز یہ معاملات طے پائے ہمارے گھر میں عید کا سماں تھا۔ سب کے چہروں سے خوشی کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں اور میں سوچ رہی تھی کہ بہت سے لوگوں کے لیے یہ چند مرلے کا پلاٹ کوئی اہمیت نہیں رکھتا ہو گا۔ بہت سے لوگ ایسے ہوں گے جنہیں اس کرب کا احساس ہی نہیں ہو گا کہ اپنا گھر نہ ہونے پر انسان کو کن اذیتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جب کہ بے شمار لوگ ایسے بھی ہوں گے جنہیں وراثت میں جائیدادیں ملتی ہیں اور وہ عمر بھر خود کو فرعون سمجھ کر بنا ہاتھ پاؤں ہلائے ان کے کرائے ہی کھاتے رہتے ہیں۔ لیکن پھر سوچا کہ ابو صحیح کہا کرتے تھے۔ اس میں بھی رب کائنات کی مصلحت ہے۔ وہ جسے چاہتا ہے دے کر آزماتا ہے اور جسے چاہتا ہے چھین کر۔

☆......☆......☆

وقت ایک مرتبہ پھر پر لگا کر اڑنے لگا تھا۔ پلاٹ کی اقساط ختم ہو گئیں تو ہم نے یہ اہم مرحلہ طے ہونے پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔ فہیم بہت پُرعزم تھے کہ آیندہ چند برسوں میں ہم ضرور اس قابل ہو جائیں گے کہ اپنا گھر تعمیر کر سکیں۔

اپنے خوابوں کو تعبیر دینے کے لیے وہ اب بھی صبح و شام دو جگہ ملازمت کر رہے تھے۔ لیکن ان کی صحت اب تیزی سے گرنے لگی تھی۔ میں جب بھی انہیں اپنا مکمل چیک اپ کروانے کا مشورہ دیتی جواب یہی ملتا کہ کام کی زیادتی کی وجہ سے کچھ تھکاوٹ ہو جاتی ہے۔ دیکھنا جب ہمارا گھر بن گیا تو میں پھر سے ہشاش بشاش ہو جاؤں گا۔ بچے اب بڑے ہو چکے تھے چنانچہ میں نے فہیم کو اس بات پر قائل کر لیا کہ وہ مجھے بھی ملازمت کرنے کی اجازت دے دیں۔ وہ اس بات کے لیے دل سے راضی تو نہیں تھے لیکن جب میں نے انہیں سمجھایا کہ اس طرح ہم جلدی رقم جمع کر کے گھر کی تعمیر کا آغاز کر سکتے ہیں تو وہ نیم رضامند ہو گئے۔ اور یوں میں نے بھی ایک فرم میں ملازمت کا آغاز کر دیا۔

اب ہم دونوں کو دنیا جہان کا کوئی ہوش نہیں رہا تھا۔ اپنے گھر کا حصول ہماری زندگی کا واحد نصب العین بن کر رہ گیا تھا۔ بظاہر سب کچھ ٹھیک چل رہا تھا لیکن قدرت کو شاید کچھ اور ہی منظور تھا۔

☆......☆......☆

ایک روز چھٹی کے بعد میں ابھی گھر واپس پہنچی ہی تھی کہ دروازے پر تیز دستک سنائی دی۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو سامنے دو لڑکے موٹر بائیک پر موجود پائے۔

''آپ فہیم صاحب کی اہلیہ ہیں؟''

''جی ہاں فرمائیں۔'' میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا تو ان میں سے ایک بائیک سے اتر کر میرے قریب چلا آیا اور مودبانہ لہجے میں بولا:

''بھابی! ہم فہیم بھائی کے ساتھ دفتر میں کام کرتے ہیں۔ کچھ دیر قبل فہیم بھائی اچانک دفتر میں بے ہوش ہو گئے تھے۔ ہمارے باقی ساتھی انہیں ایمبولینس میں ہسپتال لے گئے ہیں۔''

''کک...... کیا ہوا فہیم کو؟'' مجھے اپنا دل ڈوبتا محسوس ہوا ''وہ ٹھیک تو ہیں؟''

''یہ تو معلوم نہیں البتہ انہیں ہوش بالکل نہیں تھا اور چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔ اس وقت وہ نیشنل ہسپتال میں ہیں۔ پلیز آپ وہیں پہنچ جائیں۔ ہمارے سیکشن انچارج نصیر بھائی اس وقت اُن کے پاس موجود ہے۔ بس آپ دیر مت کیجیے گا۔''

''جی بہتر......''

میں نے بمشکل خود کو سنبھالتے ہوئے جواب دیا اور اپنے بیٹے قاسم کو ہمراہ لے کر گھر سے نکل پڑی۔ نیشنل ہسپتال وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ ہم دونوں ٹیکسی میں وہاں پہنچے تو گیٹ پر ہی فہیم کے دوست اور سیکشن انچارج نصیر بھائی سے ملاقات ہو گئی۔ وہ فوراً ہمیں تسلیاں دیتے ہوئے ایمرجنسی میں لے گئے جہاں فہیم ایک بستر پر بے سدھ پڑے تھے۔

ڈاکٹر کے مطابق انہیں برین ٹیومر تھا۔ جسے وہ ہمیشہ عام سر درد سمجھ کر محلے کے ڈاکٹر سے علاج کرواتے رہے تھے، اب ایک عفریت کا روپ دھار چکا تھا۔ ڈاکٹر نے اُن کی حالت دیکھ کر فوری طور پر چند مہنگے ٹسٹ تجویز کیے تھے اور خدشہ ظاہر کیا تھا کہ مرض بہت بڑھ چکا ہے۔

یہ سنتے ہی میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھانے لگا تو میں اٹھ کر واش روم میں جا گھسی۔ زندگی مجھ سے ایک نئے امتحان کی متمنی تھی۔ وقت ایک بار پھر مجھ سے قربانی کا متقاضی تھا۔ میں پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی شاید اس لیے کہ میں آج ہی رو لینا چاہتی تھی۔ یہ بات مجھے قطعاً گوارہ نہیں تھی کہ میری آنکھوں کی نمی فہیم کو مزید کمزور بنا دے۔

چند روز ہسپتال میں گزارنے کے بعد میں فہیم کو گھر واپس لے کر آ گئی۔ زندگی پہلے سے بھی مشکل ہو گئی تھی۔ اب مجھے اپنی ملازمت کے ساتھ ساتھ فہیم کی دیکھ بھال بھی کرنا تھی۔ فہیم کی صحت روز بروز گرتی چلی جا رہی تھی۔ پرائیویٹ نوکری تو ہوائی روزی ہوا کرتی ہے۔ وہاں قدر انسانوں کی نہیں کام کی ہوتی ہے۔ لہٰذا بمشکل ایک ماہ بعد انہیں نوکری سے فارغ کر دیا گیا۔

فہیم جو کہ اپنی بیماری سے لاعلم تھے اس صدمے نے انہیں مزید نڈھال کر دیا تھا۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ وہ اس حالت میں سڑکوں پر نوکری کے لیے مارے مارے پھریں۔ لہٰذا اب میں انہیں کسی نہ کسی بہانے گھر سے باہر جانے سے روکنے لگی تھی۔ لیکن وہ بہت خوددار تھے۔ انہیں یہ سب قطعاً اچھا نہیں لگتا تھا اور وہ خود کو بوجھ سمجھنے لگے تھے۔

☆......☆......☆

ایک صبح ناشتہ تیار کرنے کے بعد جب میں فہیم کو جگانے کمرے میں گئی تو وہ بے ہوش پڑے تھے۔ انہیں اس حالت میں دیکھتے ہی میرے ہاتھ پاؤں کانپنے لگے۔ میں نے فون کر کے فوراً ایمبولنس منگوالی۔

مرچیں کھائیں، موٹاپا بھگائیں

جو خواتین موٹاپے کو کم کرنا چاہتی ہیں، ان کو چاہیے کہ وہ مرچوں کا استعمال کریں کیونکہ کینیڈا کی

لاول (Laval) یونیورسٹی میں ہونے والی ایک تحقیق کے مطابق سرخ اور ہری مرچیں کھانے سے موٹاپے کو کم کیا جاسکتا ہے۔ سرخ اور ہری مرچیں جسم کے میٹابولزم کو بہتر کرکے فالتو چربی پگھلانے میں مددگار ثابت ہوتی ہیں۔ تحقیق میں ماہرین نے یہ بھی بتایا ہے کہ ہری یا سرخ مرچ کھانے کے بعد لگنے والی گرمی مزید کھانے کی خواہش کو دور کرتی ہے۔

''برٹش جرنل آف نیوٹریشن'' میں شائع ہونے والی تحقیق سے فرح عالم، اسلام آباد کا انتخاب

فہیم کو دوبارہ ہسپتال لے جایا گیا اور ان کے بہت سے ٹیسٹ ہوئے۔ مرض پوری طرح اپنے پنجے جما چکا تھا اور اب آپریشن کرنا بھی ممکن نہیں رہا تھا۔ ڈاکٹرز کا کہنا تھا اب اُن کے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ مرض لاعلاج ہو چکا ہے البتہ ادویات کے متواتر استعمال سے ان کی تکلیف میں کچھ کمی کی جا سکتی تھی۔

کینسر اُن موذی امراض میں سے ہے جو اگر کسی کا گھر تاک لیں تو کچن کے برتن تک بک جاتے ہیں۔ یہ صرف مریض کے لیے اذیت ناک نہیں ہوتا بلکہ اس کے پیاروں کو بھی زندہ درگور کر دیتا ہے۔ جب وہ اپنی عزیز ترین ہستی کو یوں قطرہ قطرہ مرتے دیکھتے ہیں تو خود بھی نفسیاتی مریض بن کر رہ جاتے ہیں۔

ڈاکٹر نے فہیم کے علاج کے سلسلے میں جن تفصیلات سے مجھے آگاہ کیا تھا اس کے لیے خاصی رقم کی ضرورت تھی۔ فہیم میری زندگی کا واحد اثاثہ تھے۔ ان کے بغیر جینا میرے لیے موت سے بھی بدتر تھا لہٰذا بہت سوچ بچار کے بعد میں نے اپنا پلاٹ فروخت کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ فہیم نے پلاٹ کی رجسٹری جانے کیا سوچ کر میرے نام کروائی تھی۔ میں نے ان کے علم میں لائے بغیر ایک پراپرٹی ڈیلر سے رابطہ کیا اور پھر اسی کے توسط سے ایک ہفتے کے اندر اندر پلاٹ فروخت کر دیا۔

اس بات کا اندازہ مجھے بخوبی ہو چکا تھا کہ پراپرٹی ڈیلر اور خریدار نے میری مجبوری سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے بہت کم رقم کی پیش کش کی تھی مگر میں کیا نہ کرتی۔ اس وقت مجھے رقم کی اشد ضرورت تھی۔ ادویات پر اٹھنے والے بے پناہ خراجات نے سارے گھر کا نظام درہم برہم کر دیا تھا۔ ادھر فہیم کی حالت بھی دن بدن بگڑتی چلی جا رہی تھی اس لیے رقم ہاتھ میں آتے ہی میں نے انہیں ایک اچھے ہسپتال میں لے گئی۔

ہسپتال میں فہیم اکثر مجھ سے علاج پر ہونے

والے اخراجات کی بابت استفسار کرتے رہتے تھے مگر میں اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے موضوع کو ٹال دیا کرتی تھی۔

ایک شام جب میں ان کے قریب بیٹھی باتیں کر رہی تھی تو انہوں نے لمحہ بھر کے لیے میری آنکھوں میں جھانکنے کے بعد میرا ہاتھ تھام لیا اور پر سکون لہجے میں بولے۔

''تم بہت عظیم ہو عالیہ۔ اپنے دکھ کو فراموش کر کے میرے دکھ کی شدت کم کرنے کی کوشش میں لگی رہتی ہو۔ حالانکہ یہ جانتی ہو کہ موت دھیرے دھیرے میری روح پر قابض ہوتی چلی جا رہی ہے۔''

''یہ کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ۔ ہم دونوں تو ایک جان دو قالب ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے بغیر نامکمل ہیں۔ بیماری تو جسم کا صدقہ ہوا کرتی ہے۔ ڈاکٹرز کہتے ہیں کہ آپ بہت جلد صحت یاب ہو جائیں گے۔'' ان کی بات سن کر میرا دل تیزی سے دھڑکا تھا۔

''مجھے بہلاؤ مت عالیہ۔ میں بچہ نہیں ہوں۔ یہ بات میں عرصے سے جانتا ہوں کہ مجھے برین ٹیومر ہے۔''

ان کی زبان سے یہ انکشاف سن کر لمحہ بھر کے لیے تو میں سکتے میں آ گئی تھی۔

''اگر آپ جانتے تھے تو مجھ سے چھپایا کیوں؟'' جواباً وہ بے دلی سے مسکرا کر بولے۔

''یہ سوال میں بھی تم سے پوچھ سکتا ہوں کہ تم نے میری ہی بیماری کو مجھ سے کیوں چھپایا۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ تم نہیں چاہتی تھیں کہ مجھے یہ خبر سن کر تکلیف پہنچے۔ کچھ ایسے ہی جذبات میرے بھی تھے۔ جب ڈاکٹر نے مجھے برین ٹیومر کے بارے میں بتایا تھا تو میں نے ہمت ہارنے کے بجائے اپنی محنت کو دوگنا کر دیا تھا۔ میری دلی بلکہ شاید پہلی اور آخری خواہش یہی تھی کہ مرنے سے قبل میں تم لوگوں کو ایک چھت دے جاؤں۔ میرا خاندان میری آنکھیں بند ہوتے ہی بے سائبان نہ ہو جائے۔ مگر میں ایسا نہ کر سکا۔ مجھے معاف کر دو عالیہ۔ میں بیچ راہ میں تمہیں بے یار و مددگار چھوڑ کر رخت سفر باندھ بیٹھا ہوں۔ بہت بدنصیب ہوں میں جو اس کرب کو ساتھ لیے قبر میں اتر جاؤں گا کہ میں اپنی بیوی اور بچوں کو بے یار و مددگار چھوڑ آیا ہوں۔ اپنی ذمہ داریوں سے فرار حاصل کرنا ہے یہ میرے نزدیک۔ میں گناہ گار ہوں تمہارا اور اپنے بچوں کا۔''

فہیم کے الفاظ جب مجھے نشتر کی طرح چبھنے لگے تو ضبط کے تمام بندھن بھی ٹوٹ گئے۔ اس وقت یقیناً میں اپنے حواس میں نہیں تھی اور فہیم سے لپٹ کر بچوں کی طرح دھاڑیں مار کر رونے لگی تھی۔

''میں آپ کو کچھ نہیں ہونے دوں گی فہیم۔ نہ تو میں کسی مرحلے پر خود ہمت ہاروں اور نہ ہی آپ کو حوصلہ ہارنے دوں گی۔ میری دنیا تو صرف آپ سے ہے۔ میں ایک مرتبہ پھر لاوارث نہیں ہونا چاہتی۔''

''محبتیں کبھی مرتی نہیں ہیں عالیہ۔ جسم خاک سے مل کر خاک ہو جاتے ہیں لیکن محبتیں اس وقت تک زندہ رہتی ہیں جب تک خستہ حال قبروں پر پھول دکھائی دیتے رہیں۔ تمہیں بہت حوصلے سے کام لینا ہوگا۔''

وہ جانے مجھے کیا کچھ سمجھا رہے تھے اور میں ان کے سینے پر سر رکھے مسلسل روئے چلی جا رہی تھی۔ یہ سلسلہ دیر تک جاری رہا۔ پھر جیسے فہیم کے ذہن کے تاریک پردے پر بجلی سی کوندی تھی:

''سنو! اتنے مہنگے ہسپتال میں تو روز بہت خرچہ ہوتا ہوگا ہمارا۔ اتنے پیسے کہاں سے آئے تمہارے

پاس۔ کہیں تم نے وہ پلاٹ تو نہیں بیچ دیا۔ ایک روز قاسم بتا رہا تھا کہ مما پراپرٹی ڈیلر سے ملنے گئی ہیں۔''

''آپ بے فکر رہیں۔ میں وہ پلاٹ کیسے فروخت کرسکتی ہوں جسے آپ نے اتنی چاہت سے خریدا تھا۔ آپ کے علاج کا سارا خرچہ وہ کمپنی برداشت کر رہی ہے جہاں میں ملازمت کرتی ہوں۔ پراپرٹی ڈیلر کے پاس تو میں یہ پوچھنے گئی تھی کہ وہ مجھے کسی اچھے کنسٹرکشن والے سے ملوا دیں۔ کیوں کہ میں ہاؤس بلڈنگ سے قرضہ لے کر فوراً مکان بنوانے کا ارادہ رکھتی ہوں۔''

وقت نے مجھے اپنے عزیز ترین شوہر سے جھوٹ بولنا بھی سکھلا دیا تھا۔ میں نے اصل بات گول کرتے ہوئے فہیم کو ایک نئی آس دلائی تو ان کی ویران آنکھوں میں چمک سی آگئی۔

''کیا تم سچ کہہ رہی ہو عالیہ۔ کیا ہمیں ہاؤس بلڈنگ سے واقعی قرضہ مل جائے گا۔''

''جی بالکل بہت جلد۔ میرے دفتر کی ایک سہیلی کے والد ملازمت کرتے ہیں وہاں۔ بہت اچھی پوسٹ پر ہیں۔ انہوں نے بہت مدد کی ہے میری اس سلسلے میں۔ میں نے تو کیس تیار کر کے فائل بھی جمع کروادی ہے۔''

''کیا واقعی، مگر تم نے یہ سب مجھ سے کیوں چھپایا؟'' فہیم نے مصنوعی ناراضگی کا اظہار کیا۔

''میں آپ کو سرپرائز دینا چاہتی تھی۔ آپ کے چہرے پر وہ طمانیت دیکھنا چاہتی تھی جس کے لیے برسوں آپ نے دن رات محنت کی ہے۔'' میں نے ان کے کاندھے پر سر رکھ دیا تو وہ دھیرے سے مسکرا کر میرے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگے۔

''خدا جانے وہ دن کبھی میری زندگی میں آئے گا بھی یا نہیں۔''

''کیوں نہیں آئے گا۔ اب تو ہم اپنی منزل کے بہت قریب پہنچ چکے ہیں۔ اللہ نے چاہا تو بہت جلد ہم اپنے نئے گھر میں شفٹ ہو جائیں گے۔ ایسا گھر جسے ہم فخر سے اپنا کہہ سکیں گے۔''

''انشاءاللہ۔''

فہیم نے مختصر جواب دیا اور پھر نقاہت محسوس کرتے ہوئے آنکھیں موندلیں۔

☆......☆......☆

چند ہفتے بعد فہیم کی حالت اچانک تشویش ناک ہوگئی۔ اب ان کا زیادہ وقت ہسپتال میں گزر رہا تھا۔ میں انہیں ہر قسم کی اذیت سے بچانا چاہ رہی تھی اسی لیے آئے روز کوئی نیا جھوٹ بول کر انہیں خوش رکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ بچوں کو بھی میں نے سختی سے ہدایت کی تھی کہ اپنے بابا کو کسی صورت یہ مت بتائیں کہ ہمارا پلاٹ فروخت ہو چکا ہے۔ اب میں نے فہیم سے یہی کہا تھا کہ ہاؤس بلڈنگ کی جانب سے قرضہ منظور ہو گیا ہے اور ٹھیکے دار کو پہلی قسط کی ادائیگی ہوتے ہی تعمیراتی کام شروع ہو جائے گا۔ انہیں اپنی بات کا یقین دلانے کے لیے میں نے کاغذ پر بنا ہو امکان کا ایک فرضی نقشہ بھی دکھا دیا تھا۔

جب میں نے فہیم کو وہ نقشہ دکھایا تو اُن کی خوشی قابلِ دید تھی۔ وہ بار بار مجھ سے تعمیر سے متعلق مختلف پہلوؤں پر گفتگو کر رہے تھے۔

''اگر میں تندرست ہوتا تو خود سارے کام کی نگرانی کرتا۔ یہ ٹھیکیدار لوگ تو کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔''

''آپ فکر مت کریں ٹھیکیدار بھروسے کا آدمی ہے۔ میری سہیلی کے والد نے ہی اُسے ہمارا کام کرنے کے لیے رضامند کیا ہے۔''

''جس روز ٹھیکیدار اپنا کام شروع کرے تم مجھے وہاں لے جانا۔ میں اپنے گھر کی تعمیر اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا ہوں۔'' ان کے لہجے میں اس قدر

حسرت تھی کہ مجھے اپنی روح تک گھائل ہوتی محسوس ہوئی۔

''ضرور چلیں گے مگر ابھی نہیں۔ فی الحال ڈاکٹرز آپ کو وہاں جانے کی اجازت بالکل نہیں دیں گے۔ جیسے ہی حالت تھوڑی سنبھلے گی میں خود آپ کو ساتھ لے جاؤں گی۔''

''وعدہ کرو۔''

''وعدے تو ٹوٹ جایا کرتے ہیں فہیم۔ میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ آپ کی خواہش ضرور پوری ہوگی۔''

میں اپنی جانب سے انہیں مطمئن رکھنے کی ہر دم کوشش کر رہی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ مکان کی تعمیر کا سن کر ان کے اندر پھر سے زندہ رہنے کا جذبہ پیدا ہو گا۔ اگر وہ خود جینے کی کوشش کریں گے تو موت بھی اُن پر حاوی نہیں ہو پائے گی مگر یہ سب میری خام خیالی تھی۔ ہوتا وہی ہے جو کاتب تقدیر لکھ دیا کرتا ہے۔

اُسی رات اچانک فہیم کی حالت بہت خراب ہو گئی۔ ڈاکٹروں نے اُنہیں بچانے کی سر توڑ کوششیں کیں مگر کون ہے جو وقت اور ریت کو مٹھی میں قید کر پایا ہے۔ میں کبھی نہیں بھول پاؤں گی کہ وہ رات کا پچھلا پہر تھا جب فہیم مجھے اور بچوں کو بلکتا چھوڑ کر اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

وقتی طور پر تو جیسے میں اپنا ذہنی توازن ہی کھو بیٹھی تھی۔ میں لاکھ جتن کرنے کے باوجود اپنی زندگی کا وہ مضبوط ترین سہارا کھو بیٹھی تھی جس نے مجھے حقیقی معنوں میں جینا سکھایا تھا۔ جو میری زندگی کا حاصل تھا۔

☆......☆......☆

فہیم کی تدفین قریبی قبرستان میں کر دی گئی۔ قبر کے لیے جگہ کیسے اور کس نے منتخب کی میں نہیں جان پائی تھی۔ البتہ اتنا معلوم تھا کہ اس نیک کام میں حصہ لینے والے فہیم کے قریبی ساتھیوں میں سے تھے۔ قاسم ابھی خود بچہ تھا۔ اُسے ان چیزوں کے بارے کچھ علم نہیں تھا بس غم سے نڈھال آنسوؤں کے نذرانے پیش کرتا باپ کے جنازے کے ساتھ ہو لیا اور پھر سیکڑوں لوگوں کی موجودگی میں فہیم کو سپردِ لحد کر دیا تھا۔

باپ کا سایہ سر سے اٹھ جانے کے بعد بچوں کا بھی کوئی پرسانِ حال نہیں رہا تھا۔ فہیم کی بہنیں چند روز بھائی کی موت کا سوگ منا کر واپس لوٹ گئیں تو گھر کی حالت آسیب زدہ سی ہو گئی۔

نادیہ راتوں کو چیختی چلاتی نیند سے بیدار ہو جاتی تھی اور قاسم کو تو جیسے چپ سی لگ گئی تھی۔ وہ کتاب کھول کر ہاتھ میں پکڑ لیتا تھا اور پھر اس کی آڑ میں گھنٹوں کسی گہری سوچ میں گم رہتا تھا۔ شروع شروع میں تو وہ اکثر فہیم کی قبر پر چلا جاتا تھا لیکن جب واپس لوٹتا تو اُس کی خوبصورت آنکھوں کی لالی اس بات کی چغلی کھاتی دکھائی دیتی کہ وہ باپ کے سرہانے بیٹھا روتا رہا ہے۔

ان مشکل حالات میں اگر کسی نے میرا بھرپور ساتھ دیا تو وہ صرف میرا ادارہ تھا۔ ہمارے مالک بہت خدا ترس انسان تھے۔ انہوں نے عدت کے دنوں میں نا صرف میری طویل رخصت منظور کی بلکہ تنخواہ اور دیگر الاؤنس میں بھی کسی قسم کی کمی نہ آنے دی۔ یقیناً یہ ایک ایسا نیک عمل تھا جس کا اجر انہیں خدا کے علاوہ اور کوئی نہیں دے سکتا۔

☆......☆......☆

عدت ختم ہونے کے بعد سب سے پہلے میں نے اپنی رہائش تبدیل کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس گھر میں ہر سو فہیم کی یادیں بکھری ہوئی تھیں۔ ہر چیز میں ہمیں ان کے لمس کا احساس ہوتا تھا۔ میں جانتی تھی کہ بچوں

کے لیے باپ کی یادوں سے چھٹکارا حاصل کرنا ممکن نہیں ہے۔ لیکن میں یہ بھی نہیں چاہتی تھی کہ میرے بچے اپنے ماضی کی یادوں میں کھو کر مستقبل سے غافل ہو جائیں۔

گھر کا انتظام ہو گیا تو اس سے اگلے روز میں نے قاسم اور نادیہ کو ہمراہ لیا اور ہم فہیم کی قبر پر پھولوں کا نذرانہ پیش کرنے کے لیے قبرستان روانہ ہو گئے۔

عدت مکمل ہونے کے بعد میں پہلی مرتبہ شوہر کی قبر پر جا رہی تھی۔ میرے ہاتھوں میں سنگ مرمر سے بنا ہوا ایک چھوٹا سا کتبہ تھا جس پر ''بیت الفہیم'' لکھا ہوا تھا۔ میں یہ کتبہ اپنے ہاتھوں سے فہیم کی قبر پر لگانا چاہتی تھی۔ اس لمحے میرے دل پر ناقابلِ بیان رقت طاری تھی اور ذہن میں اچھے دنوں کی یادیں کسی فلم کی طرح مناظر بدل رہی تھیں۔ لیکن جیسے ہی ہم تینوں قبرستان کے قریب پہنچے تو وہاں کا منظر دیکھتے ہی ہمارے ہوش اڑ گئے۔ وہ جگہ جہاں فہیم کی قبر ہوا کرتی تھی اس مقام پر سڑک کو کشادہ کرنے کے لیے بہت سی قبروں کو مسمار کیا جا چکا تھا۔

''یہاں تو قبر تھی میرے شوہر کی...... کیا ہے یہ سب۔ کہاں ہے میرے شوہر کی روئے زمین پر آخری نشانی۔''

یہ منظر دیکھتے ہی میں قریب کھڑے اس شخص پر برس پڑی جو مزدوروں کو کام جلدی نمٹانے کے لیے ڈانٹ ڈپٹ کر رہا تھا۔ میرے لہجے کی لڑکھڑاہٹ اور زرد پڑتی رنگت کو دیکھتے ہوئے اُس نے لمحہ بھر کے لیے توقف اختیار کیا اور نرم لہجے میں بولا۔

''مجھے آپ کے دکھ اور کرب کا احساس ہے۔ بہن جی۔ لیکن اس میں ہمارا کوئی قصور نہیں ہے۔ حکومت نے تو سال بھر پہلے ہی قبرستان انتظامیہ کو اس جانب مزید قبریں بنانے سے منع کر دیا تھا لیکن بد بخت گورکن لوگوں سے پیسے بٹور کر یہاں قبریں کھودنے سے باز نہ آئے۔ سڑک بننا بھی ضروری تھا لہٰذا چند روز قبل ہم نے ایک خصوصی اجازت نامے کے تحت قبر کشائی کر کے ان تمام کچے گھروں کے مکینوں کو قبرستان کی بائیں دیوار کے ساتھ منتقل کر دیا ہے۔ اس موقع پر جن قبروں کے ورثا کا علم قبرستان انتظامیہ کے ذریعے ہو سکا ان کو اطلاع بھی کر دی گئی تھی۔ آپ کے شوہر کی قبر یقیناً ان لوگوں میں شامل ہو گی جن کے بارے ہمیں کوئی سراغ نہ مل سکا۔''

یہ کہہ کر وہ آدمی قاسم کو منتقل کی جانے والی قبروں کی جگہ سمجھا کر وہاں سے رخصت ہو گیا۔

اس کے بعد تو جیسے مجھے کچھ یاد ہی نہ رہا۔ قاسم اور نادیہ مجھے سہارا دے کر اُن بے نام قبروں کے نزدیک لے گئے جو سب ایک سی دکھائی دے رہی تھیں۔ اُس لمحے میری حالت بہت عجیب تھی۔ آنکھیں خشک تھیں پر دل رو رہا تھا۔ سانس چل رہی تھی پر اپنے زندہ ہونے کا احساس کہیں کھو سا گیا تھا۔ میں دیکھ سکتی تھیں مگر ذہن کسی بھی منظر کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

درجن بھر تازہ قبروں میں سے ''بیت الفہیم'' کون سا تھا۔ شہر خموشاں کے ان گنت مکینوں میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں تھا جو اُس کی چوکھٹ تک میری راہنمائی کر سکتا۔

''کیسی قسمت لے کر پیدا ہوئے تھے ہم دونوں فہیم احمد...... ہم جیتے جی مر گئے اور تمہیں مرنے کے بعد بھی ایک گھر میں رہنا نصیب نہ ہو سکا۔''

یہ سوچ کر میں نے اپنے گھٹتے ہوئے دم کو بحال رکھنے کے لیے گہری سانس لی اور اُن سب قبروں پر تازہ پھول نچھاور کرنے لگی جن میں سے کوئی ایک گھر ''بیت الفہیم'' بھی تھا۔

☆☆......☆☆

اُس نے تھوک نگل کر خشک حلق کو تر کرنا چاہا، وہ بے پناہ بے بسی میں گھری ہوئی تھی۔ اُس کی خوبصورت سیاہ گھور آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ ہر طرف جیسے اندھیرا سا چھا گیا۔ اُس نے گھبرا کر سر اٹھایا تو آسمان پر گہرے سیاہ بادل......

ایک ایمان افروز، یادگار مکمل ناول

کشادہ وسیع مندر میں انسانوں کا جم غفیر دم سادھے بیٹھا تھا۔ تمام لوگ آنکھیں بند کیے، ہاتھ جوڑے مورتی کے سامنے احترام سے بیٹھے تھے۔

اتنے لوگوں میں صرف وہی تھی جو بیرونی دروازے کے پاس دیوار سے ٹیک لگائے، آرام دہ انداز میں بیٹھی، کبھی لوگوں کو اور کبھی سامنے موجود بڑی سی مورتی کو دیکھتی۔

وہ سب سے بے نیاز اپنے ہی دھیان میں بیٹھی تھی کہ ایک دم اُس نے دیکھا، سامنے آگ دہک اٹھی تھی، جو مورتی سے ہوتی ہوئی آہستہ آہستہ آگے بڑھ کر وہاں موجود لوگوں کو اور در و دیوار کو اپنی لپیٹ میں لے رہی تھی۔

وہ اٹھی اور دروازے سے باہر نکل کر بھاگنے لگی، اندھا دھند بھاگتے ہوئے اُس کے بال کھل کر پشت پر بکھر گئے تھے، سفید دوپٹا سر سے ڈھلک کر شانوں پر آ گرا تھا اور آدھا زمین پر گھسٹتا جا رہا تھا۔

وہ سر تا پا مکمل سفید لبادے میں ملبوس تھی، بھاگتے بھاگتے اُس کے ننگے پیروں کو کانٹے، پتھر لہولہان کر رہے تھے، مگر وہ ہر درد...... ہر تکلیف سے بے نیاز ہو کر بھاگ رہی تھی، معاً اسے کچھ غیر معمولی سا احساس ہوا تو وہ ہانپتے ہوئے رُک گئی۔

سانس بُری طرح پھولا ہوا تھا۔ اُس نے اپنے اطراف میں نگاہیں دوڑائیں، ہر طرف مٹی ہی مٹی تھی۔

تاحدِ نگاہ تک پھیلا صحرا، نہ کوئی انسان...... نہ چرند، پرند اور نہ ہی پیاس بجھانے کو پانی تھا۔ بری طرح سے ہانپتے ہوئے وہ زمین پر دو زانو سر جھکائے گرتی چلی گئی، سیاہ لمبے بال پشت اور جھکے چہرے کو مکمل چھپائے ہوئے تھے، شانوں پر پڑا دوپٹا تیز ہوا سے پھڑ پھڑا رہا تھا۔

اُس نے تھوک نگل کر خشک حلق کو تر کرنا چاہا، وہ بے پناہ بے بسی میں گھری ہوئی تھی۔ اُس کی خوبصورت سیاہ گھور آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ ہر طرف جیسے اندھیرا سا چھا گیا۔ اُس نے گھبرا کر سر اٹھایا تو آسمان پر گہرے سیاہ بادل چھا گئے تھے اور

دیکھتے ہی دیکھتے موٹی موٹی بوندیں برسنے لگیں جو تیز بارش میں بدلتی چلی گئیں۔
ہر سو چھاجوں مینہ برس رہا تھا۔ اُس تا حد نگاہ تک پھیلے صحرا میں وہ اکیلی تھی۔ اُس کے سوا کوئی ذی روح وہاں موجود نہ تھا۔
اُس نے منہ کھولا اور آسمان کی طرف آنکھیں بند کرکے چہرہ اٹھایا۔ پانی بے حد میٹھا تھا اور ٹھنڈا بھی ......وہ خوب سیراب ہوئی۔ اُس کی پیاس بجھ گئی تھی۔
اُس کی آنکھ کھلی تو وہ بری طرح ہانپ رہی تھی۔ چہرے پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے دمک رہے تھے۔
یہ کیسا سپنا دیکھا میں نے؟ بیڈ کراؤن سے ٹیک لگا کر بیٹھتے ہوئے وہ عجیب وغریب خواب کے متعلق سوچنے لگی۔ جس نے اُسے پریشانی میں مبتلا کر دیا تھا۔

☆......☆

کالج کے لیے تیار ہو کر وہ نیچے آئی، پورا گھرانا ڈائننگ ٹیبل پر ناشتے کے لیے موجود تھا، وہ بھی خاموشی سے اپنی مخصوص نشست پر بیٹھ گئی۔
سریندر سنگھ نے بیوی کی سمت سوالیہ انداز میں دیکھا۔ اُس نے کندھے اُچکا کر لاعلمی کا اظہار کیا۔
دیا نند سنگھ اور لکشمی کے درمیان بھی خاموش نظروں کا تبادلہ ہوا تھا۔ ہر ایک آج کل اُس کے اطوار کی تبدیلی پر چونک رہا تھا۔ پاس ہی دو مستعد اور مؤدب کھڑی ملازماؤں میں سے نسبتاً کم عمر ملازمہ آگے بڑھی۔
''میں خود لے لوں گی۔'' وہ نرمی سے مخاطب ہوئی۔
''جی چھوٹی بی بی۔'' نتاشا سر جھکائے ادب سے کہہ کر پیچھے جا کھڑی ہوئی۔ اُس نے گلاس میں جوس انڈیلا اور چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھرتی رہی۔
''وجیتا بیٹے طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' سریندر سنگھ نے محبت سے اکلوتی بیٹی کی طرف دیکھا۔
وہ خاموش رہی، جیسے کچھ سوچ رہی ہو۔

''رات کو میں نے عجیب سپنا دیکھا۔'' وہ کھوئے کھوئے سے لہجے میں کہتے ہوئے کچھ پریشان سی دکھائی دی۔
''سپنے تو ہر منش دیکھتا ہے، سپنے دیکھنا جیون کی نشانی ہے، اس میں اتنا فکر مند ہونے کی کیا ضرورت ہے۔'' وہ ہنسے، باقی سب نے بھی ہنس کر اس بات کو اُس کے بچپنے پر محمول کیا تھا۔ وہ خاموش رہی۔
''مس وجیتا، آپ کب سے اتنی بڑی ہوگئیں کہ سپنوں کے بارے میں سوچنے اور فکر مند ہونے لگی ہیں؟'' پرکاش نے اُس کے چمکتے سفید چہرے پر مسکراتی نظر ڈالتے ہوئے کہا تھا۔
''بڑی ہونے کا تو معلوم نہیں، پر سمجھدار ضرور ہوگئی ہوں۔'' اُس نے ناگواری سے جواب دیتے ہوئے اک تیکھی نظر پرکاش پر ڈالی تھی۔
''اوہ ریئلی!!'' اُس نے حیران اور خوش ہونے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے کہا۔ وجیتا کے ماتھے پر بل پڑ گئے، مگر وہ خاموش رہی۔
''نندنی! پریا سے کہو کالج سے لیٹ ہو رہے ہیں۔'' وہ کرسی دھکیل کر کھڑی ہوئی اور پلٹ کر درمیانی عمر کی ملازمہ کو مخاطب کیا۔
''بی بی جی! پریا بی بی کہہ رہی تھیں، آج وہ کالج نہیں جائیں گی۔'' وہ سر جھکائے ادب سے بولی۔
''او کے ایوری باڈی، پھر ملتے ہیں، گڈ بائے!''
اُس نے بیگ گلے میں لٹکایا اور ہاتھ ہلاتی پلٹ گئی، باقی سب جواب دے کر ناشتے کی طرف دوبارہ متوجہ ہوگئے تھے۔
پرکاش کی بے تاب نگاہوں نے وجیتا کے سیاہ گھور بالوں والے نازک سراپے کا، منظر سے غائب ہو جانے تک پیچھا کیا تھا۔

☆......☆

ٹھاکر گووند داس سنگھ گاؤں کے بلاشرکت غیر

سردار تھے۔ بڑی سی حویلی جو ضرورت مند افراد کے لیے ہر وقت کھلی رہتی۔ بے شمار زمینوں و جائیداد کے مالک ٹھاکر جی گاؤں کی مشہور اور نمایاں شخصیت تھے۔ راجپوت خون کی آن بان کے ساتھ وہ ایک اچھے انسان بھی تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ملازمین اور زمینوں پر کام کرنے والے بے شمار مزارعے ہر وقت اُن کی خدمت کے لیے چوکس رہتے۔ ٹھاکرائن بھی بھلی عورت تھیں، اُن کے دیہانت کے بعد حویلی کی وہ رونق تو ماند پڑ گئی تھی، مگر گاؤں کے لوگ اُن کو بھولے نہ تھے۔ اسی لیے اُن کے بعد بھی حویلی اور زمینوں کا خیال رکھتے تھے۔

سال میں ایک آدھ بار ٹھاکر کے دونوں بیٹے اور کبھی کبھار ساتھ میں بیوی بچے چھٹیاں گزارنے آجاتے۔ دونوں بیٹے اعلیٰ تعلیم یافتہ اور اچھے سرکاری عہدوں پر تھے اور بیوی بچوں کے ساتھ شہر کی بڑی کوٹھی میں مقیم تھے۔

بڑے بیٹے دیانند سنگھ کی بیوی لکشمی، بیٹا پرکاش اور بیٹی پریا، جبکہ چھوٹے بیٹے سریندر سنگھ کی ایک ہی اکلوتی بیٹی وجیتا جو پریا کے ساتھ کالج میں زیرِ تعلیم تھی۔

پرکاش تعلیم مکمل کر چکنے کے بعد فارغ تھا اور یہ فارغ وقت انجوائے کر رہا تھا۔ باپ اور چچا نے بھی اسی لیے بزنس میں ہاتھ بٹانے پر زور نہیں دیا تھا کہ کچھ ہی وقت میں جب ذمے داری پڑے گی تو آفس جوائن کر لے گا۔ یوں یہ خوشحال گھرانا ایک ساتھ زندگی کے دن بے فکری سے گزار رہا تھا۔

اس بات سے بے خبر کے اک قیامت اُن کی منتظر کھڑی تھی۔

☆......☆

وہ گھر کے بڑے کمرے میں موجود تھی، جو پوجا پاٹ کے لیے مخصوص تھا۔ بھگوان کی مورتی کے سامنے کھڑی وہ مسلسل اُسے تکتی جا رہی تھی۔

"پورا دیش ان مورتیوں کی پوجا کرتا ہے، کیا فائدہ ہوا اس کا؟ اپنے ہاتھوں سے بنا کر سجاتے، سنوارتے ہیں، اِدھر سے اُدھر لے کر آتے جاتے ہیں، ہم اِن کے نہیں اُلٹا یہ ہمارے محتاج ہیں...... کتنے بیوقوف ہیں ہم...... یہ دھرتی اور اس میں بستے منش، حیوان، ہم بے جان بتوں کو ان سب کی وجہ سمجھتے ہیں۔ میں اسی وقت اکیلے میں اِس مورتی کو ماروں تو کیا یہ مجھے سزا دے گی؟ یہ اپنی مدد کر سکے گی؟"

خود کو مجھ سے بچا پائے گی؟ وہ آگے بڑھی اور زور کا ہاتھ مورتی کو مارا...... ایک منٹ...... دو منٹ، کئی پل گزر گئے...... وہ انتظار کرتی رہی کہ مورتی اُس سے بدلہ لے یا اُس کو سخت سزا دے، مگر وہ اُسی طرح اپنی جگہ ایستادہ رہی۔ اُس کے کانوں میں اُس لڑکی کی آواز گونجی۔

"ابراہیمؑ کی قوم اور والد بت پرست تھی۔ آپؑ نے بہت سمجھایا، مگر نہ مانے۔ آپ نے موقع پا کر سارے بُت توڑ دیے، کلہاڑی اُس بڑے بت کے گلے میں لٹکا دی، تا کہ اُن لوگوں کا خیال بڑے بت کی طرف ہو۔"

لوگوں نے اپنے معبودوں (بتوں) کو ٹوٹے ہوئے دیکھا تو ابراہیمؑ سے باز پرس کی۔ آپؑ نے کہا، اپنے بڑے بت سے پوچھو اگر یہ بول سکتا ہے۔ پھر آپ نے کہا لوگوں! تم ہی بے انصاف ہو...... پھر وہ لوگ اوندھے ہو گئے سر جھکا کر، تُو تو جانتا ہے یہ لوگ (بت) بول نہیں سکتے۔ ابراہیمؑ نے کہا، میں بیزار ہوں اُس سے، جسے تم پوجتے ہو سوائے اللہ کے۔"

"تم چاہو تو سورۂ انبیاء میں یہ پورا واقعہ پڑھ سکتی ہو۔ حق کبھی نہیں چھپتا۔"

وہ اب جارحانہ تیور لیے آگے بڑھی اور مورتی کو ہیجانی انداز میں زور زور سے مارنے لگی۔

''بچاؤ خود کو! اگر تم بھگوان ہو تو، بچاؤ خود کو......
مجھے سزا دو، سزا دو مجھے...... تم سُن نہیں رہے؟ بدلہ لو مجھ سے!!''

وہ مورتی کو مارتے مارتے نڈھال ہوگئی۔ ہاتھ روکے اور دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

''کیسے بھگوان ہو تم۔'' وہ افسوس اور ملامت سے، دونوں ہاتھ اُٹھا کر مورتی کو تکتے ہوئے بولی۔

''وہ سہی کہتی ہے...... تم بھگوان نہیں، دھوکا ہو...... ہماری آنکھوں پر بندھی پٹی ہو تم! وہ روتے ہوئے نڈھال سی زمین پر دوزانو بیٹھ گئی تھی۔

پاربتی بیٹی کو ڈھونڈتی ہوئی آئی، اندر ذرا سا جھانک کر دیکھا، اکلوتی بیٹی مورتی کے سامنے گھٹنے ٹیکے سر جھکائے بیٹھی نظر آئی تھی۔ وہ خوشی سے مسکرائی۔

راجپوت خاندان کی نئی نسل اپنی ریت روایت اور مذہب سے دور نہیں رہے تھے۔ پڑھ لکھ کر، نئے دور میں داخل ہو کر بھی وہ اپنے بڑوں کے روایات پر عمل پیرا تھے۔ طمانیت بھری بھرپور مسکراہٹ چہرے پر سجائے وہ پلٹ گئی تھی۔

☆......☆

وہ تیزی سے سیڑھیاں اُترتی نیچے آئی، سامنے ہی پرکاش کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔

''جگر ما بڑی آگ ہے۔'' چنگھاڑتے ہوئے میوزک کی آواز باہر تک آرہی تھی۔

''بیہودہ شخص۔'' وہ نفرت سے زیر لب بڑبڑائی۔

ہاتھ میں بوتل پکڑے پکن سے نکلتے پرکاش نے آخری سیڑھی کے پاس کھڑی کزن کو بہت بے باکی سے دیکھا۔

لیمن کلر کا امبریلا شرٹ پاجاما اور ساتھ بڑا سا دوپٹا پہنے، اُس کا حسن دو آتشہ ہو رہا تھا۔ سادگی میں بھی وہ غضب ڈھا رہی تھی۔

پرکاش نے اُس کے پاس آتے ہوئے ہونٹ سیکڑ کر سیٹی بجائی۔

وجیتا نے اک نفرت بھری نظر اُس کے چہرے پر ڈالی تھی۔

''ہماری خوش بختی...... وجیتا دیوی نے آج اپنے درشن کروائے ہیں۔'' وہ خوشدلی سے ہنسا۔

کمرے کے کھلے دروازے سے بے ہنگم شور اب بھی بلند ہو رہا تھا۔ اس نے کچھ کہا نہیں، اک خاموش نگاہ سے پرکاش کے ہاتھ میں موجود بوتل کو دیکھا۔ اور اس کے دل میں اُس کے لیے نفرت مزید بڑھ گئی۔

''گھر کو جانے کیا سمجھ رکھا ہے اس گھٹیا شخص نے۔ آج تک بابا یا چچا نے یوں گھر میں کھلے عام شراب نہیں پی، اسے جانے کیوں اتنی کھلی چھوٹ دے رکھی ہے۔'' وہ اک شعلہ بار نظر اُس پر ڈال کر آگے بڑھ گئی۔

''آخر کب تک بھاگو گی وجیتا دیوی!'' وہ اس کی پشت کو گھورتا مسکرایا تھا۔

☆......☆

''سارہ تم سے کافی شرمندہ ہے، وہ معافی مانگنا چاہتی ہے۔'' فاطمہ جو وجیتا کی اسکول لائف سے فرینڈ تھی، اُس کے سامنے آئی۔

وجیتا نے اُس کے عبایا میں چھپے نازک و مصفا سراپے کو دیکھا۔

سیاہ دوپٹے کے ہالے میں اس کا صبیح چہرہ لو دے رہا تھا۔

باوجود دونوں طرف سے ہم مذہب لڑکیوں کے لعن طعن کے...... ایک ہندو اور ایک مسلمان لڑکی کیسے اک دوسرے کے لیے بہتر دوست ثابت ہو سکتی ہیں، مگر وجیتا اور فاطمہ بغیر مذہب کو درمیان میں لائے بہت خوبصورتی سے یہ پُرخلوص رشتہ نبھاتی چلی آئی تھیں اور اب بھی نبھا رہی تھیں۔

''معافی۔'' وجیتا نے اچنبھے سے فاطمہ کو دیکھا۔
''ہاں۔'' فاطمہ نے سر ہلایا۔
اُس کی خاموشی کو رضا مندی جان کر فاطمہ نے کچھ فاصلے پر کھڑی سائرہ کو اشارہ کیا۔
وہ تیزی سے پاس چلی آئی، مبادا وجیتا کا ارادہ بدل نہ جائے۔
''سوری وجیتا، میں نے تمہارا دل دکھایا، اللہ کہتا ہے کعبہ توڑ دو مگر کسی کا دل نہ توڑو، آئی ایم رئیلی سوری۔'' وہ بہت شرمندہ تھی۔
وجیتا بہت حیران ہوئی۔
''میں ناراض تو نہیں، بلکہ مجھے تو وہ بات یاد ہی نہیں تھی کہ ہمارے درمیان کوئی بات ہوئی تھی۔''
وجیتا کا لہجہ سچائی کا غماز تھا۔
''تم بہت اچھی ہو وجیتا سریندر سنگھ۔'' اُس نے خوش ہو کر وجیتا کا پورا نام لیا تھا۔
''اچھا؟ مگر میں تو سمجھی تھی کہ بہت بری ہوں میں۔'' وہ شرارت سے متبسم لہجے میں بولی۔
''اوہ تھینک یُو سو مچ، وجیتا تم نے مجھے معاف کر دیا، میں بہت خوش ہوں۔'' وہ والہانہ خوشی سے آگے بڑھی اور اُس کے گلے لگ گئی۔
فاطمہ نے حیران حیران سی وجیتا کو مسکرا کر دیکھا تھا۔

☆......☆

گھر آ کر بھی وہ اُلجھی اُلجھی اور حیران سی تھی۔
کیا اسلام اتنا ہی امن پسند اور محبت کرنے والا مذہب ہے۔
کتنی شرمندہ تھی وہ......اور جب میں نے اُسے معاف کیا تو کیسے بچوں کی طرح خوش ہوئی تھی۔ کتنی بڑی بات ہے خود کو غلط سمجھتے ہوئے دوسرے شخص سے معافی مانگنا، اپنی انا کو کچلنا۔ وہ صحیح لفظوں میں متاثر نظر آ رہی تھی۔
اُسے بے ساختہ وہ دن یاد آیا تھا۔

سائرہ، فاطمہ اور وجیتا کالج لان میں بیٹھی تھیں۔ مذہب اور اُس سے وابستہ دیگر چیزوں پر بات آئی تو وجیتا نے اپنے مذہب کا کمزور سا دفاع کیا۔ اس کا اپنے مذہب کی حمایت میں بولنا غضب ہو گیا، سائرہ جذباتی ہو گئی۔
''اسلام، عالمگیر، مکمل اور الہامی دین ہے، جبکہ ہندومت صرف ہندو قوم تک محدود ہے۔ اسلام توحید کا درس دیتا ہے، جبکہ ہندومت بت پرستی کا خواہاں ہے۔ ہمارے مذہب میں ہر قوم کے لیے پیغمبر آتے رہے، جبکہ تمہارے ہاں کوئی پیغمبر یا رہبر نہیں۔
محمد ﷺ جیسی شخصیت ہمارے رسولؐ اور اُن پر الہامی کتاب قرآن نازل ہوئی جو تا قیامت رہے گی۔'' اُس کا چہرہ غصے سے سرخ پڑ رہا تھا۔
وجیتا اُس کا طیش بھرا انداز ہکا بکا سی دیکھتی رہ گئی۔
''جبکہ تمہارے مذہب کی نام نہاد کتابیں چار ویدوں پر مشتمل......انسانی ہاتھوں کی لکھی ہوئی ہیں اور وقتاً فوقتاً ان میں تبدیلی کی جاتی ہے۔ اس میں عورتوں کو ثانوی درجے کی انسانی مخلوق کہا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ عورت ذات بے وفا، احمق اور منافق ہوتی ہے۔
اسلام عورتوں کو پورے حقوق اور میراث میں حصہ دیتا ہے، جبکہ ہندومت میں عورت کا کوئی حق ہے نہ میراث میں کوئی حصہ......'' وہ بولنے پر آئی تو بولتی چلی گئی۔
''خود پر قابو رکھو، کیا کہہ رہی ہو، ہوش میں آؤ!'' فاطمہ نے وجیتا کے دھواں ہوتے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے۔ سائرہ کو بازو سے پکڑ کر جھنجوڑتے ہوئے تنبیہ کی۔
''چھوڑو......میں کوئی جھوٹ نہیں بول رہی، اس میں کوئی بھی لفظ جھوٹا ہو تو یہ ثابت کرے۔'' اُس نے وجیتا سے نگاہیں ہٹا کر فاطمہ کو گھورا اور اپنا بازو اُس سے چھڑا کر دوبارہ وجیتا کی سمت رُخ موڑا۔

''ہمارے مذہب میں جانور کی پوجا نہیں کی جاتی، ہر حلال جانور ذبح کرنا جائز ہے، جبکہ ہندو مت میں نہ صرف گائے کی پوجا کی جاتی ہے بلکہ اُسے مقدس سمجھا جاتا ہے اور اُسے ذبح کرنا بھی گناہ سمجھا جاتا ہے۔ میں اگر مزید کہنے پر آئی تو تم اپنے کان بند کرلوگی...... یا اپنا منہ چھپالوگی۔'' اُس کے لہجے میں تضحیک کا عنصر شامل تھا اور اس آخری جملے کی تیزی پر اُسے بعد میں بہت افسوس ہوا تھا۔

وجیتا خاموشی سے اُسے دیکھتی رہی۔

''اب جواب دو......! کیوں، لاجواب ہوگئیں نا؟'' وہ تمسخرانہ ہنسی تھی۔

وجیتا اب بھی خاموش تھی۔

سائرہ منتظر تھی کہ وہ اپنا ردعمل دکھائے، مگر اُس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب وجیتا سکون سے اپنا بیگ اُٹھا کر آہستگی سے اُٹھی اور اُس کے پاس سے گزر کر چلی گئی۔

''افسوس ہے تم پر، یقین نہیں آتا، میری چچازاد بہن ہو۔'' وہ ملامت بھری نظروں سے اُسے دیکھتی تاسف سے بولی۔

''مجھے بھی افسوس ہے، شاید میں کچھ زیادہ ہی بول گئی۔'' اُس کا غصہ وجیتا کا تحمل دیکھ کر جھاگ کی طرح بیٹھ چکا تھا۔

''شاید نہیں میڈم! یقیناً آپ کچھ زیادہ ہی بول گئی ہیں۔'' وہ اُس کے کندھے پر دھپ رسید کرتے ہوئے بولی۔

''ویسے تقریر کافی اچھی تھی، کہاں سے سیکھی؟ بلکہ رٹی۔'' اُس نے سائرہ کو شرمندہ اور پریشان دیکھ کر بات بدلی۔

''کسی کتاب میں ہندو مذہب کے بارے میں پڑھا تھا، شکر ہے آج کام آگیا۔'' وہ بھی شرمندہ شرمندہ سی مسکرائی۔

''ڈھٹائی تو ملاحظہ کرے کوئی محترمہ کی!'' فاطمہ نے اُس کے جواب پر اپنا بیگ اُس کے کندھے پر مارا۔ سائرہ قہقہہ لگاتے ہوئے اُٹھی تھی۔

☆......☆

وہ آج کا واقعہ سریندر سنگھ سے شیئر کرنے آئی، جو اسٹڈی روم میں تھے۔

وجیتا کو دیکھ کر انہوں نے ہاتھ میں پکڑی کتاب سرعت سے دراز میں یوں چھپائی تھی گویا چوری کرتے پکڑے گئے ہوں۔

اُس نے اپنے بابا کے انداز میں کچھ غیر معمولی پن محسوس کیا، آج سے پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ انہوں نے وجیتا سے یا اُس نے سریندر سنگھ سے کوئی بات چھپائی ہو۔ اُس نے اپنے چچا اور پوری فیملی کے مردوں سے اپنے باپ کو ہمیشہ مختلف مزاج کا دیکھا تھا۔

وہ بہت متحمل مزاج اور اچھے انسان تھے۔ عام مردوں کی سی تیزی کبھی اُن کے مزاج کا حصہ نہ رہی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وجیتا اپنے باپ سے بے حد قریب تھی۔

رسمی باتوں کے بعد وجیتا نے اُن کو سائرہ کی معافی کا بتایا، باقی کی روداد وہ پہلے ہی اُس کی زبانی سُن چکے تھے۔

''میں نے اپنے پورے جیون میں جتنے بھی مسلمان دیکھے، اُن کا اخلاق بہت بلند دیکھا، سائرہ نے بھی جو کچھ کہا، وہ مذہب اسلام کا خاصہ ہے۔ اسلام امن پسند اور محبت وعزت دینے والا مذہب ہے۔ مجھے فخر ہے کہ میری بیٹی کو اتنے اچھے دوست ملے۔ میری اِچھا ہے وہ تمہارے اخلاق سنوارنے میں ضرور مدد دیں گے۔'' اُن کے لہجے میں سچائی کا بھرپور عکس تھا۔

وجیتا پر آج حیرت در حیرت کے راز منکشف

ہو رہے تھے۔ سائرہ کی معافی اور پھر اُس کے باپ کا دوسرے دھرم کی حمایت میں بولنا۔

''چچا اور باقی فیملی ممبر تو مسلمانوں کو بہت بُرا اور گھٹیا کہتے ہیں کہ وہ دہشت گردی کا پرچار کرنے والے خود سر منش ہیں، اُن کو بہت برے طریقے سے یاد کرتے ہیں۔'' وہ واقعی حیرت زدہ تھی۔

''میں کیا کہہ سکتا ہوں، ہر منش اپنی سوچ میں خود مختار ہے، ہم کسی کی سوچ پر پہرہ تو نہیں بٹھا سکتے۔ ہمیں خود کو اور اپنی سوچ کو سدھارنا چاہیے اور لوگ کیا کہتے ہیں اس سے سروکار نہیں رکھنا چاہیے۔'' انہوں نے اپنی معصوم اور الجھی الجھی سی بیٹی کا چہرہ تھپتھپایا اور بہت خوبصورتی سے مبہم سا جواب دیا تھا۔

☆......☆

''پریا مجھے لگتا ہے، میں وجیتا کو چاہنے لگا ہوں، ہر وقت اُسے ہی سوچتا ہوں، کیا یہ پیار نہیں؟'' پرکاش بہن کے سامنے بیٹھا اپنی بدلی ہوئی کیفیات بیان کر رہا تھا۔

''تمہیں ہر دوسرے مہینے کسی خوبصورت لڑکی سے چاہت ہو جاتی ہے یہ کوئی نیا مرض تو نہیں۔'' وہ اک پل کے لیے موبائل سے توجہ ہٹا کر اُس کی طرف تمسخرانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

''وہ تو ٹائم پاس ہوتا ہے، اب کی بار معاملہ الگ ہے۔'' اُس نے معصومیت سے اپنی مجبوری بیان کی۔

وجیتا پریا سے ملنے آئی تھی، مگر اپنا نام سُن کر دروازے میں رُک گئی۔

''وہ تمہارے دام میں آنے والی نہیں۔'' وہ لاپروائی سے بولی۔

''کیا کمی ہے مجھ میں؟ ہینڈسم ہوں، اسمارٹ ہوں اور سب سے بڑھ کر اُس کا کزن ہوں۔'' اب کے اُس کے لہجے میں واضح غرور جھلکا۔

''کمی تم میں نہیں، میرے بھائی!'' وہ سیدھی ہوئی، موبائل سے توجہ ہٹا کر مکمل پرکاش کی طرف مرکوز کی تھی۔

''اس میں یہ خوبی ہے ہی نہیں، بہت سیدھی اور معصوم ہے، اپنی کزن۔ اس میں اگر اتنے گٹس ہوتے تو اب تک ایک چھوڑ دس کو پھانس چکی ہوتی، مگر افسوس کے اُس میں یہ اضافی خوبی ہے ہی نہیں، سو اُس پر اپنا وقت ضائع مت کرو!'' اُس نے مخلصانہ مشورہ دیا۔

''ہونہہ! اِن اضافی خوبیوں کے لیے تم ہی کافی ہو!'' پرکاش کا انداز صاف مذاق اُڑانے والا تھا۔ پریا طیش میں آ گئی۔

''میں اس معاملے میں تمہاری مدد نہیں کر سکتی۔'' اُس نے صاف ہری جھنڈی لہرائی اور دوبارہ دراز ہو کر موبائل کی طرف متوجہ ہو گئی۔

وجیتا کے پورے وجود میں غصے اور نفرت کی اک تیز لہر اُٹھی۔ وہ غم و غصے کی کیفیت میں پیر پٹختی اپنے کمرے کی طرف چلی گئی تھی۔

☆......☆

فاطمہ اور وجیتا کالج کے کینٹین میں بیٹھی تھیں۔ وہ جوس پیتی فاطمہ کو عجیب سی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

اُس کی نظروں کا ارتکاز اپنے چہرے پر محسوس کرتی فاطمہ کا جی چاہا اُس سے وجہ پوچھ لے، مگر وہ مصلحتاً خاموش رہی۔

''تمہارا مذہب اور کیا کہتا ہے؟'' وجیتا کی آواز بہت دھیمی تھی۔ جوس پیتی فاطمہ نے حیرت سے گلاس ٹیبل پر رکھ کر اُسے دیکھا۔

''تمہارا دھرم نئے آنے والوں کو کیا پیغام دیتا ہے؟'' اُس نے ایک اور سوال کیا، شاید فاطمہ کی خاموشی کو سوال نہ سمجھنے پر محمول کیا تھا۔

''میں کوئی عالم فاضل نہیں کہ تمہیں صحیح دلیل دے سکوں۔'' وہ حد درجہ عاجزی سے بولی۔

''کچھ تو کہہ سکتی ہو، تمہارا دھرم کیا کہتا ہے، تمہارا پیغمبر کیا کہتا ہے؟ یا الہامی کتاب کیا کہتی ہے؟'' وہ سکون سے بولی۔

فاطمہ کچھ دیر پُرسوچ نظروں سے اُس کے چہرے کی طرف دیکھتی رہی۔

''ہمارا دین کہتا ہے......!''

''کوئی غیر مسلم اگر مسلمان ہوجائے، اسلام میں داخل ہونے کے بعد وہ یوں گناہوں سے پاک ہوجاتا ہے گویا اُس کی ماں نے اُسی وقت اُس کو جنا ہو۔ میں زیادہ کچھ نہیں کہوں گی، قرآن کی سورۂ بقرۃ کی ایک آیت کا ترجمہ ہے، بہت خوبصورت وہ غور سے سُن لو، شاید تمہیں سمجھنے میں آسانی ہو۔

''دین کے بارے میں کوئی زبردستی نہیں، تحقیق سے واضح ہوچکا ہدایتِ گمراہی سے، اس لیے جو شخص اللہ کے سوا دوسرے معبودوں کا انکار کرے اور اللہ پر ایمان لائے، اُس نے تھام لیا مضبوط رسی کو، جو کبھی نہ ٹوٹے گی، اللہ تعالیٰ سُننے اور جاننے والا ہے۔'' اُس نے ٹھہر ٹھہر کر واضح الفاظ میں بیان کیا، تاکہ وہ آسانی سے سمجھ سکے۔

وجیتا کو اپنا آپ ''رائی'' کی طرح ہلکا محسوس ہوا تھا۔ اُس کے لب اضطراری انداز میں ہلے تھے۔

''جو اللہ پر ایمان لائے، اُس نے تھام لیا مضبوط رسی کو، جو کبھی نہ ٹوٹے گی۔''

کیا پایا ہے میں نے آج تک کی زندگی میں؟ حق یہ ہے، تو میں کیا کرتی رہی؟ ہمیشہ سوچتی تھی جن کو ہم پوجتے ہیں وہ بے جان مورتیاں بھلا کیسے اتنی بڑی دھرتی کا نظام چلا رہی ہیں؟ آج مجھے جواب مل گیا، سب دھوکا تھا، میری آنکھیں بند تھیں، جو آج کھلی ہیں۔

اُس کی جھیل سی خوبصورت آنکھیں پل میں نم ہوئی تھیں۔

''فاطمہ مجھے تمہاری مذہبی کتاب چاہیے، میں پڑھنا چاہتی ہوں۔'' وہ نگاہیں جھکائے بھرّائی ہوئی آواز میں بولی تھی۔

''آج ہی لائبریری سے اپنے نام پر ایشو کروا کے دے دوں گی۔'' فاطمہ نے اپنی والہانہ خوشی پر قابو پاتے ہوئے کہا تھا۔

☆......☆

''جب دیکھو اک نئی گرل فرینڈ تمہارے ساتھ ہوتی ہے، لڑکیاں تمہارے آگے پیچھے پروانوں کی طرح منڈلاتی ہیں اور تم سے کل کی اک چھوکری نہیں سنبھالی جاتی، وہ تمہیں تگنی کا ناچ نچا رہی ہے اور تم ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہو، شرم کرو پرکاش۔ میرے اور دیانند سنگھ کے بیٹے تو کہیں سے نہیں لگتے تم، ہم سے ہی کچھ سبق سیکھ لو، کیسے بھائی صاحب کو بیوقوف بنا رکھا ہے۔'' لکشمی بیٹے پر غصہ نکالتے ہوئے بولی تھی۔

''تو میں اور کیا کروں؟ اُس نواب زادی کے آگے پیچھے پھرتا ہوں، مگر وہ ہے کہ پروں پر پانی ہی نہیں پڑنے دیتی۔'' وہ بےزار سے لہجے میں گویا ہوا۔

''کیسے مرد ہو تم؟ منواؤ اپنے آپ کو، تمہاری رگوں میں راجپوت خون بسا ہے، آج کے بعد میں یہ بزدلوں والی باتیں ہرگز نہ سنوں، مرد ایسے منمناتے ہوئے بالکل اچھے نہیں لگتے، میں تمہیں دیانند سنگھ کی طرح گرجتے برستے دیکھنا چاہتی ہوں، اُس جیسے دبنگ مرد بنو، اپنی منواؤ، سمجھے؟'' لکشمی نے بیٹے کے کندھے میں انگلی چبھوتے ہوئے طیش بھرے انداز میں کہا تھا۔

اسٹڈی روم کی طرف جاتے سریندر سنگھ نے اپنے بڑے بھائی کی بیوی کی زبان سے اُگلتا ہر نشتر اپنے سینے پر سہا تھا۔

بھائی کی فطرت سے وہ آگاہ تھے، مگر یوں بڑی بھابی اپنی اولاد کو بھی اُن کے آگے لاکھڑا کرے گی، اُن کے وہم وگمان میں بھی یہ بات نہ تھی۔

''میں ہرگز اپنی اکلوتی معصوم بیٹی کو ان کا شکار نہیں بننے دوں گا۔'' وہ سینے میں اُٹھتی ٹیسوں کو دباتے، برداشت کرتے نڈھال سے قدموں پر اسٹڈی روم کی سمت روانہ ہوئے تھے۔ اپنوں کی بے وفائی یونہی بغیر جنگ کے شکستگی سے دوچار کر دیتی ہے۔

☆......☆

آج راکھی کا تہوار تھا۔ مندروں، گھروں اور لوگوں کی سجاوٹ دیکھنے لائق تھی۔ ٹھاکر گووند داس سنگھ کا پورا پریوار مندر میں جمع خوشیاں منا رہا تھا۔

ہر طرف رنگین آنچل لہرا رہے تھے، پرکاش کی بے تاب نظریں اُس پری پیکر کو ڈھونڈ رہی تھیں، کچھ ہی دیر میں وہ اُسے نظر آ گئی تھی۔

اپنی ہم عمر لڑکیوں کے سنگ ڈارک گرین کلر کا خوبصورت لباس زیب تن کیے باتوں اور ہنسی میں مگن تھی۔

وہ آج پہلی بار سجی بنی تھی یا پرکاش نے اُسے پہلی باریوں سجے سنورے روپ میں دیکھا تھا۔ وہ سمجھ نہ سکا، مگر اُس کا دو آتشہ حسن، سج سنور کر مزید نگاہوں کو خیرہ کر رہا تھا۔

''وجیتا دیوی!'' وہ پاس آ کر پکارا، اُس نے بے اختیار مڑ کر دیکھا اور جیسے بجلیاں سی چمکی تھیں۔

''بہت سُندر لگ رہی ہو۔'' وہ بے خود سا بولا۔

''جی بھیا! کچھ کہنا تھا؟'' وہ اُس کی بات سُن کر بھی انجان بنی۔

''کتنی بار کہا ہے مجھے بھیا مت کہا کرو۔'' لفظ بھیا سُن کر اُس کا حلق تک کڑوا ہو گیا تھا۔ وہ ناگواری سے بولا۔

''پریا بھی تو آپ کو بھیا کہتی ہے۔'' وہ حد درجہ معصومیت سے بولی۔

''وہ اک الگ بات ہے۔'' اُس نے غصے پر قابو پاتے بمشکل تحمل سے جواب دیا۔

(الگ بات کے بچے، ابھی تمہیں مزہ نہ چکھایا تو میرا نام وجیتا نہیں)

''مجھے آپ کو ایک سرپرائز دینا ہے۔'' وہ کھولتے دماغ پر قابو پاتے ہوئے بولی تھی۔

''کیسا سرپرائز؟'' وہ حیران ہوا۔

''آپ پہلے آنکھیں بند کریں اور اپنا ہاتھ آگے لائیں، پھر بتاؤں گی۔'' اُس نے مسکرا کر سادگی سے کہا تھا۔

''ہے بھگوان! کہیں میں کوئی سپنا تو نہیں دیکھ رہا؟'' اُس نے بے یقینی سے وجیتا کے خوبصورت چہرے کو دیکھا۔ وہاں مذاق کا کہیں شائبہ تک نہ تھا۔ پرکاش کا دل خوش فہمی کے گرداب میں ہچکولے لینے لگا۔

(ممی آ کر دیکھیں آپ کا بیٹا اتنا بھی ناکارہ نہیں، لڑکی خود ہی لائن پر آ گئی، بغیر معرکے کے میں نے میدان مار لیا ہے)

''یہ چیٹنگ ہے بھئی، آنکھیں بند کریں۔'' وہ بچوں کی طرح اٹھلا کر بولی۔

پرکاش تو بے ہوش ہونے کے قریب تھا، اُس کی ادائیں دیکھ کر...... اُس نے مسکرا کر آنکھیں بند کیں اور اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔

وجیتا نے پرکاش کی بند آنکھوں اور پھر اپنے سامنے پھیلی اُس کی سرخی چھلکاتی ہتھیلی کو دیکھا اور اُس کی کلائی پر کچھ باندھنا چاہا، یک دم پرکاش کے مسکراتے نقوش تن گئے، اُس نے ہونٹ بھینچ کر آنکھیں کھولیں۔

وجیتا اُس کی کلائی پر راکھی باندھ رہی تھی۔

پرکاش کی آنکھوں میں جیسے خون اُتر آیا۔ اُس نے جھٹکے سے وجیتا کے ہاتھ سے راکھی چھینی اور دور پھینک دی۔

''ایسی غلطی آج تم نے کر دی، آئندہ میں برداشت نہیں کروں گا۔ تمہیں میری بہن نہیں، پتنی بننا ہے، سمجھیں!'' وہ اُس کے بالکل نزدیک کھڑا آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر غرایا تھا۔

''ایسا کبھی نہیں ہوگا!'' ایک پل کے لیے وجیتا کو اُس کی لہو چھلکاتی آنکھوں سے خوف محسوس ہوا تھا، مگر وہ نڈر بن کر بولی۔

''سالی!'' وہ دانت پیستا، اُس کی سمت بڑھا، وجیتا خوفزدہ ہوکر دور بھاگی تھی۔

پاس کھڑی لڑکیوں نے اُسے عجیب سی نظروں سے دیکھا، وہ خجل ہوتا، اپنا ہاتھ نیچے کرگیا۔

''اس سے تو میں پھر نمٹ لوں گا۔ سالی (موٹی سی گالی) نے سارے موڈ کا ستیاناس کردیا۔'' اُس نے اطراف میں نظریں دوڑائیں۔ وجیتا کہیں نظر نہ آئی۔

''کب تک چھپوگی وجیتا دیوی! آخر کو میرے پاس ہی آنا ہے، جتنے نخرے دکھانے ہیں ابھی دکھا دو، سارے کس بل نہ نکال دیے تو میرا نام پرکاش اور میرا خون دیانند سنگھ کا خون نہیں۔'' اُس کا دماغ بری طرح کھول رہا تھا۔

☆......☆

ایسا کیا ہے اس کتاب کے ہر لفظ میں جو دل کو اپنی طرف کھینچتا ہے، ہر صفحہ، ہر لفظ، ہر جملہ سحر زدہ کردیتا ہے۔ اتنے متاثر کن الفاظ جو دنیا کی کسی کتاب میں نہیں دیکھے، ہماری وید میں بھی نہیں۔'' اُس نے بند کتاب کی مضبوط جلد پر ہاتھ پھیرتے سوچا اور ایک جگہ سے کھولا۔ وہ آیت الکرسی کے الفاظ تھے۔

''اللہ تعالیٰ ہی معبود برحق ہے، جس کے سوا کوئی معبود نہیں، جو زندہ اور سب کا تھامنے والا ہے، جسے اونگھ آتی ہے، نہ نیند، اُس کی ملکیت میں زمین اور آسمان کی تمام چیزیں ہیں۔'' وہ بے خودی کے عالم میں سحر زدہ سی پڑھتی رہی۔

''اُس کی کرسی کی وسعت نے زمین و آسمان کو گھیر رکھا ہے اور اللہ تعالیٰ اُن کی حفاظت سے نہ تھکتا ہے نہ اُکتاتا ہے، وہ تو بہت بلند اور بڑا ہے۔''

اُس کے دل کی عجیب سی کیفیت ہورہی تھی، جو الفاظ میں بیان کرنا ناممکن سی تھی۔ کتاب بند کرکے وہ ہچکیوں سے رونے لگی۔

فاطمہ نے اُس سے کہا تھا۔ ''قرآن کے جملے مبہم اور مختصر ہوتے ہیں جو عموماً مسلمانوں کو بھی بغیر معلم یا ترجمے کے ساتھ سمجھ نہیں آتے، اُن کے ساتھ واضح دلیل یعنی تفسیر سُن کر یا پڑھ کر ہی سمجھا جاتا ہے، تم کو پہلے پہل کچھ مشکل ہوگی، بعد میں خود ہی آسانی ہوتی جائے گی۔ ہمارا دین دلیل کا دین ہے، ایسے دلائل جو کسی کو بھی لاجواب کردے اور یہ دین اسلام کا ہی خاصہ ہے جو کہیں اور تمہیں ہرگز نہیں ملے گا۔ میری ایک ہی نصیحت ہے، کبھی ہمت نہ ہارنا، بہت کٹھنائیوں اور تکلیفوں کے بعد بالآخر جیت تمہاری ہی ہوگی اور منزل تمہارے قدموں تلے، بس ہمت نہ ہارنا۔''

بہت سارا رونے کے بعد اُسے پیاس لگی تو اٹھ کر کچن کی سمت پانی پینے چلی آئی۔

وہاں پرکاش کو موجود دیکھ کر وہ واپس جانے کے لیے پلٹی۔ وہ اُسے دیکھ چکا تھا، تیزی سے اُس کی سمت آیا۔

''مجھ سے کہاں بھاگتی پھر رہی ہو سوئٹی؟'' اُسے کلائی سے پکڑ کر اپنی طرف موڑتے وہ اُسے گہری نظروں سے تکتے ہوئے بولا تھا۔

وجیتا کو اُس کی بے باک نظریں اپنا جسم چھیدتی ہوئی محسوس ہوئی تھیں۔

''چھوڑو مجھے گھٹیا انسان!'' وہ نفرت سے کہتے، اپنا ہاتھ چھڑانے لگی، مگر مقابل کی گرفت سخت تھی۔

اُس کی بات پر پرکاش نے اُس کی کلائی پر اپنا ہاتھ اتنا سخت کیا تھا کہ وجیتا کو لگا اُس کے ناخن اُس کی کلائی کو خون آلود کردیں گے۔ تکلیف کی شدت سے وجیتا کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

''میری بات کیوں نہیں مان لیتیں تم؟ نہ تمہیں

تکلیف ہوگی نہ مجھے!" وہ عجیب سے لہجے میں بولا تھا۔
"نفرت ہے مجھے تم سے۔" حقارت سے کہتے اُس نے زمین پر ایک طرف تھوکا تھا۔ اُس کی یہی حرکت پرکاش کو آگ بگولہ کرنے کے لیے کافی تھی۔
"سالی! جانتا ہوں، کون تمہاری برین واشنگ کر رہا ہے۔ اچھی طرح سے جانتا ہوں...... وہ سالی مُسلے کی اولاد" وہ اُسے بالوں سے پکڑ کر غرایا تھا۔ بالوں کی تکلیف سے زیادہ اپنی پیاری دوست کے لیے ایسے الفاظ اُسے زیادہ تکلیف دے گئے تھے۔
"تمیز سے یاد کرو اُسے، مُسلے کی نہیں، ایک مسلمان کی بیٹی ہے وہ...... اور میری بہترین دوست۔" تکلیف اور بے بسی کے احساس سے وہ رو پڑی۔
"وہ سالے مُسلے تمہارے کیا لگتے ہیں، جو اتنی طرف داری کر رہی ہو اُن کی؟" اُس نے وجیتا کے مٹھی میں جکڑے بالوں کو جھٹکا دیتے ہوئے کہا تھا۔
"تمہیں کوئی حق نہیں مجھ سے، جانچ پڑتال کرنے کا، مجھے تمہارے منہ نہیں لگنا، نفرت ہے مجھے تم سے...... تم ایک انتہائی جاہل شخص ہو۔" وہ شدتِ ضبط سے آنکھیں بند کیے نفرت سے بولی۔
چٹاخ! پرکاش نے پورے ہاتھ کا تھپڑ اُس نازک سی لڑکی کے حسین چہرے پر مارا تھا۔ وہ دور جا گری تھی۔
پرکاش اسے مزید زدوکوب کرنے کو آگے بڑھا ہی تھا کہ پاربتی کچن میں داخل ہوئی تھی۔ ایک پل کے لیے تو پرکاش سناٹے میں رہ گیا تھا۔ پاربتی جو گنگ رہ گئی تھی، تیزی سے اکلوتی بیٹی کے پاس آ کر اُسے سینے سے لگایا تھا۔
"یہ سب کیا ہے پرکاش بیٹے؟" حیرت، دکھ، بے یقینی، صدمہ کیا کچھ نہ تھا اُن کے لہجے میں۔
وہ حیرت کی زیادتی سے اور کچھ کہہ ہی نہ پائی تھی۔
پرکاش کی ایک پل کی شرمندگی، ڈھٹائی میں بدل چکی تھی۔
"سمجھا دو اپنی بیٹی کو، میری بات سکون سے مان لے، وگرنہ مجھے اپنی بات منوانا آتی ہے۔" وہ انگلی اُٹھا کر وارننگ دیتا، باہر جا چکا تھا۔
پاربتی بے چاری پرکاش کا یہ روپ دیکھ کر صحیح معنوں میں صدمے سے دوچار ہوگئی تھی۔ ابھی تک وہ یہ صورتحال سمجھنے سے قاصر تھی۔ وہ وجیتا سے بھی نہیں پوچھ سکتی تھی جو خوف سے کانپتے ہوئے مسلسل ہچکیوں سے رو رہی تھی۔
اپنوں کے پل پل بدلتے روپ اُن کے سامنے آ کر انہیں ہولا رہے تھے۔ پاربتی نے اُسے خود میں سمو کر جیسے اُن بہروپیے لوگوں سے چھپانا چاہا تھا۔

☆......☆

بعض اوقات سگے رشتے لالچ کی نذر ہو جاتے ہیں۔ لالچ، پیسے کی مزید ہوس سگے بھائیوں کے درمیان دیوار کھڑی کر دیتی ہے۔ ایک بھائی سے دوسرے بھائی کا سر کٹوا دیتی ہے۔ ایسے خونی رشتوں کی مثال سانپ کی سی ہوتی ہے، جو اپنے ہی بچوں کو کھا جاتا ہے۔
بہت بدنصیب ہوتے ہیں وہ لوگ جو ان خوبصورت رشتوں کو لالچ اور ہوس کی نذر کر دیتے ہیں۔ شدتِ ضبط سے سریندر سنگھ کی آنکھ کے گوشے سرخ ہوئے تھے۔ وجیتا باپ کے کشادہ سینے سے لگی، بے آواز رو رہی تھی۔
پاربتی کی آنکھیں بھی دُکھ سے نم ہوئیں۔ وہ ایسی وفادار اور سادہ سی عورت تھی، جس کی زندگی اپنے پتی کے نام سے ہی آباد تھی۔ پتی اور بیٹی کے سکھ میں ہی اُن کا سکھ پنہاں تھا۔
"جب تک میں کوئی بندوبست نہ کرلوں، ہم لوگوں کو اُن سے نباہ کرنا ہوگا، ہمارا پریوار، بزنس، جائیداد سب فی الحال مشترک ہے، جب تک میں

آہستہ آہستہ یہ سب کچھ اپنی بیٹی کے نام نہ کر دوں، ہمیں تب تک اُن کا ہر حکم ماننا ہوگا، بھائی دیانند سنگھ لالچ میں آچکے ہیں، اب کوئی طاقت اُن کو پیچھے نہیں ہٹا سکتی، وہ کچھ بھی کر گزریں گے، اگر اس لالچ میں ہماری جان لینی پڑی تو وہ اس سے بھی دریغ نہیں کریں گے...... وجیتا، پاربتی غور سے سنو میری بات...... ہر حال میں ہمیں خاموش رہنا ہے، اُن پر ظاہر نہیں کرنا کہ ہم اُن کی اصلیت جان چکے ہیں۔'' وہ سمجھاتے ہوئے بولے تھے۔ انہوں نے سر اثبات میں ہلا کر بے بسی سے ایک دوسرے کو دیکھا تھا۔

☆......☆

''پرکاش نے جیون اکارت کر دیا ہے۔ اپنے گھر میں آزادی سے چلتے پھرتے ہوئے ڈر محسوس ہوتا ہے، میرے ماں باپ مشکل میں ہیں، عجیب بے بسی ہے، سمجھ نہیں آتا، کیا کروں؟ کیسے ان لوگوں سے جان چھڑاؤں؟'' وہ فاطمہ کو اپنی پریشانی سناتے ہوئے رو پڑی۔

اپنی کم گو، اچھی اور حساس سی دوست کی یہ حالت دیکھ کر فاطمہ کا دل کٹ کر رہ گیا تھا۔

زندگی بھی کیسے کیسے رنگ دکھاتی ہے۔ اچھا بھلا انسان بوکھلا کر رہ جاتا ہے۔

''دُعا اور تسلی دینے کے سوا میں تمہارے لیے اور کیا کر سکتی ہوں...... کل میں نے ایک کتاب پڑھی، آپ کی ذاتِ اقدس کے بارے میں تھی۔ وہ واقعہ میں پہلے بھی پڑھ چکی تھی، مگر کل اُسے دوبارہ پڑھ کر میرے دل کی عجیب کیفیت ہوگئی تھی۔

''آپؐ جیسے جلیل القدر پیغمبر، جن کی محبت نے اللہ سے زمین و آسمان کی تخلیق کروائی، دونوں جہانوں کے سردار جب اُن پر اتنا کچھ بیتا، تو ہم تو بہت چھوٹے اور گناہ گار لوگ ہیں۔''

وحشی آپؐ کے پیارے چچا کا قاتل، حضرت حمزہؓ سید الشہداء بھائی بھی تھے دودھ شریک دونوں ہم عمر بھی تھے۔

حمزہؓ کے ایمان لانے پر پہلی نماز حرم میں پڑھی گئی۔ وہ شیر نڈر اُحد کی لڑائی میں شہید ہوئے، ناک کٹ گئی، کان کٹ گئے، کلیجہ چیر دیا گیا، آنتیں چیر دی گئیں، کلیجہ ہندہ نے چبالیا۔ آپ نے چچا کو تلاشا زندوں میں نہیں تھے، زخمیوں میں بھی نہیں تھے۔ آپؐ نے پوچھا تو کسی نے بتایا کہ شہید ہوگئے۔

آپ آئے، اُن کی حالت دیکھی تو اتنا روئے کہ ہچکیاں بندھ گئیں، صحابہ کرامؓ بھی رونے لگے۔

جبرئیل علیہ السلام آئے فرمایا، ''اللہ فرماتا ہے آپ نہ روئیں، ہم نے عرش پہ لکھ دیا ہے سید الشہداء حمزہؓ۔'' ایسا غم تھا کہ آپؐ نے ستر دفعہ نماز جنازہ پڑھائی اور پھر وہی چچا کا قاتل آپؐ کے پاس آیا، صحابہؓ قتل کرنے کو آگے بڑھے تو آپؐ نے روک دیا۔

''پیچھے ہٹ جاؤ، ایک آدمی کا کلمہ پڑھ لینا مجھے ہزار کافروں کو مارنے سے زیادہ محبوب ہے۔'' وہ منہ چھپاتا مدینے آیا، آپؐ سے ملاقات کی اور اسلام قبول کیا، آپؐ نے اُسے معاف کر دیا۔

سات برس گزر چکے تھے۔ آپؐ کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ غم تازہ تھا، آپؐ نے اُس سے کہا۔

''میرے سامنے مت آیا کرو، میرا غم تازہ ہوتا ہے۔'' فاطمہؓ نے نم آنکھیں جھکا لی تھیں۔

وجیتا نے بہت تحمل سے، بہت دھیان سے اک اک لفظ سُنا تھا۔ وہ زمین و آسمان کے درمیان معلق تھی۔

اُس کی کیفیت اُس وقت کیا تھی وہ خود سمجھنے سے قاصر تھی۔ بہت سے پل خاموشی کی نذر ہوئے۔

''مجھے وہ کلمہ پڑھاؤ، جو آپ کو ہزار کافروں کے مارنے سے زیادہ محبوب ہے۔'' وہ کھوئے کھوئے لہجے میں فاطمہ کے چہرے کو دیکھتے ہوئے بولی۔ اُسے وجیتا کی آواز گہری کھائی سے آتی

محسوس ہوئی تھی۔ فاطمہ نے نم پلکیں اٹھا کر بے یقینی سے اُس کو دیکھا۔

وہ اب بھی منتظر سی بھیگی آنکھوں سے فاطمہ کو دیکھ رہی تھی۔ اُسے فاطمہ کا چہرہ دُھند میں لپٹا غیر واضح محسوس ہوا تھا۔

''لا الہٰ الاّ اللہ۔'' فاطمہ کسی غیر مرئی طاقت کے زیر اثر گویا ہوئی۔ وجیتا نے اُس کی تقلید کی۔ فاطمہ نے کلمے کا دوسرا حصہ پڑھا۔

''محمد رسول اللہ۔'' وہ جذب سے بولی، آنکھ سے آنسو پھسلا۔ فاطمہ اب ترجمہ دُہرا رہی تھی۔

''نہیں کوئی معبود سوائے اللہ کے، محمدؐ اللہ کے بندے اور رسول ہیں۔'' وجیتا اُس کے پیچھے الفاظ دُہرا کر رو پڑی۔

فاطمہ کو کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ اچانک یہ کیا سے کیا ہو گیا تھا، خود وہ صورتحال سمجھنے سے قاصر تھی۔

اُسے شاید یہ نکتہ سمجھ نہیں آیا تھا کہ اللہ جب اپنے پیارے بندوں میں سے کسی کو ایمان کے لیے چُن لیتا ہے، تو یوں اچانک ہی اُن کی زندگی بدل دیتا ہے۔ پلک جھپکتے میں اک چھوٹی سی بات ہی اُن کو ایمان کے رستے پر لے آتی ہے۔ اُس نے آگے بڑھ کر پھوٹ پھوٹ کر روتی وجیتا کو گلے لگا لیا تھا۔

☆......☆

''بابا آج میں نے آپ سے پوچھے بنا، مشورہ لیے بنا، بہت بڑا قدم اٹھایا ہے، لیکن ہر عاقل بالغ کو یہ اجازت ہے کہ وہ سچ اور جھوٹ کو پہچانے، پرکھے اور پھر فیصلہ کرے، میں نے بھی سچ کو چُنا ہے۔'' وجیتا نے بات کرنے سے پہلے تمہید باندھی۔

سریندر سنگھ نے اثبات میں سر ہلایا اور منتظر نظروں سے اُس کی سمت دیکھتے رہے۔

''وہ......!'' وجیتا نے بے بسی سے باپ کی طرف دیکھا۔

''کیا......؟'' وہ نرمی سے بولے۔

''وہ بابا۔'' وجیتا کو سمجھ نہیں آرہا تھا کہ بات شروع کیسے کرے۔

''بولو بیٹے!'' وہ شفقت سے مسکرائے۔

''میں نے ...... میں نے اسلام قبول کر لیا ہے۔'' وہ سر جھکا کر دھیمے لہجے میں اعتراف کرتے ہوئے بولی۔

''ایک منٹ...... دو منٹ...... تین...... کئی پل، لمحے اور ساعت گزر گئے۔ نہ باپ کی طرف سے کوئی جواب آیا، نہ بیٹی کا جھکا سر اُٹھ سکا۔

''اللہ کی ذات کتنی مہربان ہے...... میں جس بات پر کئی مہینوں سے غور کر رہا تھا۔ میری بیٹی نے مجھ سے پہلے ہی کر لیا، مجھے خوشی ہے میری بیٹی، تم نے میری مشکل آسان کر دی۔'' سریندر سنگھ کی حیرت اور خوشی بھری آواز سُن کر وجیتا نے جھٹکے سے سر اُٹھایا تھا۔ باپ کی آنکھوں میں نمی اور لبوں کی مسکراہٹ کو اُس نے بے یقینی سے دیکھا تھا۔

اُن کا پوجا نہ کرنا، مندر نہ جانا، ویدوں کا نہ پڑھنا اُسے ایک ایک منظر یاد آتا گیا۔ ایک عرصے سے ایک غیر معمولی بدلاؤ وہ ان میں محسوس کر رہی تھی اور کڑی سے کڑی ملتی رہی۔ اب وہ اللہ کی مصلحت کو سمجھی تھی۔

''آؤ اللہ کا شکر ادا کریں، اُس نے ہم باپ بیٹی کو آمنے سامنے کھڑا نہیں کیا، دونوں کے دلوں میں تضاد نہیں ڈالا، بلکہ ایمان کا بیج ہمارے دلوں میں بو کر شاداب کر دیا، ہمیں مختلف سمتوں کا مسافر نہیں بننے دیا، ہمارے درمیان اختلاف نہیں ڈالا، ہر بات کا شکر ادا کرتے ہیں۔'' وہ پُر عقیدت لہجے میں بولے تھے۔

''ویسے ایک بات ہے! ایمان کا بیج ضرور بویا ہے اللہ نے ہمارے دلوں میں، مگر ایمان پہلے تم لائیں۔ اس کا مطلب ہے، تمہارا عمل مجھ سے بہتر ہے۔'' وہ خوشی سے مسکرائے اور مزید گویا ہوئے۔

"ایک نومسلم بیٹی اپنے باپ کو کلمہ پڑھائے گی۔"

اُن کی خوشی قابلِ دید تھی۔ وجیتا نے انہیں کلمہ پڑھایا۔

یہ سب کچھ انہیں ابھی خفیہ رکھنا تھا، قدرت کے اس حسین معجزے پر وہ باپ بیٹی ایک دوسرے کے گلے لگے رو رہے تھے۔

☆......☆

"نمستے وجیتا دیوی!" وہ کالج سے تھکی ہاری لوٹی، پرکاش نے اُس کے سامنے آ کر مسکراتے ہوئے ہاتھ جوڑے تھے۔ وجیتا کا حلق تک کڑوا ہوا تھا۔

"اب یہ بے رخی برتنا چھوڑ دو پتنی جی! کیوں کہ عنقریب آپ میرے جیون کو سُندر بنانے والی ہیں۔" اک دل جلانے والی مسکراہٹ لبوں پر سجائے پرکاش نے اُس کے بالوں کی لٹ کو چھوا تھا۔

دھڑ...... دھڑ...... دھڑام، سے پورے گھر کی چھت وجیتا کے سر پر آ گئی تھی۔

"بکواس بند کرو اپنی...... گھٹیا انسان!" اُس نے نفرت سے پرکاش کا ہاتھ اپنی لٹ پر سے جھٹکا تھا۔

"سچ ہے یا بکواس......؟ یہ تو آپ اپنے باپو سے جا کر پوچھیے، جنہوں نے میرے پتا جی کو آج ہی اس رشتے پر رضا مندی دی ہے اور بڑوں کی موجودگی میں ہی یہ بات طے ہوئی ہے، سویٹ ہارٹ!" اُس نے کمینگی سے ہنستے ہوئے وجیتا کے شفیع چہرے پر ہاتھ پھیرا۔

"نہیں!" وہ دو قدم پیچھے ہوئی۔ اُس نے حیرت اور صدمے سے پرکاش کی سمت دیکھا تھا۔

"افسوس پتنی جی۔" وہ منہ بنائے تاسف سے بولا۔ "پر یہی سچ ہے۔" اُس نے افسوس سے کہتے ہوئے جملہ مکمل کیا۔

انداز ایسا دل جلانے والا تھا جیسے وہ واقعی وجیتا کو صدمے میں دیکھ کر پریشان ہو گیا ہو۔

"میرا پیچھا کیوں نہیں چھوڑتے تم، گھٹیا انسان، نفرت ہے مجھے تم سے!" اُس نے پرکاش کا گریبان دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر جھنجوڑتے ہوئے چیخ کر کہا تھا۔ آنسو بے تحاشہ اُس کے حسین چہرے کو بھگو رہے تھے۔

"نہ میری جان! اپنے ہونے والے دھرم پتی کو ایسے نہیں کہتے، بھگوان ناراض ہوتا ہے۔" اُس نے شہادت کی انگلی سے وجیتا کے آنسو پونچھتے بچوں کی طرح چمکارتے ہوئے کہا تھا۔

"تمہیں سمجھ نہیں آتی؟ میں تم سے نفرت کرتی ہوں، تمہیں جان سے مار دوں گی۔" وہ اُس کا گریبان جھنجوڑتے ہذیانی انداز میں چیخی۔

"تم مجھے کیا جان سے مارو گی میری جان! تمہاری یہ قاتل ادائیں ہی مجھے مار ڈالنے کو کافی ہیں...... میرے اتنے قریب آؤ گی، تو میں کیسے بے رُخی برت سکوں گا تم سے؟" اُس نے گریبان پکڑی وجیتا کے ہاتھوں کی دودھیا کلائیاں اپنے مضبوط ہاتھوں میں جکڑتے ہوئے نثار ہو جانے والے لہجے میں کہا تھا۔

"جھوٹ بولتے ہو تم، بکواس کرتے ہو...... میرے بابا ایسا ہرگز نہیں کر سکتے میرے ساتھ۔" وہ بے بسی سے کہتے رو پڑی۔

"جاؤ جا کر پوچھو اپنے پیارے بابا سے، خود ہی پتا چل جائے گا، میں بکواس کر رہا ہوں یا نہیں!" پرکاش نے نرمی سے اُس کے ہاتھ اپنے گریبان سے ہٹا کر کہا تھا۔ وہ بے یقینی سے پرکاش کی طرف دیکھتی رہی۔

"جاؤ شاباش!" اُس نے وجیتا کا گال ہاتھ سے چھو کر پیار سے کہا۔ وجیتا پیچھے کی طرف ہٹتے ہوئے مسلسل نفی میں سر ہلا رہی تھی۔ کچھ قدم پیچھے جا کر وہ مڑی اور بھاگتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف گئی تھی۔

"ہک...... ہاہ......! قسمت کی ستم ظریفی یا مہربانی...... کہ اب تم میری ہو چکیں...... دیکھنا کیسے

کیسے بدلے لیتا ہوں تم سے...... اور تمہارے سیدھے سادے بابا سے!!''
وہ دل پر ہاتھ رکھے خود سے بولا تھا۔
اوپر ٹیرس پر کھڑی پاربتی کی سماعتوں نے پرکاش کا ایک ایک لفظ واضح سُنا تھا۔

☆......☆

''آج میں اپنا گھر، اپنا پریوار، اپنا دیش، سب کچھ چھوڑ دوں گی، ممی، بابا، یہ کالج، پریا، سب مجھ سے چھوٹ جائے گا۔'' وہ رُندھی ہوئی آواز میں بولی۔
''تم جاؤ گی کیسے؟ دیانند چچا اور پرکاش کے ہوتے ہوئے تم کیسے جاسکتی ہو؟ وہ تمہیں ہرگز نہیں چھوڑیں گے۔'' فاطمہ نے پریشانی سے اپنا خدشہ بیان کیا۔
''بابا نے سب کچھ طے کرکے مجھے بتادیا ہے...... پرکاش اور چچا دو دن کے لیے گاؤں کسی سلسلے میں گئے ہیں، اُن کی غیر موجودگی میں چلی جاؤں گی۔ جب تک اُن کو خبر ہوگی، میں یہاں سے دور جاچکی ہوں گی۔'' وہ دُکھ سے چُور لہجے میں بولی۔
''وہ تمہارا پیچھا کرتے ہوئے جلد یا بدیر پہنچ ہی جائیں گے، اُن لوگوں سے فرار ممکن نہیں...... چاہے وہ بس، جہاز یا ٹرین سے ہو، ہر جگہ سے معلوم کرواکے تم تک پہنچ جائیں گے۔'' فاطمہ اُسے سمجھاتے ہوئے تشویش سے بولی۔
''ایسا کچھ نہیں ہوگا۔'' اک زخمی سی مسکراہٹ وجیتا کے لبوں پر پھیلی تھی۔
''کیونکہ میں ایک بحری جہاز سے جارہی ہوں، جو اک تجارتی جہاز ہے، وہ مجھے سیدھا پاکستان پہنچائے گا۔'' اُس کی بات پر فاطمہ اُچھل کر سیدھی ہوئی۔
''پاکستان؟ تم وہاں کس کے پاس جاؤ گی؟ کون ہے وہاں تمہارا؟'' وہ صحیح معنوں میں حیران تھی۔
''بابا کہتے ہیں تمہیں یہاں سے صحیح سلامت نکلوانے تک میرا کام، آگے تمہاری قسمت، تم خود اپنی مدد کرو گی، اللہ تمہارا ساتھ دے گا، ایمان کی تلاش پر نکلنے والے کی مدد اللہ کرتا ہے، جہاں تک پاکستان جانے کی بات ہے تو بابا کا کہنا ہے مجھے وہاں کی زبان سمجھ آتی ہے، وہاں کے لوگ مسلمان ہیں، اور اُن کا رہن سہن ہمارے معاشرے سے ملتا جلتا ہے، مجھے وہاں رہنے میں آسانی ہوگی، وہ ہمارا پڑوسی ملک ہے، ہمارا اُن سے رشتہ بہت پرانا ہے۔'' وہ عقیدت سے بولی تھی۔
''اپنے گاؤں تک اکیلی، ماں باپ کے بنا تم جا نہیں سکتیں، میں سمجھ سکتی ہوں کہ اپنا دیش چھوڑنا، وہ بھی یوں اکیلے اتنی چھوٹی عمر میں تمہارے لیے بہت مشکل ہوگا یہ فیصلہ، مگر تم نے کرلیا، مجھے فخر ہے کہ تم جیسی عظیم لڑکی میری دوست ہے۔ ہمیشہ مجھے اپنی یادوں اور دعاؤں میں یاد رکھنا۔'' فاطمہ آبدیدہ ہوئی تھی۔
وجیتا کی آنکھیں بھی نم ہوئی تھیں۔
''بالکل بھی غمگین مت ہونا، اللہ تمہارے صبر اور قربانیوں کا بہت اچھا صلہ دے گا، جانتی ہو؟ جو شخص برائیوں سے اپنے نفس کو روکے، بُرائی کی وجہ سے اپنا گھر، اپنا خاندان اور اپنا ملک چھوڑے یہ ہجرت ہی کہلائے گا۔ شیطانی لذتوں کو چکھنے پر قادر ہوتے ہوئے خود کو بُرے عمل سے روکے یہ ہجرت کرنا ہی ہوا جو قیامت تک جاری رہے گا۔''
''ایمان کے لیے اپنا سب کچھ چھوڑ دینے اور اس عظیم مقصد کا حصہ بننے پر تمہیں بہت بہت مبارک باد۔'' وہ روتے ہوئے وجیتا کے گلے لگ گئی تھی۔
آج اُن دونوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے الگ ہوجانا تھا، کون جانے اگلی ملاقات ہونی بھی تھی یا نہیں۔
بچپن کی بہترین سہیلیاں، ایک دوسرے کے گلے لگی شدتوں سے رو رہی تھیں۔

☆......☆

بحری جہاز تیار کھڑا تھا۔ تجارتی سامان، پورا عملہ اور تمام مسافر سب جہاز میں سوار ہو چکے تھے۔ وجیتا کا انتظار تھا۔ جو سفری بیگ تھامے خود کو بڑی سی چادر میں چھپائے، باپ سے ملتے ہوئے زاروقطار رو رہی تھی۔

''یہاں میں سب سنبھال لوں گا، مجھ سے کونٹیکٹ کرنے کی کوشش مت کرنا، میری اور اپنی ماں کی چنتا کرنے کی ضرورت نہیں، ہمیں کچھ نہیں ہوگا، میں نے جو موبائل دیا ہے، وہ اپنے پاس ہی رکھنا، یہاں جب تک سارا مسئلہ حل نہیں ہو جاتا، تب تک اُسے استعمال مت کرنا، میں حالات سازگار ہوتے ہی خود تم سے رابطہ کروں گا، اُسے استعمال کرنے کی پاداش میں تمہیں ٹریس بھی کیا جا سکتا ہے۔ سو بی کیئرفل بیٹا۔ اللہ تمہارا حامی و ناصر!'' سریندر سنگھ نے اُسے خود سے الگ کرتے ہوئے تسلی دی تھی۔ وجیتا نے اپنے آنسو پونچھے اور سر اثبات میں ہلایا۔

''ہم اللہ کی ذات پر بھروسا کر کے ایمان لائے، اللہ تمہیں اکیلا نہیں چھوڑے گا۔ آپ میری فکر نہ کریں، میں بالکل تنہا نہیں، وہ میرے ساتھ ہے۔'' اُس نے آسمان کی سمت اُنگلی اُٹھائی۔ سریندر سنگھ بیٹی کی بات پر مسکرائے تھے۔ وہ ہاتھ ہلاتی ہوئی پلٹی اور جہاز میں سوار ہوگئی۔

☆......☆

جہاز کے ڈیک پر کھڑی وہ ہاتھ ہلا کر باپ کو الوداع کہہ رہی تھی۔ سریندر سنگھ جو بیٹی کے سامنے کمزور نہیں پڑنا چاہتے تھے، پل پل دور ہوتی وجیتا کو دیکھتے رو رہے تھے۔ وہ بیٹی جو کبھی اُن کے بغیر گھر سے نہیں نکلی تھی، آج اپنا گھر بار، پریوار اور اپنا دیس چھوڑ کر انجان منزل کی مسافر بن گئی تھی۔ اُن کو چھوڑ کر دور جا رہی تھی۔ وہ پلٹے اور بغیر مڑ کر دیکھے وہاں سے چلے گئے۔

دُکھ جس کا کوئی انت نہیں، اسی دُکھ کے سبب وہ گھر سے نکلی تھی اور اب یہی دُکھ اُس کی جان کا روگ بن گیا تھا۔

ہر چیز سے فرار ممکن ہے، مگر دُکھ سے فرار ممکن نہیں، سوائے موت کے۔ باپ کے منظر سے غائب ہونے اور نظروں سے اوجھل ہو جانے کے بعد وجیتا عرشے پر چلی آئی اور اک نشست پر بیٹھ گئی۔ لوگ ایک ایک کر کے اپنا سامان لیے جہاز کے نچلے حصے میں اُتر گئے تھے اوپر عرشے پر وہ اکیلی رہ گئی تھی۔

جہاز سمندر کی پُرشور لہروں اور تیز ہوا سے ہچکولے کھاتا، اپنے رستے پر رواں دواں تھا۔

چادر کو اپنے گرد اچھی طرح سے لپیٹ کر اُس نے یخ بستہ ہواؤں سے جسم کو محفوظ کرنا چاہا، مگر سمندر کی نم ناک ہوا سے بچنا ممکن نہ تھا۔ اپنی نشست پر موجود آہنی سفید جنگلے سے ٹیک لگا کر وہ آرام سے آنکھیں موند گئی۔

پچھلی زندگی کو یاد کرتے کرتے، اُس کی آنکھ لگ گئی تھی۔

☆......☆

''ہماری نیندیں اُڑا کر خود آرام سے سو رہی ہیں وجیتا دیوی!! کیا انداز ہے آپ کا...... آفرین ہے!'' اُس کے پیشانی کے بال سنوارتا وہ عجیب سے لہجے میں بولا تھا۔

یہ آواز اور یہ انداز...... وہ لاکھوں کے ہجوم میں پہچان سکتی تھی۔ اُس نے جھٹکے سے آنکھیں کھول کر سامنے دیکھا۔ وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

''پرکاش!'' خوف کی زیادتی سے اُس کی آنکھیں اُبل پڑیں اور سانس سینے میں اٹکنے لگا۔

''جی...... جانِ پرکاش!'' وہ اُس کی آنکھوں میں جھانکتا، نثار ہو جانے والے لہجے میں بولا۔

وہ دُکھ، خوف اور بے بسی کے احساس سے

مغلوب ہو کر رو پڑی۔

''نہ...... نہ میری جان! نہ، رونا نہیں......! یہ تمہارا اپنا فیصلہ تھا، اب بھگتنا تو پڑے گا۔'' وہ نرمی سے، مگر دھمکی آمیز لہجے میں بولا۔

''کک...... کیا چاہتے ہو...... مجھ سے؟'' وہ روتے ہوئے بمشکل بولی تھی۔

''اس بات کا جواب تم اچھی طرح سے جانتی ہو۔'' وہ چبا چبا کر بولا تھا۔

وجیتا کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ سی دوڑ گئی تھی۔

''سمندر کی گہرائی میں...... زمین کی تہہ میں...... یا آسمان میں بادلوں کے بیچ، کہیں بھی جا کر چھپو گی، پرکاش تمہیں ڈھونڈ نکالے گا۔'' اُس نے نشے کی سی کیفیت میں کہتے وجیتا کے لبوں پر اپنی شہادت کی اُنگلی پھیری تھی۔

''اتنی محبت کرتا ہوں تم سے...... اور یہ میں نہیں دراصل میری محبت ہے، جو تمہیں کہیں سے بھی نکال لائے گی۔'' اُس نے وجیتا کے آنسو محبت سے پونچھے اور اُس کا خوبصورت چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھاما۔

وجیتا کی آنکھیں خوف کی زیادتی سے پھیل گئیں، وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔

پرکاش نے اُس کی حالت دیکھ کر قہقہہ لگایا تھا۔

اُس کی جھیل سی آنکھوں سے آنسو دیوانہ وار بہہ رہے تھے۔

''نہ...... نہ، رونا نہیں، کتنی بار کہوں؟'' وہ اپنے ہاتھوں کی گرفت سخت کرتے غرایا۔

وجیتا پلک جھپک کر آنسوؤں کو پیچھے دھکیلتی رہی، خود پر جبر کرتے، اُس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔

''و چچ...... چچ...... چچ، اتنا خوف، کتنی ڈرپوک ہو تم! میں تو تمہیں کافی بہادر سمجھتا تھا۔'' وہ تاسف سے بولا۔ ''چلو اک کام کرتے ہیں۔'' اُس نے اچانک پینترا بدلا۔ ''تمہیں اور تنگ نہیں کرتے'' ٹھیک ہے؟'' پرکاش نے اپنے ہاتھ اُس کے چہرے سے ہٹائے اور سیدھا ہو بیٹھا۔

وجیتا نے اپنی ڈھلکتی چادر درست کی اور آنسو پونچھے۔

پرکاش خاموش بیٹھا، سامنے گہرے سمندر کو دیکھتا رہا۔

''ویسے، تم جا کہاں رہی تھیں؟'' اُس نے بدستور سامنے دیکھتے گمبھیر آواز میں پوچھا۔

وجیتا کی ریڑھ کی ہڈی میں خوف کی اک لہر اُبھری، مگر وہ خاموش رہی۔ پرکاش جواب کا انتظار کرتا رہا۔

''تم بتانا نہیں چاہتیں تو میں بھی اصرار نہیں کروں گا، تمہاری مرضی۔'' وہ مصلحت آمیز لہجے میں بولا۔

وجیتا نے ڈرتے ڈرتے اُس کی سمت دیکھا، وہ اب بھی سامنے دیکھ رہا تھا۔

''پر...... کاش!'' وہ بہت سہمی ہوئی تھی۔ وہ شاید کسی گہری سوچ میں گم تھا۔

''ہوں۔'' لہجہ اُس کی گہری سوچ کا غماز تھا۔

کچھ پل خاموش رہ کر وہ ہمت مجتمع کرتی رہی۔

''بولو!'' پرکاش نے رُخ موڑ کر اُس کی سمت دیکھا۔

وجیتا نے اُس کی بڑی بڑی سرخ آنکھوں سے خائف ہو کر نگاہیں جھکالیں۔ خوف کی اک لہر اُس کے پورے وجود سے اُٹھی تھی۔

''پلیز...... مجھے جانے دو، تمہیں اللہ کا واسطہ۔'' وہ ضبط کرتے ہوئے بھی رو پڑی تھی۔

لفظ اللہ پر وہ ٹھٹکا تھا۔ کچھ پل خاموشی سے اُسے دیکھتا رہا۔

''تم واقعی مجھ سے پیچھا چھڑانا چاہتی ہو؟'' وہ دُکھ سے بولا۔ وجیتا خاموشی سے آنسو بہاتی رہی۔

''اتنی نفرت کرتی ہو مجھ سے؟'' وہ اب بھی خاموش رہی۔

وہ کچھ پل سر جھکائے روتی ہوئی وجیتا کی طرف دیکھتا رہا۔
اگر میں تمہارا پیچھا چھوڑ دوں تو؟'' اُس کا لہجہ عجیب سا ہو رہا تھا۔
وجیتا نے بھیگی آنکھیں اُٹھا کر بے یقینی سے اُس کی سمت دیکھا تھا۔ کچھ پل خاموشی کی نذر ہوئے۔
پرکاش نے اُس کا سرد ہوتا ہاتھ مضبوطی سے تھاما اور کھڑا ہوا۔ وجیتا نے خوفزدہ ہو کر اُس کی طرف دیکھا۔
پرکاش نے اُس کے ہاتھ پر دباؤ بڑھا کر اُسے اپنے مقابل کھڑا کیا۔ اُس کی خاموشی وجیتا کا خوف مزید بڑھا رہی تھی۔ وہ سوکھے پتے کی طرح لرز رہی تھی۔
اُس کا نازک کانپتا ہاتھ اُس کے مضبوط ہاتھ کے شکنجے میں جکڑا تھا، وہ اُسے چبوترے کے آہنی سفید جنگلے کی سمت لے آیا۔
''تم ...... کیا کرنے ...... والے ہو؟'' خوف سے اُس کی سانس سینے میں اٹک رہی تھی۔
سامنے سمندر کی پُرشور لہریں جہاز کے سینے سے ٹکرا کررات کے سیاہ منظر کو اور بھی خوفناک بنا رہی تھیں۔
پرکاش نے بایاں ہاتھ اُس کی کمر کے گرد حمائل کر کے اُسے خود سے قریب کیا۔ وہ پرکاش کی بوجھل سانسیں اپنی پشت پر محسوس کر رہی تھی۔ خود سے قریب کر کے وہ اُسے اذیت سے دوچار کر رہا تھا۔
''پلیز پرکاش!'' وہ سر جھکا کر رو پڑی۔
وہ روتی رہی۔ پرکاش نے اُسے چپ کروانے کی کوشش بھی نہیں کی، وہ سامنے وسیع سمندر کو دیکھتا رہا۔
''مجھ سے فرار کی کوشش کر کے تم نے میرے اندر کے الاؤ کو بھڑکایا ہے، تم جانتی ہو...... مجھ سے کہیں نہیں بھاگ سکتیں، تمہاری اس حرکت سے تمہیں کتنا نقصان پہنچے گا، اس سے بھی تم بخوبی واقف ہو، تمہارے پاس دو آپشن ہیں......'' وہ کچھ پل کو خاموش ہوا۔ وجیتا تھر تھر کانپ رہی تھی۔
اپنا ہاتھ اُس کے گرد سے ہٹا کر پرکاش نے دونوں ہاتھ اُس کے کندھے پر رکھے۔
وہ اُچھل پڑی، مگر پیچھے مڑ کر دیکھنے کی ہمت نہ کر سکی، خوف سے ایک چیخ نکلتے نکلتے اُس کے لبوں پر گھٹ کر رہ گئی۔
''میری ہو جاؤ...... یا...... مر جاؤ!!'' اپنا منہ اُس کے کان کے بالکل قریب لا کر اُس نے سرگوشی کی تھی۔
وجیتا نے دونوں ہاتھ مضبوطی سے منہ پر جما کر اپنی بے ساختہ چیخوں کو دبایا تھا۔ وہ خود پر ضبط کرتے ہوئے رو رہی تھی۔
پرکاش نے دونوں ہاتھ اُس کے کندھے سے ہٹائے اور اُس کی پشت سے ہٹ کر سامنے آ کھڑا ہوا۔
وہ سر جھکائے دونوں ہاتھ منہ پر رکھے رو رہی تھی۔
''یقیناً میرا ہو جانا تمہیں گوارا نہیں۔ اب بچتا ہے دوسرا آپشن یعنی......'' اُس نے قصداً جملہ ادھورا چھوڑا۔
وجیتا نے جھٹکے سے سر اٹھا کر روتی آنکھوں سے اس کی سمت دیکھا۔
''افسوس ...... تمہیں مرنا ہوگا۔'' اُس نے تاسف سے کہتے دونوں ہاتھ اٹھا کر اپنی معذوری بیان کی۔
وجیتا مسلسل نفی میں سر ہلاتے دو قدم پیچھے ہٹی۔
''میری نہیں تو تم کسی کی نہیں ہو سکتیں اور تمہیں کسی اور کے لیے زندہ چھوڑ دینا مجھے گوارا نہیں...... مرنا ہی تمہارا مقدر ٹھہرا۔'' وہ اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہتا دو قدم آگے بڑھا۔
''نہیں پرکاش...... تم ...... تم ایسا نہیں کر سکتے، تمہیں دیانند چچا کا واسطہ، تمہاری ماں کا واسطہ، ایسا مت کرو...... مجھے جانے دو، تمہیں اللہ کا واسطہ، پلیز مجھے چھوڑ دو۔'' وہ زار و قطار روتے ہوئے اُس کی منت کر رہی تھی۔
پرکاش پر مطلق اثر نہ ہوا۔
اُس نے آگے بڑھ کر روتی بلکتی وجیتا کو اپنے

آہنی شکنجے میں بے رحمی سے جکڑا تھا۔

''نہیں، پرکاش...... نہیں۔'' وہ پوری طاقت صرف کرتے زور لگا رہی تھی، مگر اُس کی گرفت سخت تھی۔

پرکاش اُسے آہنی جنگلے کے پاس لا کر سمندر میں دھکا دینا چاہ رہا تھا، مگر وہ خود کو گرنے نہیں دے رہی تھی۔

''اللہ کے لیے پرکاش، مجھے چھوڑ دو، جانے دو، مجھے پلیز۔'' وہ مسلسل روتے ہوئے منت کر رہی تھی، مگر مقابل پر کچھ اثر نہیں ہو رہا تھا۔

اس کا جسم آدھے سے زیادہ جنگلے سے باہر لٹکا تو خوف سے ایک گھٹی گھٹی سی چیخ اُس کے لبوں سے آزاد ہوئی تھی۔

☆......☆

اُس کی آنکھ کھلی، تو خنکی کے باوجود اُس کے چہرے پر پسینہ چمک رہا تھا۔ اُس کا پورا وجود خوف سے کانپ رہا تھا۔

اُس نے اپنے پاس والی نشست کی طرف دیکھا، وہ خالی تھی۔

آس پاس دیکھنے پر بھی پرکاش کہیں نظر نہیں آیا، مگر اُس کا خوف کسی طور کم نہیں ہو پا رہا تھا۔

اُس نے چادر اپنے ارد گرد پھیلا کر خود کو جیسے چھپانا چاہا تھا۔ معاً اُس کی نظریں سامنے چبوترے کے جنگلے سے ٹکرائیں تھیں۔ جہاں سفید براق شلوار قمیض میں ایک لمبا چوڑا شخص کھڑا تھا۔ وجیتا کی سمت اُس کی پشت تھی۔ وہ چادر میں خود کو چھپائے سکڑی سمٹی سی بیٹھی تھر تھر کانپ رہی تھی۔

''کک...... کون ہے۔'' اُس نے ہمت کرتے بالآخر پوچھ لیا۔ دوسری سمت سے کوئی جواب نہیں آیا۔

''کک...... کون ہے...... وہاں؟'' اب کے وہ اور خوفزدہ ہوئی۔ اُس شخص نے مڑ کر دیکھا۔

وہ پرکاش نہیں تھا، وجیتا کو شرمندہ ہونا چاہیے تھا، مگر وہ اس قدر خوفزدہ تھی کہ کچھ بھی سوچنے سمجھنے سے قاصر تھی۔

وہ شخص اپنا چہرہ واپس موڑ کر سمندر کی سمت متوجہ ہوا کچھ دیر پہلے اُس کا جی گھبرایا تو وہ باہر عرشے پر چلا آیا اور سمندر کی نیلاہٹوں میں کھو گیا۔ وہ تنہائی چاہتا تھا، مگر وہ خوفزدہ سی انجان لڑکی، خود کو چادر سے ڈھانپے سو رہی تھی، مسلسل اُس کی تنہائی میں مخل ہو رہی تھی۔ اُس کا حُسن ایسا خیزہ کرنے والا تھا جو چاند کو بھی شرما جائے۔ خواب میں وہ مسلسل روتے ہوئے کسی کی منت کر رہی تھی۔

وہ بہت کم گو اور خود میں مگن رہنے والا شخص تھا، اُسے کبھی کسی کی ذات کے بارے میں تجسس نہیں ہوا تھا۔ یہ سب کچھ اُس نے بالکل غیر ارادی طور پر سنا تھا۔

عرشے پر دو ذی روح موجود تھے۔ مگر بلا کا سناٹا تھا، سوائے سمندر کی پُرشور موجوں اور ہوا کے شور کے...... اس اذیت ناک خاموشی کو تیسرے ذی روح کی آواز نے توڑا۔

''سکندر!'' اُس نے اپنے نام کی پکار پر مڑ کر دیکھا، عثمان کو دیکھ کر اُس کے لبوں پر شناسا سی مسکراہٹ پھیل کر معدوم ہوئی۔

''واہ میرے دوست! ہر جگہ تنہائی ڈھونڈ لیتے ہو، تم جیسا عجیب شخص میں نے پوری زندگی میں کہیں نہیں دیکھا۔'' اُس کے قریب آ کر سکندر کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ وہ خاموشی سے سامنے سمندر کی وسعت کھوجتا رہا۔

''عثمان، ہم کب تک یوں چھپتے چھپاتے سفر کرتے رہیں گے عام لوگوں کی طرح بس، ٹرین اور جہاز میں کیوں نہیں جا سکتے؟ اس لیے کے ہماری داڑھی ہے؟ یا اس لیے کہ ہم مسلمان ہیں اور اسلام کو پھیلانے میں اپنا حصہ ڈال رہے ہیں؟'' وہ آزردہ تھا۔

عثمان نے اپنے سامنے موجود لمبے چوڑے خوبصورت مرد کو دیکھا تھا۔ سیاہ گھنے بال، ذہانت سے

پُر سیاہ گھور کشادہ آنکھیں، لمبی کھڑی ناک، عنابی لبوں اور ہلکی سی داڑھی والا وہ پُرکشش مرد اس لمحے بہت آزردہ لگ رہا تھا۔ اُسے بے اختیار اپنے معصوم، حساس دل کے مالک دوست پر بہت پیار آیا تھا۔

''ریلیکس سکندر، بی بریو! اسلام دشمن عناصر، جس طرح اسلام کو بدنام کرنے کی ناکام کوشش کررہے ہیں تم بخوبی واقف ہو، راہ چلتے کسی معصوم اور بے ضرر شخص کو محض اس بنا پر جیلوں میں ڈال دیتے ہیں کہ وہ مسلمان ہیں، یا اُن کے چہرے پر داڑھی ہے، یا وہ اسلام کے راستے پر چل کر کوئی خدمت انجام دے رہے ہیں، ان حالات میں اگر ہم اِن ممالک خصوصاً بھارت جیسے ملک میں جاکر اسلام کی تعلیم دیں، وہاں کے لوگ اپنے دھرم کے معاملے میں کتنے حساس اور شدت پسند ہیں، یہ بات کوئی ڈھکی چھپی نہیں، پھر تم ہی بتاؤ ہمارا یوں کھلے عام سفر کرنا اسلام کے پرچار کے لیے ایسے شہروں اور ملکوں میں جانا خود ہی موت کے منہ میں ہاتھ ڈالنے کے مترادف ہے، کل کوئی اسلام دشمن عناصر ہمیں کالعدم تنظیم سے وابستگی کا خطاب دے کر امریکہ کے حوالے کردیں تو تم کیا کرسکو گے؟ سوائے چیخنے چلانے اور گڑگڑانے کے تم کیا کرسکو گے؟ ہم کوئی غلط کام نہیں کررہے، ہمارا ضمیر مطمئن ہے تو پھر اس بات سے کیا فرق پڑتا ہے کہ ہم چھپ چھپا کر جائیں یا کھلے عام؟ دنیا تو ہم نے اسلام کی تعلیم ہی ہے اور تم دیکھ رہے ہو ماشاء اللہ سے اسلام کا دائرہ دن بدن وسیع سے وسیع تر ہوتا جارہا ہے۔'' عثمان نے ناصحانہ انداز میں کافی لمبی تقریر کرکے اُس کی آزردگی مٹانا چاہی۔

''ہم ڈنڈے کے زور پر یا ہتھیار لے کر اسلام کا پرچار تو نہیں کررہے، ہمارا کام تبلیغ دینا ہے' باقی لوگ خود سمجھ دار ہیں حق اور باطل کو پہچاننا اُن کے اپنے ذہنوں کا کمال ہے، اگر کوئی اسلام کی حقانیت سے متاثر ہوکر اس دائرے میں داخل ہونا چاہے تو ہم اپنی بانہیں اُن کے لیے وا کردیتے ہیں، اُن کی مدد کرتے ہیں۔''

''اس میں بُرا کیا ہے، جو ہم سفر بھی چھپ کر ایسے کرتے ہیں جیسے چوری کرنے جارہے ہوں۔'' سکندر خلاف معمول آج زیادہ ہی بول رہا تھا اور اپنی ہی بات پر اڑا رہا، وہ بہت بہادر اور مضبوط اعصاب کا مالک شخص تھا۔ عثمان اُس کے انداز پر حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

''بھائی کیا ہوگیا ہے تمہیں؟ ہر حال میں ہمیں حوصلہ دینے والا آج خود کیسے حوصلہ ہار گیا، مجھے تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی؟ عثمان کو تشویش نے آگھیرا۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' سکندر مسکرایا۔

''تمہیں یاد رکھنی چاہیے یہ بات...... کہ ہمارا کام اہم ہے، باقی ہمیں سفر یا کسی اور شے سے غرض نہیں ہونی چاہیے۔ ہمارا اولین مقصد اسلام کی تبلیغ کرنا ہے او کے...... آئندہ میں تمہارے منہ سے ایسی مایوسی بھری گفتگو نہ سنوں۔'' عثمان نے اُسے دوٹوک لہجے میں سمجھایا۔ سکندر نے سر اثبات میں ہلا دیا۔

عثمان سے باتیں کرکے اُس کے دل کا غبار ڈھل گیا وہ خود سمجھنے سے قاصر تھا کہ آج اچانک اُسے کیا ہوگیا ہے۔

''میں نیچے جارہا ہوں، چائے پینے، تم بھی آجانا...... نیند آرہی ہے، صبح کی نماز میں ابھی تھوڑا ٹائم ہے۔'' عثمان نے جمائی روکتے ہوئے کہا اور پلٹ کر چلا گیا۔ سکندر ہنوز سابقہ انداز میں کھڑا رہا۔

وجیتا کب سے سانس روکے اُن کی باتیں سن رہی تھی، کالعدم تنظیم کا نام سن کر وہ خوفزدہ ہوگئی تھی، گفتگو کا کوئی اور حصہ اُس کی سمجھ میں آیا ہو یا نہیں مگر

یہ لفظ ضرور سمجھ آ گیا تھا۔ اس موضوع سے آج کل میڈیا اور اخبارات بھرے پڑے تھے۔ یہ احساس ہی سوہانِ روح تھا کہ کالعدم تنظیم کا کوئی فرد اُس کے آس پاس موجود تھا۔ وہ پہلے ہی کیا کم خوفزدہ تھی اُس پر یہ نئی افتاد، خوف سے وہ مرنے والی ہو گئی تھی۔

سکندر نے اک گہری بوجھل سانس فضا کے سپرد کی اور پلٹا وہ اجنبی لڑکی اب تک اُسی طرح بیٹھی تھی۔

وہ حیران ہوا اور کچھ دکھی بھی...... بے چاری حالات کی ستائی ہوئی لگتی تھی۔ خواتین کے سامنے میں کافی آدم بیزار واقع ہوا تھا، مگر اس لڑکی میں پتا نہیں کیا ایسا تھا جو سکندر کو اس کے متعلق سوچنے پر مجبور کر رہا تھا۔

وہ چبوترے سے اُتر کر عرشے پر آیا، لکڑی کے عرشے پر اُس کے مضبوط بھاری قدموں کی چاپ وجیتا کو اپنے دل پر پڑتی محسوس ہو رہی تھی۔ ایک ......دو...... تین، خوف سے آنکھیں بند کیے وہ اُس کے قدم گنتی رہی۔ ابھی میرے پاس آ کر رُکے گا اس کے ہاتھ میں چمکتی پسٹل یا نیا نکور خنجر ہو گا اور میرا گلہ کاٹ دے گا۔ وہ اپنے آخری لمحات گن رہی تھی۔ اُس کی حیرانگی کی انتہا نہ رہی جب قدموں کی چاپ اُس کے قریب سے ہو کر گزر گئی۔ اُس نے آنکھیں کھولیں اور بائیں طرف دیکھا وہ سیڑھیاں اترتا نیچے جا رہا تھا۔

وجیتا کا کب سے رُکا سانس بحال ہوا تھا۔ ''شکر ہے بچ گئی!'' اُس نے پیر نیچے کیے اور سیدھی ہو بیٹھی۔ یہ رات کتنی طویل ہے...... صبح کب ہو گی؟ اُس نے اندھیرے کو دیکھتے کوفت سے سوچا۔ اُف وہ خواب کتنا بھیانک تھا۔'' اُسے وہ خواب یاد آیا تو خوف سے اُس نے اک جھرجھری سی لی تھی۔

آہ...... جانے ممی بابا کیا کر رہے ہوں گے؟ انہیں نیند آئی ہو گی یا نہیں؟ وہ اب ماں باپ کے بارے میں سوچنے لگی۔

سکندر اُس کے لیے چائے لے آیا، وہ کافی تھکی ہوئی لگ رہی تھی، اُسے اس انجان اور خوفزدہ لڑکی پر بے تحاشا رحم آیا تھا۔ قدموں کی چاپ پر وجیتا نے سر اٹھایا، سکندر اُس کے سامنے ہی کپ تھامے کھڑا تھا۔

''چائے پی لیں! سکندر کی بھاری آواز نے سکوت توڑا۔ وجیتا نے سر جھکا کر نفی میں ہلایا اور خوف سے خود میں مزید سکڑ کر بیٹھ گئی۔

''اس نے ضرور چائے میں کچھ ملایا ہو گا۔'' خوف سے سوچتے اُس نے جھرجھری لی۔ سکندر آہستگی سے چلتے، اس سے کچھ فاصلے پر بیٹھ گیا۔ وہ اپنی نشست پر بیٹھے بیٹھے ذرا سا کھسکی تھی۔

''یہ چائے پی لیں، تھکن اُتر جائے گی۔'' سکندر نے اب کے نرمی سے کہا تھا۔ وہ سمجھ چکا تھا اکیلے ہونے کے سبب وہ لڑکی کافی خوفزدہ تھی۔

''مجھے نہیں پینی۔'' وہ سر ہنوز جھکائے، بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ سکندر نے حیرت سے اُس کی سمت اک نظر دیکھا، چائے نہیں پینی، تو اس میں رونے والی کیا بات ہے۔ اُس نے لاپروائی سے شانے اچکائے اور خود ہی پینے لگا۔

''آپ اکیلی ہیں؟'' سکندر کا یہ عجیب سا سوال وجیتا کو مزید خوفزدہ کر گیا۔ وہ خاموش رہی۔

''میرا مطلب ہے، آپ کو جانا کہاں ہے؟ میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں؟'' اب کے اُس نے تصحیح کی۔ وجیتا کی طرف سے ہنوز خاموشی چھائی رہی۔

''عجیب لڑکی ہے!'' سکطندر نے کوفت سے سوچتے اُس کی سمت دیکھا۔ وہ سر جھکائے سکڑی سمٹی سی بیٹھی تھر تھر کانپ رہی تھی۔ سکندر کو اُس کی حالت پر بے حد رحم آیا تھا۔

''یہ بحری سفر ہے، آپ کے اکیلے پن سے فائدہ اٹھا کر کوئی آپ کو نقصان بھی پہنچا سکتا ہے، مجھ

سے مدد لینا چاہیں تو میں حاضر ہوں، یہیں آپ کے آس پاس موجود ہوں، آپ کو منزل تک پہنچا کر ہی مجھے سکون ملے گا، میرے دل کو یہ گوارا نہیں کہ آپ کو یوں اکیلا چھوڑ دوں، جبکہ آپ اکیلے ہونے کے ساتھ ساتھ خوفزدہ بھی ہیں۔'' اس نے ذرا سا توقف کیا۔'' مجھے سکندر سلیمان کہتے ہیں، اُمید ہے آپ کی تسلی کے لیے اتنا تعارف ہی کافی ہوگا۔'' اُس نے وجیتا کی طرف دیکھا وہ ہنوز اسی پوزیشن میں بیٹھی تھی۔ اک لمبی سی سانس بھر کر اُس نے کپ نیچے رکھا، اور پُرسکون ہو کر بیٹھتے ہوئے پیچھے جنگلے سے ٹیک لگا کر سر ٹکایا اور آنکھیں موندھ لیں۔

''یہ جاتا کیوں نہیں؟'' وجیتا کا خوف کسی طور کم نہیں ہو پا رہا تھا وہ کافی تھک چکا تھا وہاں کی ٹھنڈی پُرسکون ہوا کا اثر چھایا تھکن شدید تھی کہ اُسے نیند آنے لگی تھی۔ کافی دیر تک اُس کی طرف سے کوئی حرکت نہیں ہوئی تو وجیتا نے ذرا کی ذرا نظریں اُٹھا کر اُسے دیکھا۔ وہ پُرسکون انداز میں بے خبر سو رہا تھا۔

وجیتا کو اُس پر رشک آیا تھا۔ بہت تھک چکی تھی، مگر پہلے وہ بھیانک خواب، پھر دو افراد کی مشکوک گفتگو اور اب اس شخص پر کا سر پر مسلط ہونا، اس حال میں نیند کس کو آنی تھی۔ وہ آہستگی سے اٹھ کر چبوترے پر چلی آئی۔ اُسے سریندر سنگھ کی اپنے ساتھ کی گئی گفتگو یاد آئی تھی۔

'' دھرم بدلنے سے میرا اس پریوار سے رشتہ تو نہیں کٹ جائے گا۔ رہوں گی تو میں اسی پریوار کا حصہ اور خون بھی۔''

'' آج جو پورا پریوار وجیتا وجیتا کرتا ہے، تمہاری سندرتا اور اچھائی کے گن گاتا ہے، کل کو تمہارے اسلام قبول کرنے کی خبر پر تمہارا جانی دشمن بن جائے گا، تمہارے فرار میں ہی تمہاری زندگی ہے۔'' سریندر سنگھ نے اُسے رسان سے سمجھایا۔

اُس کی آنکھوں میں نمی جھلملائی تھی۔ صرف دھرم بدلنے سے اپنے، پرائے ہو جاتے ہیں، ہر انسان کو اپنا جیون خود جینے کا حق ہے، مجھے جو صحیح لگا میں نے وہی کیا، اس میں اور لوگوں کا کیا عمل دخل! تا حد نگاہ پھیلی رات کی تاریکی کو دیکھتی اور سوچتی رہی۔

اک تند و تیز لہر جہاز سے ٹکرائی، سمندر کا نمکین پانی پھوار کی صورت سکندر کے چہرے پر پڑا تھا۔ اُس کی آنکھ کھل گئی۔ کچھ پل وہ تیز ہوا کے جھونکوں کو اپنے بھیگے چہرے پر محسوس کرتا رہا، اچانک اُس کی نظر سامنے پشت پر پڑی، وہ خالی تھی۔ وہ چونک کر سیدھا ہوا پورا عرشہ ویران پڑا تھا۔ اُس نے بائیں سمت دیکھا، وہ لڑکی چبوترے پر کھڑی نظر آئی سکندر کی طرف اُس کی پشت تھی۔ اُس نے گھڑی دیکھی اور نیچے وضو کرنے اُتر گیا، وجیتا نے مڑ کر دیکھا وہاں کوئی نہ تھا۔ وہ واپس اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ گئی۔ کچھ ہی دیر میں سکندر اوپر آیا اس کے کندھے پر جائے نماز تھی۔ دونوں آستینیں اوپر چڑھی ہوئی تھیں۔ اُس کے ہاتھ میں رومال تھا جس سے اُس نے اپنا چہرہ اور دونوں بازو پونچھے، رومال جیب میں ڈال کر اُس نے جائے نماز کندھے سے اتار کر لکڑی کے عرشے پر بچھا دی۔ وجیتا یہ سارا عمل غائب دماغی سے دیکھتی رہی وہ اُسے یکسر فراموش کیے ہاتھ باندھ کر نماز کے لیے کھڑا ہو گیا۔

وجیتا کے بالکل سامنے ہی وہ نماز پڑھ رہا تھا، یوں کے اُس کا دایاں رُخ مکمل اُس کی نظروں کے سامنے تھا۔ اُس نے بہت یکسوئی اور عقیدت سے نماز پڑھی، سلام پھیر کر آنکھیں بند کیے وہ دعا مانگ رہا تھا۔ فاطمہ اسے بتا چکی تھی کہ نماز اللہ اور بندے میں رابطے کا ذریعہ ہے۔ وہ اسے نماز پڑھنے کا طریقہ بھی سمجھا چکی تھی۔

وجیتا بغیر پلک جھپکائے اُسے دیکھتی رہی۔ دعا

مکمل کر کے اُس نے چہرے پر دونوں ہاتھ پھیرے، اُسی طرح بیٹھے وجیتا کی سمت دیکھا۔ اُس نے گڑبڑا کر فوراً نظریں جھکالیں۔

''آپ نماز پڑھنا چاہیں تو نیچے وضو کا مکمل انتظام ہے۔'' اُس نے وجیتا کی سمت دیکھ کر کہتے اپنا فرض ادا کیا اور اُٹھ کر جائے نماز سلیقے سے تہہ کی۔ وجیتا کھڑی ہوگئی۔ اُس نے جائے نماز وہاں موجود نشستوں میں سے ایک پر رکھ دی اور خود بھی بیٹھ گیا۔ وجیتا آہستگی سے سیڑھیاں اُترتی نیچے جاچکی تھی۔ وہ مزے سے وہاں بیٹھا رہا۔

کچھ دیر میں وجیتا کی واپسی ہوئی۔ اُس کے بے داغ شفاف چہرے پر پانی کے قطرے چمک رہے تھے۔ سکندر نے بغیر اُس کی سمت دیکھے، جائے نماز اُٹھا کر اُس کے سامنے کی، جو وجیتا نے خاموشی سے تھام لی۔ وہ اُس کے سامنے نماز بھی نہیں پڑھ سکتی تھی اور اُسے وہاں سے جانے کا بھی نہیں کہہ سکتی تھی۔ وہ متذبذب سی تہہ کی ہوئی جائے نماز دونوں ہاتھوں سے تھامے، سینے سے لگا کر سر جھکائے خاموش کھڑی تھی۔

سکندر کو اُس کے یوں کھڑے ہونے سے اُلجھن ہونے لگی، تو اُس نے بے اختیار سر اٹھا کر وجیتا کی سمت اچٹتی نظر ڈالی۔

''کوئی مسئلہ ہے کیا؟ اُس کی بھاری آواز سارے میں پھیلی۔

''مجھے......تنہائی......میں، نماز پڑھنی ہے۔'' وہ سر جھکائے آہستگی سے بولی۔ وہ کچھ نہ بولا خاموشی سے اُٹھا اور اُس کے پاس سے گزر کر نیچے سیڑھیاں اُتر گیا۔

وجیتا نے جھکا سر اٹھا کر آسمان کی سمت دیکھا اور لمبی سانس اندر کھینچی اُس نے بہت دل لگا کر نماز پڑھی، خشوع وخضوع سے دُعا مانگی اور بہت دیر تک جائے نماز پر بیٹھی رہی۔

''نماز پڑھ چکی ہیں، تو ناشتا کرلیں۔'' سکندر ہاتھ میں ٹرے پکڑے اُس سے بولا اور سامنے جا کر بیٹھ گیا۔ وجیتا اُٹھی اور جائے نماز تہہ کر کے رکھ دی۔

''آیئے۔'' سکندر نے نشست کی طرف اشارہ کیا۔ وہ خاموشی سے جھجکتے ہوئے بیٹھ گئی۔ اُس نے اپنا کپ اور پلیٹ پکڑا باقی ٹرے وجیتا کی سمت بڑھائی۔

''میرا من نہیں۔'' اُس نے دھیمی آواز سے انکار کیا۔ وہ اُس کے لہجے خصوصاً ''من'' کہنے پر چونکا۔

''ہوں...... گویا انڈیا سے تعلق رکھتی ہیں۔'' اُس نے سوچا۔

''نیچے کاؤنٹر سے معلومات لے سکتی ہیں، میں نے اس میں کچھ نہیں ملایا، بے خوف ہوکر آپ ناشتا کرسکتی ہیں۔'' سکندر نے خشک لہجے میں کہہ کر اُس کا خوف زائل کرنا چاہا۔

''اس نے میری سوچ پڑھ لی کیا؟'' وجیتا پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔

سکندر کی بات پر وجیتا نے ذرا کی ذرا نظر اٹھا کر اُس کی سمت دیکھا۔ وہ اب بھی ٹرے اُس کی طرف بڑھائے، منتظر سا اُسے دیکھ رہا تھا۔ اُس نے گڑبڑا کر نظریں ٹرے پر جمائیں اور ہاتھ آگے بڑھایا۔

''تھینکس۔'' اُس نے آہستگی سے کہہ کر ٹرے تھما دی۔ سکندر نے جواباً سر ہلانے پر اکتفا کیا اور سیدھے ہوکر بیٹھتے ناشتا کرنے لگا۔ وہ کافی رغبت سے کھا رہا تھا۔ وجیتا کی بھوک بھی چائے اور آملیٹ سلائس دیکھ کر چمک اُٹھی تھی۔ وہ بھی ناشتہ کرنے لگی۔

☆......☆

سورج کے نکلتے ہی عرشہ بھی آباد ہوگیا تھا۔ نشستیں بھر چکی تھیں اور چبوترے کے جنگلے کے پاس بھی بہت سے لوگ کھڑے ہوکر سمندر کا نظارہ کررہے تھے۔

سکندر پاس ہی کھڑا تھا، وجیتا آخری نشست

پر اُس سے کچھ فاصلے پر بیٹھی تھی۔ اس کے ساتھ اک بڑی بی بیٹھی تھیں، جو کافی باتونی معلوم ہو رہی تھیں۔ سکندر نے اُسے سختی سے کسی سے بھی بات چیت کرنے سے منع کیا تھا، اور وہ اپنی دانست میں اُس کی حکم عدولی کر کے اپنی زندگی خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتی تھی۔

سکندر کی سوچ صاف تھی۔ مگر وہ اپنے خوف کی وجہ سے کسی پر بھی اعتبار نہیں کر سکتی تھی، وجہ اُس کے پاس ٹھوس تھی۔

''بیٹی، کس کے ساتھ ہو تم؟'' بڑی بی نے اُسے مسکراتے ہوئے مخاطب کیا۔ وجیتا کا دل اُچھل کر حلق تک آ گیا۔ اُس نے دھڑکتے دل سے، سکندر کی سمت دیکھا، وہ دائیں طرف کھڑا تھا۔ اُس کا اک پہلو ذرا سا نظر آ رہا تھا۔ مگر اُن دونوں کی سمت پشت تھی۔ وجیتا نے نگاہ کا زاویہ بدل لیا تھا۔ وہ اُن کا سوال سُن چکا تھا، ذرا سا رخ موڑ کر اُن دونوں پر اچٹتی نگاہ ڈالی اور واپس منہ موڑ گیا۔

''میاں ہے تمہارا؟'' بڑی بی کی طرف سے اک اور سوال آیا، وہ کافی تیز تھیں۔ وہ عجیب مشکل میں پھنس گئی، اک طرف سکندر تھا، دوسری طرف بڑی بی۔

''جی، میرے ساتھ ہیں یہ؟'' سکندر نے وجیتا کو خاموشی دیکھ کر پلٹ کر جواب دیا۔ مگر دوسرے سوال کا جواب گول کر گیا۔ جواب وجیتا کے بجائے، سکندر کی طرف سے پا کر بڑی بی نے اچنبے سے سکندر کی سمت دیکھا، اور اثبات میں سر ہلا دیا۔ وجیتا کے کچھ پلے نہ پڑا کہ میاں کس بلا کا نام ہے۔''

''بچے ہیں، یا ابھی شادی ہوئی ہے؟'' انہوں نے پھر دلچسپی سے وجیتا سے پوچھا۔ اُن کی بات سُن کر وجیتا شرم سے پانی پانی ہو گئی تھی۔ سکندر کا ضبط بس یہیں تک تھا، اس نے پلٹ کر بڑی بی کو دیکھا جو ابھی تک وجیتا کی سمت منتظر نظروں سے دیکھ رہی تھیں اور پھر اُس پر نگاہ ڈالی جو سر جھکائے خاموش بیٹھی تھی۔ وہ پورا وجیتا کی سمت مڑا۔

''میں نے آپ کو پہلے ہی خبردار کر دیا ہے کہ مجھے آپ کا کسی سے بات کرنا گوارا نہیں، وہ سامنے نشست خالی ہے، آپ وہاں جا کر بیٹھ سکتی ہیں۔''

اُس نے سامنے اک خالی نشست کی سمت اشارہ کیا۔ وجیتا اُس کے حکم پر خاموشی سے اٹھنے لگی تھی، بڑی بی نے اُس کی کلائی پکڑ کر زبردستی بٹھایا تھا۔

''آئے...... ہائے! ایسی بھی کیا پابندی، میاں میں بوڑھی سی عورت، کوئی مرد تو نہیں کہ لڑکی کو ورغلا کر فرار ہو جاؤں گی، بہت سے شکی مزاج مرد دیکھے ہیں...... اُن میں خود کوئی کمی ہوتی ہے، تبھی اپنی عورتوں پر شک کرتے ہیں، تم تو خود اچھے خاصے خوبصورت ہو، اپنی بیوی سے کسی طور کم نہیں، پھر کس بات کا ڈر ہے تمہیں، بچی مجھ سے بات نہیں کرے گی تو سفر کیسے کٹے گا، بیچاری کا...... توبہ ہے ایسا ظالم شوہر نہ دیکھا نہ سُنا، اب ایسا بھی کیا ڈراوا، بچی بیچاری کا رنگ پیلا پڑ گیا ہے۔'' انہوں نے سکندر کے سپاٹ و سنجیدہ چہرے کو ملامت سے دیکھتے تاسف سے کہا تھا۔ وجیتا عجیب مخمصے میں پڑ گئی تھی۔ سکندر کی مانے یا بڑی بی کی۔

''مجھے تم سے پوری ہمدردی ہے بیٹی! کیسی چاند سی صورت ہے، جانے کیسے ماں باپ تھے، جو اس ظالم کے پلے باندھ گئے۔'' انہوں نے اس کی کلائی چھوڑی اور اُس کی ٹھوڑی چھو کر چہرہ اٹھایا۔ بڑی بی کی ذرا سی ہمدردی پا کر اُس کی آنکھیں لبالب بھر گئیں۔ اُس کو وہ کافی اچھی عورت لگی تھی، وہ سکندر نام کی بلا سے پیچھا چھڑانا چاہتی تھی، مگر وہ اُسے اکیلا چھوڑتا تب ہی وہ کسی سے مدد طلب کرتی۔

''میری بچی!'' بڑی بی کافی رحم دل تھی یا شاید

اُسی پر مہربان، شدتِ جذبات سے کہتے اُس کی پیشانی چومی۔ سکندر کو یہ چونچلے اک آنکھ نہ بھائے۔
''میرے ساتھ آؤ!'' اُس نے ناگواری سے کہا اور آگے بڑھ گیا۔ وہ ناچار اُس کے پیچھے اُٹھی تھی۔ سکندر کی مطلوبہ جگہ پر وہ دونوں بیٹھ گئے تھے۔
''میں نے صحیح سلامت منزل تک پہنچانے کا وعدہ کیا ہے آپ سے، خاموشی سے سفر کریں گی تو آپ کو ہی فائدہ پہنچے گا، وگرنہ ہمدردی کے نام پر آج کل کیا کچھ نہیں ہوتا، آپ بخوبی واقف ہوں گی۔'' خشک سے لہجے میں دوٹوک بات کہہ کر وہ ناک کی سیدھ میں دیکھنے لگا۔
''بر کاش سے پیچھا چھڑالیا، اب اس شخص سے کیسا پیچھا چھڑاؤں، ذرا سا آگے پیچھے ہو تو میں کسی سے مدد کے لیے کہتی ہوں، مجھے یہ شخص خطرناک لگ رہا ہے، ضرور مجھے کسی مصیبت میں پھنسائے گا۔'' یہ بات سوچتے ہوئے اُس کے حلق میں آنسوؤں کا گولہ اٹکنے لگا تھا۔
کافی وقت خاموشی سے گزرا۔ بڑی بی اب بھی وقتاً فوقتاً وجیتا کو رحم طلب نظروں سے اور سکندر کو کھا جانے والی نظروں سے گھورتیں۔ سکندر نے ان پر نظر ڈالی وہ جو اُسے غصے سے گھور رہی تھیں، ناراضی سے دوسری سمت منہ موڑ لیا وہ اُن کے انداز پر مسکرادیا۔ یعنی وہ صحیح طور پر اُسے ظالم شوہر ثابت کروانا چاہ رہی تھیں۔ کچھ سوچ کر وہ اُٹھا اور بڑی بی کے ساتھ والی نشست پر جا کر بیٹھ گیا۔ بڑی بی نے اک ناراض سی نظر اُس پر ڈالی تھی۔
''آپ کو اصلی بات پتا چلے گی تو اُس سے نہیں مجھ سے ہمدردی ہوگی ماں جی!'' وہ نرمی سے بولا۔ وہ جو ناراض سی بیٹھی تھیں پوری اُس کی طرف مڑیں۔
''کیا بات؟'' وہ چونکی تھیں۔
''اس کے ساتھ کچھ دماغی مسئلہ ہے، کچھ الٹا سیدھا نہ بول دے اسی وجہ سے میں اسے اجنبی لوگوں سے بات نہیں کرنے دیتا۔'' اس کی بات سُن کر بڑی بی کو بہت افسوس ہوا۔
''مجھے معاف کر دینا بیٹا۔'' وہ بہت افسردہ نظر آئیں۔ ''بہت اچھے ہو تم جو اس حال میں بھی اس کا اتنا خیال رکھتے ہو، خدا اسے صحت دے۔'' انہوں نے وجیتا کی سمت دیکھتے ہوئے دل سے دعا دی تھی۔
دوسری طرف وجیتا کو موقع مل گیا تھا۔ سکندر کے جاتے ہی وہ کسی معقول شخص کو تلاش کر رہی تھی۔ جس سے وہ مدد طلب کرے۔ سیڑھیاں چڑھ کر آتے شلوار قمیض میں ملبوس ایک شخص پر اُس کی نظر پڑی، وہ اُسے کافی شریف بندہ معلوم ہوا۔ وجیتا تیزی سے اس شخص کی سمت اُٹھ کر آئی تھی۔
''پلیز میری مدد کریں، میں مشکل میں ہوں۔'' اُس نے ڈرتے ڈرتے سکندر اور بڑی بی کو دیکھا، شکر تھا وہ دونوں باتوں میں مگن تھے، نووارد نے حیرت سے اُسے دیکھا تھا۔
''پلیز ہیلپ می! وہ رونے والی ہوگئی تھی۔
''جی بتائیے، کیا مدد کر سکتا ہوں آپ کی؟'' وہ مکمل اُس کی سمت متوجہ ہوا۔
''اک شخص ہے، کل رات سے میرے پیچھے پڑا ہے، مجھے اکیلا نہیں چھوڑ رہا، کالعدم تنظیم سے تعلق ہے شاید اُس کا...... پلیز کسی طرح میرا پیچھا اُس شخص سے چھڑا دیں، پلیز وہ بہت خطرناک بندہ ہے، بہت مشکل میں ہوں، پلیز میری مدد کریں؟'' وہ روہانسے لہجے میں کافی دھیمی آواز میں بول رہی تھی۔
''کون ہے وہ شخص؟'' عثمان نے اُس خوفزدہ اور حسین لڑکی کو دلچسپی سے دیکھا۔ اُس نے مڑ کر سکندر کی طرف اشارہ کیا۔ عثمان کو ہنسی تو بہت آئی مگر وہ سنجیدہ رہا۔
''دیکھیں، اُس عورت سے بھی ہنس ہنس کر

میرے بارے میں باتیں کر رہا ہے۔'' اُس نے مزید بے چارگی دکھائی کہ شاید اسے رحم آ ہی جائے۔

''ایسے خطرناک شخص سے جھگڑا مول لے کر میں اپنی موت کو دعوت نہیں دے سکتا، برائے مہربانی آپ بھی خود کو کسی مصیبت میں نہ ڈالیں، اور جو یہ کہتا ہے وہ مان لیں، کیا معلوم یہ ہماری گفتگو ریکارڈ کروا رہا ہو۔'' عثمان نے اسے مزید ڈرایا۔

''تو آپ میری مدد نہیں کریں گے؟'' وہ واقعی خوفزدہ ہو گئی تھی۔

''مجھے افسوس ہے۔'' عثمان نے دونوں ہاتھ اُٹھا کر معذرت ظاہر کی۔ وجیتا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ عثمان کو بے ساختہ اس پر ترس آیا تھا مگر وہ مصلحتاً خاموش رہا۔ سکندر نے صبح ناشتے کے وقت اُسے وجیتا کے بارے میں سرسری سا بتا دیا تھا۔ وجیتا کے منہ سے تنظیم والی بات سُن کر وہ سمجھ چکا تھا کہ وہ اُن کی گفتگو سُن چکی ہے، مگر سمجھنے میں غلطی کر دی تھی۔ وہ عثمان کو رات کے اندھیرے میں دیکھ نہ پائی تھی، یہی وجہ تھی کہ اُسی سے اُس کے دوست کے خلاف مدد مانگ رہی تھی۔ وہ خاموشی سے سیڑھیاں اُتر کر نیچے چلا گیا اور وہ نڈھال سی واپس اپنی جگہ پر آ بیٹھی۔

''میں کچھ دیر میں آتا ہوں۔'' سکندر نے اُس کے پاس آ کر اطلاع دی اور سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔

''میری بلا سے کبھی نہ آؤ، مجھے کیا!'' اُس نے کوفت سے سوچا تھا۔ تنہائی ملتے ہی ممی بابا کو یاد کر کے وہ رو پڑی۔ عثمان نے سکندر کو من و عن وجیتا کی باتیں دہرائیں۔

''نان سینس! عجیب بیوقوف لڑکی ہے، میرا احسان ماننے کے بجائے مجھے غلط ثابت کرنے پر تُلی ہوئی ہے۔'' ناگواری سے اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

''تمہیں کیا لگتا ہے؟ کیا معاملہ ہے؟'' اُس نے سکندر کی سمت دیکھا۔

''ابھی تک تو کچھ نہیں پتا۔ اس نے کچھ بتایا بھی نہیں مگر مجھے اُس کی ہر ممکن مدد کرنی ہے، کم عمر ہے، سب سے بڑھ کر اکیلی ہے اگر مجھ پر بھروسا کر کے نہیں بتائے گی تو مجبوراً زبردستی اگلوانا پڑے گا، آخر معاملہ کیا ہے، تبھی میں اُس کی مدد کر سکوں گا۔ سکندر نے اُس کی سمت دیکھا تھا۔

''ہوں، ٹھیک ہے، اور گھر کیسے جاؤ گے؟''

''بائے ٹرین!'' اُس نے مختصراً بتایا۔

''یار کیا سکھر جیسے ریگستان اور دور دراز شہر میں رہائش اختیار کر رکھی ہے خالہ کو بھی تنہا کر رکھا ہے، پاکستان میں کتنے خوبصورت بارونق شہر اور جگہیں ہیں، مگر تم ہو کہ ساری رونق چھوڑ کر ویرانوں میں گھر تلاش کرتے ہو۔ عجیب آدم بیزار قسم کے بندے ہو۔'' عثمان نے اپنا پسندیدہ موضوع چھیڑا۔

''تم جانتے ہو، مجھے دیہات کی سی سادہ اور خاموش زندگی اٹریکٹ کرتی ہے، وہاں کے سادہ لوح لوگوں کے کام آ کر مجھے اچھا لگتا ہے۔'' اس کے لہجے میں سچائی تھی۔ عثمان متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

''وہ تو ہے میری جان، مگر شہر کے لوگ بھی کچھ کم محبت نہیں کرتے تم سے! اک بار آ کر تو رہو، تم چیز ہی ایسی ہو، کوئی تمہارے سحر سے آسانی سے نہیں بچ سکتا۔'' اُس کے لہجے میں سکندر کے لیے محبت ہی محبت تھی۔ عثمان کو پھر سے پٹڑی سے اُترتا دیکھ کر سکندر اپنی جگہ سے اُٹھا۔

''دیکھا، تم ہمیشہ کی طرح بے رُخی دکھا رہے ہو، یار اتنا غرور اچھا نہیں، کبھی تو محبت کا جواب محبت سے دے دیا کرو۔'' اُس نے دُکھی ہونے کی اداکاری کی۔

''تم کبھی نہیں سدھرو گے۔'' سکندر نے اُس کے کندھے پر ہاتھ مارا۔ وہ ہنسا تو عثمان بھی مسکرا دیا۔ بچپن کے بہترین دوست وقت کے ساتھ بھی

نہیں بدلے تھے، اُن کی دوستی آج بھی مثالی تھی۔ اور یہ حقیقت تھی کہ عثمان اُس کی شخصیت سے بے طرح متاثر تھا۔ وہ جہاں جاتا، باوجود کم گوئی اور الگ تھلگ رہنے کے لوگوں کے دلوں میں گھر کر جاتا۔

''جلدی جاؤ، وہ لڑکی تمہاری دہشت سے، سمندر میں ہی چھلانگ لگا کر تم سے چھٹکارا نہ پالے، اُلٹا لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔'' عثمان کو وجیتا کی کچھ دیر پہلے کی گئی گفتگو یاد آئی تو مذاق اُڑاتے ہوئے کہا۔ سکندر مسکرا کر پلٹا اور قدم آگے بڑھائے۔

''تمہاری راہ دیکھ رہی ہوگی، جلدی جاؤ۔'' پیچھے سے اس کی ہنستی ہوئی آواز نے اس کا پیچھا کیا۔ سکندر نے اک لمحے کے لیے پلٹ کر اُسے گھورا۔

''میں ڈر گیا۔'' عثمان نے ڈرنے کی ایکٹنگ کرتے دونوں ہاتھ اوپر کر کے پیچھے ہٹتے ہوئے خوفزدہ لہجے میں کہا تھا۔ وہ سیڑھیاں چڑھتا اوپر چلا آیا۔

وہ اپنے پسندیدہ شغل یعنی رونے میں مصروف تھی، سکندر کو اُس کا بلاوجہ رونا تیخ پا کر گیا، مگر اُس نے خود پر قابو پا کر پُرسکون کیا تھا۔

''بندے کو اتنا بھی بزدل نہیں ہونا چاہیے۔'' وہ آہستی سے اُس کے پاس آ بیٹھا، وجیتا نے جلے آنسو پونچھے۔

''محترمہ کے کافی نادر خیالات ہیں میرے بارے میں۔'' سکندر کو عثمان کی باتیں جو وجیتا نے اُس کے متعلق کی تھیں یاد آئیں تو اُس نے سوچتے ہوئے اُن محترمہ کو دیکھا، جو سر جھکائے ڈری سہمی سی بیٹھی تھی۔ اُس نے نظریں دوبارہ موڑ لیں۔

''کل تک ہمارا بحری سفر ختم ہو جائے گا۔'' سکندر نے سامنے دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے کہا تھا۔ وہ خاموش رہی۔

''باقی کا سفر ہمیں ٹرین سے کرنا ہوگا۔'' سکندر نے مزید کہا۔

''ہمیں؟'' وجیتا نے حیرت اور بے یقینی سے اُس کی سمت دیکھا گویا یہ بلا اتنی آسانی سے ٹلنے والی نہیں۔

''ہوں...... سکھر جائیں گے۔'' وہ ہنوز سامنے دیکھتا سنجیدگی سے بولا۔

''سکھر...... وہاں کون ہے؟'' وجیتا کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔

''میرا گھر۔'' سکندر کے تحمل میں کوئی فرق نہ آیا۔

''آپ کا گھر......! مگر میرا وہاں کیا کام؟'' وہ سکندر کی سمت دیکھتی بلند آواز میں کہہ کر اپنی جگہ سے اُٹھی تھی۔ اردگرد کے لوگ اُن کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔ سکندر نے سر اٹھا کر اپنے سامنے کھڑی وجیتا کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھا تھا۔

وجیتا کو اب احساس ہوا تھا، حالت کی سنگینی کا، وہ کچھ خجل اور کچھ نڈھال سی، بے بس ہو کر دوبارہ اپنی نشست پر بیٹھ گئی۔ اک لمحے کا عمل تھا، وہاں موجود لوگ دوبارہ اپنے کاموں میں لگ گئے تھے۔

''میں آپ کے ساتھ نہیں جانا چاہتی۔'' سر جھکائے آہستگی سے کہتے وہ رو پڑی۔ غصے کی اک تند و تیز لہر سکندر کے اندر اُٹھی تھی، مگر اُس نے خود پر بروقت قابو پایا تھا۔

''اب اگر تم نے مزید ایک لفظ بھی کہا، تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔ بھاڑ میں گئی تمہاری مدد...... اک لمحے کی تاخیر کیے بغیر سمندر میں پھینک دوں گا، ایک منٹ بھی نہیں لگے گا مچھلیوں کی خوراک بننے میں!'' وہ دھیمی آواز سے غرایا تھا۔ یہ غصے کی انتہا تھی جو وہ تم کہہ کر مخاطب ہوا تھا۔ اپنا اتنا بھیانک انجام سوچ کر ہی وجیتا نے خوف سے جھرجھری لی تھی۔ سکندر کی دھمکی کے بعد مزید اُس نے اک لفظ نہیں کہا تھا، بس سر جھکائے خاموشی سے آنسو بہاتی رہی۔

باقی سفر میں اُس نے سکندر کی ہر بات خاموشی سے مانی تھی۔ سمندر کے سفر میں وہ اُس سے فرار

ہونے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی اور یہ ممکن بھی نہیں تھا۔ مگر اُس کے ذہن نے ساری پلاننگ بنالی تھی، سکھر جاتے ہوئے وہ ٹرین سے فرار ہو جائے اُسے سکندر کے ساتھ جانا ہرگز منظور نہ تھا۔

☆......☆

وجیتا ٹرین سے باہر بھاگتے دوڑتے مناظر غائب دماغی سے دیکھ رہی تھی۔ اُس کے سامنے والی لمبی سی سیٹ پر سکندر سو رہا تھا۔ بحری جہاز سے اُتر کر بندرگاہ، پھر ریلوے اسٹیشن اور وہاں کے مسافر خانے میں رات کا کھانا کھانے تک وہ موقع کی تلاش میں رہی، مگر سکندر اُس کا سایہ بنا ہوا تھا۔ اب اُسے جو کچھ کرنا تھا آج کی رات ہی کرنا تھا۔''

وضو وہ گھنٹہ بھر پہلے اسٹیشن پر کر چکی تھی، جائے نماز اٹھا کر سکندر کے سرہانے دروازے کے پاس بچھائی۔ دو رکعت نفل ادا کر کے اُس نے دُعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ سکندر کی آنکھ کھل چکی تھی، مگر وہ سستی سے لیٹا رہا۔

''اللہ میری مدد کر، میں ایمان لائی، تجھ پر احسان نہیں کیا، بلکہ ایمان جیسی دولت دے کر تُو نے مجھ پر احسان کیا۔'' اُس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

''اپنی جان اور اپنے ایمان کی حفاظت کے لیے میں نے اپنا گھر، پریوار، اپنا دیش چھوڑا، یہ مجھ پر فرض تھا، تیرے آسرے پر چھوڑا کے تُو مجھے اکیلا نہیں چھوڑے گا، تُو نے میری مدد کی، پاکستان کی سرزمین تک پہنچایا، اب میری مدد کر...... کہ میں اس خطرناک شخص سے اپنا پیچھا چھڑا لوں، میں نہیں چاہتی کہ تن تنہا میں کسی مصیبت میں پھنس جاؤں، یہاں میرا کوئی اپنا نہیں، سوائے تیرے، میری مدد کر مالک!'' اُس نے دعا مکمل کر کے اپنے آنسو پونچھے۔ اب اُسے جو کچھ کرنا تھا نہایت پھرتی سے، سکندر کے سوتے میں ہی کرنا تھا۔

جائے نماز تہہ کر کے سیٹ پر رکھی، آہستگی سے چلتی اپنے سیٹ پر کونے میں پڑا سفری بیگ اُٹھایا اور اسی قدموں پلٹ کر سکندر کے پاس سے دبے پاؤں گزرنے لگی۔

''ایک خطرناک شخص سے جان چھڑا کر کتنے خطرناک لوگوں کے چنگل میں پھنسنے کا ارادہ ہے، محترمہ؟'' سکندر نے ہنوز لیٹے ہوئے سکون سے اُس کی سمت دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ اُس کی بھاری اور بوجھل آواز سُن کر وجیتا ساکت رہ گئی تھی۔ یہ تو اس کے وہم وگمان میں نہ تھا کہ وہ جاگ رہا ہے، اور سب کچھ سُن چکا ہے اب تو موت یقینی تھی، وہ خوفزدہ ہو کر دو قدم پیچھے ہٹی تھی۔

''میں جواب کا منتظر ہوں؟'' سکندر نے سیدھے ہو کر بیٹھتے ہوئے سنجیدگی سے کہا تھا۔ وہ جو پھٹی پھٹی نظروں سے اُس کی سمت دیکھ رہی تھی، خوف کی جگہ اب صدمے نے لے لی تھی، اس کا سارا منصوبہ بُری طرح سے فیل ہو چکا تھا۔

''کیا چاہتے ہیں آخر آپ مجھ سے؟'' بیگ سیٹ پر پٹخ کر وہ خود بھی گرنے کے سے انداز میں بیٹھی تھی اور سر جھکا کر دونوں ہاتھوں سے پکڑتے رو پڑی۔ (رونے کے سوا محترمہ کو اور کوئی کام ہی نہیں۔)

''نان سینس! اُس نے ناگواری سے اُس کی طرف دیکھا۔

''میں کوئی جن بھوت تو نہیں محترمہ! جو آپ کو غائب کروا دوں گا یا سالم کھا جاؤں گا۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہا آپ مجھ سے اتنی خوفزدہ کیوں ہیں؟'' اب کے وہ جھلا کر سمجھاتے ہوئے ذرا نرمی سے بولا۔ وہ اُس کے رونے سے بیزار تھا، وہ تھی کہ ہنوز رو رہی تھی۔

''میں آپ کی مدد کرنا چاہتا ہوں، آپ ہیں کہ مجھے غلط ثابت کرنے پر تلی ہوئی ہیں، لاحول و لاقوۃ...... مجھے اتنی متنازع شخصیت بنا کر پیش کر رہی

ہیں کہ میں خود سے شرمندہ ہو رہا ہوں۔'' اُس کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

''مجھے اپنے بارے میں سب کچھ صاف صاف بتاؤ...... یہ یاد رہے کہ سچ ہو، مجھے جھوٹ سے سخت نفرت ہے۔'' اب کہ وہ تیز لہجے میں بولا تھا۔

''میرے پاس بتانے کو کچھ نہیں۔'' وجیتا نے آنسو پونچھتے، دھیمی آواز میں کہا۔

''مجھے سچ سُننا ہے، وگرنہ چلتی گاڑی سے نیچے پھینک دوں گا تمہیں!'' اب کے اُس نے غراتے ہوئے دھمکی دی تھی۔

''آپ ایک اجنبی شخص ہیں، میں کیسے آپ پر بھروسا کروں؟'' دھمکی کارگر ثابت ہوئی، اُس نے شکایت بھری نظروں سے سکندر کی طرف دیکھا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

''اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں، آپ مکمل میرے رحم و کرم پر ہیں۔'' سکندر نے کندھے اُچکا کر کہتے اُس کو خوفزدہ کرنا چاہا۔ اور ہوا بھی یہی، اس کی بات سُن کر اک پل لگا تھا اُسے خوفزدہ ہونے میں۔''

وجیتا نے آنسو چادر سے صاف کیے اور آہستگی سے شروع سے آخر تک حرف بہ حرف سچ بیان کیا۔ سکندر نے سر جھکائے، ایک ایک حرف مکمل دھیان اور خاموشی سے سُنا تھا۔ ایک بار بھی اُس نے نظر اُٹھا کر وجیتا کی سمت نہیں دیکھا تھا۔ اپنی بات مکمل کر کے وہ خاموش ہوئی، سکندر بھی کئی لمحے تک اُسی طرح خاموش بیٹھا رہا۔

''آپ پہلے ہی مجھے سب سچ بتا دیتیں، تو نہ ہی میں آپ پر غصہ ہوتا اور نہ آپ اتنا خوفزدہ رہتیں، خیر سفر تو کٹ چکا، آپ مجھ پر بھروسا رکھیں، میں آپ کی بھرپور مدد کروں گا۔'' سکھر میں ہمارا بڑا سا گھر ہے، میری ماں جی وہاں اکیلی رہتی ہیں، کام کے سلسلے میں میں اکثر باہر رہتا ہوں، آپ ماں جی کے ساتھ بلا خوف و خطر رہ سکتی ہیں، اکثر ہمارے ہاں لاوارث اور حالات کی ستائی عورتیں آتی ہیں، ماں جی اُن کی مدد کر کے بہت اچھا محسوس کرتیں ہیں، آپ کو اُن سے مل کر بہت اچھا لگے گا، وہ آپ کو بہت محبت دیں گی۔'' اُس نے وجیتا کو نرمی سے مخاطب کیا۔

اُمید ہے میرے بارے میں کچھ جان کر آپ کا خوف ختم ہو چکا ہوگا، میرا کسی بھی تنظیم سے کوئی تعلق نہیں، اک عام سا بندہ ہوں، تبلیغ کے کام سے منسلک ہوں، وہ بھی اپنی خوشی سے، کراچی میں بابا کا بزنس ہے جو میرے دوست احباب چلاتے ہیں، مجھے اُن پر مکمل بھروسا ہے، خاص کر عثمان...... میں بھی کبھی کبھار چکر لگا لیتا ہوں، یہی میری مصروفیات اور سرگرمیاں ہیں۔'' وہ اپنے بارے میں کہتے ذرا دیر کو خاموش ہوا۔

''آپ کا نام آج سے وجیتا نہیں، حور یہ ہے، او کے!'' اُس نے مسکرا کر وجیتا کی سمت دیکھا۔ وجیتا نے سر اثبات میں ہلایا تھا۔

''اب تو مجھ سے خوفزدہ نہیں؟ یقیناً میں خطرناک بندہ نہیں ہوں۔'' سکندر کے پوچھنے پر وہ جھینپ کر نفی میں سر ہلاتے مسکرائی تھی۔

☆......☆

ماں جی نے اُن کا استقبال بہت اچھی طرح سے کیا تھا۔ سکندر نے اس کا تعارف یہ کہہ کر کروایا تھا کہ وہ کچھ دن اُن کے ہاں مہمان رہیں گی۔

ماں جی کی فطرت میں تجسس یا کھوج نہ تھا، اس کے غسل کے اہتمام سے لے کر کھانا کھانے اور چائے پینے تک انہوں نے سارا انتظام بہت شاندار طریقے سے کیا تھا۔ قطار میں بنے کشادہ کمرے، برآمدے اور بڑے سے کھلے میدان سے صحن پر مشتمل اُس بڑے سے گھر میں صرف دو افراد رہتے

تھے۔ گاؤں کی سادہ لوح عورتیں اور غریب خدمت گار عورتیں بھی گھر کی رونق بڑھانے میں معاون تھیں۔ سرخ اینٹوں سے بنا وہ گاؤں کی طرز کا کشادہ گھر حوریہ کو بہت پسند آیا تھا۔

وہ ماں جی کی پُر خلوص اور محبت بھری شخصیت سے بہت متاثر ہوئی تھی۔ کھانے کے بعد ماں جی اُسے اک کمرے میں آرام کی غرض سے چھوڑ گئی تھیں۔ جیسی ہی وہ نواڑی پلنگ پر لیٹی، آرام دہ بستر میسر آتے ہی وہ نیند کی میٹھی آغوش میں چلی گئی۔

سکندر ماں جی کے ساتھ برآمدے میں بیٹھا، ماں کو حوریہ کے متعلق حرف بہ حرف سچ سے آگاہ کر رہا تھا۔ سب کچھ جان کر ماں جی کے دل اُس کے لیے ہمدردی اور محبت مزید بڑھ گئی تھی۔

☆......☆

''ارے بیٹا! یہ کیا کرنے لگی ہو؟ چھوڑو یہ سب کام کرنے کو لوگ بہت ہیں۔ تم کیوں خود کو تھکاتی ہو۔''

حوریہ برآمدے کی صفائی کے بعد اب صحن میں جھاڑو دے رہی تھی، کچن سے نکلتی ماں جی نے اُسے روکا تھا۔

''آپ ہر وقت میرے لیے مزے مزے کے کھانے بناتیں ہیں، مجھے کچن کا کام نہیں آتا، باقی کا کام میں اپنی خوشی سے کرنا چاہتی ہوں۔

''تم میری بیٹی ہو، اور کون سی ماں ہوگی جو بیٹی کے لیے کھانا بنا کر تھک جاتی ہو...... گھر بہت بڑا ہے اور صحن بھی کچا ہے۔ تم کہاں عادی ہو اِن کاموں کی ...... اتنی دھوپ یں تم جھاڑو دو گی تو مجھے دُکھ ہوگا، چلو ہاتھ دھو کر فٹافٹ میرے پاس آؤ، مجھے تم سے باتیں کرنی ہیں۔'' ماں جی نے اُسے سختی سے منع کر دیا، حوریہ کے پاس اب کہنے کو بچا ہی نہ تھا۔ وہ خاموشی سے ہاتھ دھونے چلی گئی۔

سکندر جس دن اُسے ساتھ لایا تھا، اُسی دن گھر پر رہا، آج ہفتہ ہونے کو آیا تھا، مگر وہ دکھائی نہ دیا۔

ماں جی نے بتایا تھا وہ دنوں مہینوں تک گھر سے باہر رہتا ہے وہ اب عادی ہو چکی ہیں۔

دیہات کی عورتیں آ کر ماں جی کا سارا کام کر دیتیں، گاؤں کی بچیاں بھی ماں جی سے پڑھنے آتی تھیں، اکثر ہی عورتوں کا تانتا بندھا رہتا کوئی مسئلہ پوچھنے آئی ہوتی تو کوئی اپنے معاشی مسائل سُلجھانے، ماں جی خندہ پیشانی سے ہر کسی کی مدد کرتیں۔ کچن کا کام ماں جی کسی کو کرنے نہ دیتیں، اُن کا کہنا تھا کہ وہ وہ اپنی بیٹی (حوریہ) کے لیے اپنے ہاتھ سے کھانا بنائیں گی۔ وہ ہاتھ دھو کر اُن کے پاس آ بیٹھی۔

''بہت خوش نصیب ہو تم! اللہ نے اپنے رستے کے لیے چُن لیا اور تم سے اتنا بڑا کام لیا، اتنی چھوٹی سی عمر میں تم نے سارا کچھ اللہ کے لیے اُس کے رستے پر قربان کر دیا۔'' ماں جی نے شفقت سے کہا تھا۔

سورۃ بقرۃ کی ایک آیت ہے، تمہیں سُنانا چاہوں گی۔'' وہ مزید بولیں تھی۔

صبغۃ اللہ

اللہ کا رنگ اختیار کرو

ومن احسن من اللہ صبغۃ

اور اللہ سے اچھا رنگ کس کا ہوگا

اور ہم تو اُسی کی عبادت کرنے والے ہیں۔

عیسائیوں نے زرد رنگ کا پانی مقرر کر رکھا ہے، جو ہر بچے اور اُس شخص کو دیا جاتا ہے، جسے عیسائی بنانا مقصود ہو، اسے بتسمہ کہتے ہیں اور یہ اُن کے نزدیک بہت ضروری ہے، اس کے بغیر وہ کسی کو پاک تصور نہیں کرتے۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کی تردید فرمائی اور کہا کہ اصل رنگ تو اللہ کا رنگ ہے، اس سے بہتر کوئی رنگ نہیں، اللہ کے رنگ سے مراد دین وفطرت یعنی دین اسلام ہے، جس کی ہر نبی نے اپنے اپنے دور میں اپنی امتوں کو دعوت دی یعنی دعوت توحید۔'' وہ

خاموش ہوئیں۔

"بہت اعلیٰ، مجھے بھی قرآن سکھائیں نا ماں جی۔" حوریہ بہت متاثر نظر آئی تھی۔

"کیوں نہیں، یہی بات میں تم سے کہنا چاہتی تھی، ماشاء اللہ سے نماز تمہیں حرف بہ حرف یاد ہے اور تم باقاعدگی سے پانچ وقت کی نماز ادا کرتی ہو، مگر قرآن کی اہمیت اپنی جگہ، اُسے پڑھے بغیر زندگی گزارنے کا ڈھنگ نہیں سیکھا جاسکتا۔" ماں جی نے بہت خوبصورت سے اُسے آگاہ کیا تھا۔

"میں آج ہی سے قرآن پڑھنا شروع کروں گی۔" حوریہ نے پُرجوش ہوکر خوشی سے کہا۔

ماں جی نے اُس کے دھوپ کی تمازت سے چمکتے حسین چہرے کو محبت سے بوسہ دیا تھا۔

☆......☆

سکندر کے ہاں اُس کا چھٹا مہینہ تھا، ماں جی نے اُسے قران مکمل کروادیا تھا۔ آج اُس کی آمین تھی۔

ان چھ مہینوں میں اُس نے سکندر کو دوبار گھر میں دیکھا تھا۔ اب بھی وہ کام کے سلسلے میں باہر تھا۔

اُن کا گھر حوریہ کے لیے نعمت کدہ تھا، روز ماں جی اور سکندر کی نئی اچھائی اُسے سننے اور دیکھنے کو ملتی۔

وہ بہت خوش تھی ماں جی نے اُسے ماں باپ کی کمی محسوس نہیں ہونے دی تھی۔ اُس کو خوش کرنے کے لیے وہ چھوٹی چھوٹی خوشیاں منانے سے بھی دریغ نہ کرتیں۔ یہی وجہ تھی کہ آج انہوں نے اُس کی آمین کی رسم رکھی تھی تاکہ وہ اُن لوگوں کے رسوم سے آگاہ ہوسکے۔

ماں جی نے دیہات کے بچوں میں مٹھائی تقسیم کروائی تھی اور عورتوں کے لیے گھر میں رات کے کھانے کا اہتمام یعنی دعوت تھی۔

ماں جی نے بینائی کی کمزوری کے باوجود، دن رات بیٹھ کر حوریہ کے لیے آج کے دن کی مناسبت سے سفید رنگ کا خوبصورت ریشمی لباس تیار کروایا تھا۔ سفید لباس اور ہم رنگ موتیوں کے زیورات پہنے، وہ آسمان سے اُتری کوئی پری محسوس ہورہی تھی۔ ہر کوئی اس پری پیکر کی تعریف میں رطب اللنسان تھا۔

پورے گھر میں تتلی کی سی اُڑان بھرتی اج جگہ سے دوسری جگہ گھوم پھررہی تھی۔ ماں جی نے دل ہی دل میں ماشاء اللہ کہا تھا۔ دعوت بخوبی اہتمام کو پہنچی، دیہاتوں میں لوگ عموماً سرِ شام ہی کھانے سے فارغ ہوجاتے ہیں۔ ماں جی اور حوریہ بھی فارغ ہوکر عشاء کی نماز پڑھنے کے بعد کمرے میں بیٹھیں باتیں کررہی تھیں۔

اسلام وعلیکم! سکندر نے چھوٹا سا سفری بیگ زمین پر رکھا اور ماں جی کے پاس آکر سر جھکایا۔

وعلیکم اسلام! جیتے رہو میرے شہزادے، انہوں نے اُس کے گھنے بالوں پر محبت سے بوسہ دیتے ہوئے دعا دی۔

"دیر کردی مگر بہت اچھے موقع پر آئے ہو۔" وہ شفقت سے مسکرائیں۔

"اسلام علیکم!" اب کے اُس نے ماں کے پاس پلنگ پر بیٹھی حوریہ کو سلام کیا۔

"وعلیکم اسلام!" وہ دھیمی آواز میں بولی تھی۔

"خیریت ماں جی؟" وہ پاس پڑی کرسی پر بیٹھتے چمکتی دمکتی حوریہ کی سمت دیکھتے ہوئے ماں جی سے مخاطب ہوا تھا۔

"قرآن مکمل کرلیا ہے میری بیٹی نے، آج اُسی کی رسم رکھوائی تھی۔" ماں جی نے حوریہ کی سمت محبت پاش نظروں سے دیکھتے کہا تھا۔

"ماشاء اللہ، بھئی مبارک ہو آپ کو!" وہ مسکرایا۔

سفید لباس میں حوریہ بے حد حسین لگ رہی تھی۔

"شکریہ۔" وہ جھینپ کر آہستگی سے بولی۔

حوریہ بیٹی، سکندر کو اپنی آمین کی دعوت نہیں کھلاؤ گی؟ وہ حد درجہ شرمندہ ہوئی۔

''ابھی لائی!'' وہ اُٹھی اور کمرے سے نکل گئی۔ میں ذرا منہ ہاتھ دھولوں۔ سکندر بھی اُٹھ کر باہر چلا گیا۔ وہ واپس آیا تو حوریہ کھانا لگا چکی تھی۔

''واہ بھئی کھانا تو بہت زبردست ہے۔'' سکندر کی بھوک قورمہ بریانی دیکھ کر مزید چمک اٹھی تھی۔ حوریہ جانے لگی تھی کہ سکندر کی آواز پر رُک گئی۔

کھانا کھانے کے بعد میں نماز پڑھوں گا، پھر کچھ دیر مطالعے میں لگے گا، سونے سے پہلے مجھے چائے پینے کی عادت ہے، خود میرا بالکل موڈ نہیں بنانے کا، اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو چائے بنادیں گی؟ اُس نے حوریہ کے تھکن کے خیال سے وضاحت دی۔

اٹس اوکے، میں بنادوں گی! اُس نے مسکرا کر سکندر کو جواب دیا اور پلٹ کر کمرے سے نکل گئی۔ سکندر کے کھانا کھانے کے بعد وہ برتن اُٹھا کر کچن میں آ گئی، برتن دھو کر اپنی جگہ پر رکھنے کے بعد وہ صحن کی اک طرف موجود چھت کو جاتی سیڑھیوں پر آ بیٹھی۔

مکمل چاند آسمان کی دلکشی بڑھا رہا تھا۔ اُس کی چاندنی پورے صحن میں پھیل کر ماحول کو مزید خوبصورت اور پُرفسوں بنا رہی تھی۔ سر سے پیر تک سفید لباس میں ملبوس حوریہ، چاندنی کا حصہ ہی معلوم ہو رہی تھی۔ سارے دن کی بھاگ دوڑ کے بعد تنہائی میسر آتے ہی وہ سریندر سنگھ اور پاربتی کو یاد کرتی رہی۔

اسے یہاں کسی شے کی کمی نہ تھی، مگر ماں باپ کی یاد اک فطری سی بات تھی جو اُسے اکثر اُداس اور بے چین کر دیتی۔

لمحے سرکتے رہے، وہ یادوں کے گہرے سمندر میں اُترتی رہی، معاً وہ چونکی سکندر نے اُسے چائے کا کہا تھا۔ وہ سرعت سے کچن کی سمت چائے بنانے گئی تھی۔

اپنا کپ کچن میں رکھے وہ سکندر کا کپ لیے ماں جی کے کمرے میں چلی آئی۔ ماں جی بے خبر سو رہی تھیں۔

پاس ہی کرسی پر بیٹھا سکندر کوئی کتاب ہاتھ میں لیے مطالعہ میں مگن تھا۔ کھٹکے پر اُس نے مڑ کر دیکھا، حوریہ دروازے میں کھڑی تھی۔

آیئے! اُس نے کتاب بند کر کے سائیڈ ٹیبل پر رکھی اور سیدھے ہو کر بیٹھتے ہوئے دونوں آنکھوں کے پپوٹے انگلی کی پوروں سے دبائے۔ بے آرامی اور تھکن کے سبب اُس کی آنکھیں سُرخ ہو رہی تھیں۔

ناحق آپ کو زحمت ہوئی۔ اُس کے ہاتھ سے کپ لیتے سکندر نے انکساری سے کہا۔

''کوئی بات نہیں۔'' وہ اُداسی سے مسکرائی اور پلٹ کر باہر نکل گئی۔ اپنا کپ کچن سے لاکر وہ دوبارہ سیڑھیوں پر آ کر بیٹھی۔ بیتے دنوں کو یاد کرتے ہوئے وہ گھونٹ گھونٹ چائے پیتی رہی۔ سکندر چائے پی کر کمرے سے نکلا، اُس کا رُخ کچن کی سمت تھا مگر حوریہ کو تنہا سوچوں میں مگن بیٹھا دیکھ کر اُس کی سمت چلا آیا۔

''خیریت، آپ سوئی نہیں؟'' وہ حیران ہوا۔

وہ شرمندہ ہوئی، بغیر کسی خونی رشتے کے وہ لوگ اُس کا اتنا خیال رکھتے تھے۔

''بس سونے ہی لگی تھی۔ کیا سوچ رہی تھیں آپ؟ اُس نے شاید جاننے کا تہیہ کر لیا تھا۔ ممی بابا کے بارے میں سوچ رہی تھی۔'' اُس نے سر جھکائے دھیمی آواز میں کہا۔ سکندر کا حساس دل اس حسین سی لڑکی کی اُداسی پر دُکھ سے بھر گیا۔ آپ نے اللہ کے لیے سب کچھ چھوڑ دیا، اللہ آپ کو وہ سب کچھ دے گا۔ اور پہلے سے بہتر حالت میں دے گا، اُس کی ذات سے ہرگز مایوس مت ہونا، ستر ماؤں سے بڑھ کی محبت کرنے والی اللہ کی ذات آپ کو کبھی تنہا نہیں کرے گی، صرف بھروسہ شرط ہیں وہ رکھیں گی تو کامیاب ہوں گی اُس کا ڈھارس دیتا لہجہ اور

خوبصورت الفاظ حوریہ کے دل پر اثر کر گئے۔
اُس کے دل پر چھائے کثافت کے بادل یک لخت چھٹ گئے تھے۔
تھینک لو! وہ ممنون نظر آئی۔ کس بات کے لیے؟ سکندر نے حیرانگی سے دریافت کیا۔
"اتنے اچھے الفاظ میں تسلی دینے کے لیے۔"
اپنا جھکا سر اُٹھا کر وہ سکندر کی طرف دیکھتے خوش دلی سے مسکرائی۔
"یہ تو میرا فرض ہے، اینی وے محترمہ! رات کافی ہو چکی ہے اب آپ کو سو جانا چاہیے۔" وہ بھی جواباً مسکرایا۔ حوریہ اپنا کپ اُٹھا کر آگے بڑھی۔ سکندر اور وہ ایک ساتھ کچن کی سمت قدم بڑھانے لگے تھے کہ حوریہ جھینپ کر اُسی جگہ رُک گئی۔ سکندر نے اُسے اور اُس نے سکندر کی سمت دیکھا، دونوں کے ہاتھ میں چائے کے خالی کپ تھے۔
لائیے، مجھے دیجیے، میں دھو کر رکھ دوں گا، ویسے بھی آپ آج کافی تھک گئی ہیں۔" اُس نے ہاتھ آگے بڑھایا۔ حوریہ نے خاموشی سے اپنا کپ اُسے تھما دیا۔
"شب بخیر!" وہ کہہ کر کچن کی سمت چلا گیا۔
حوریہ نے بھی زیرِ لب جواب دیا اور کمرے کی سمت چلی آئی۔ معمول کی طرح اُس نے آج رات بھی بابا کا دیا موبائل چیک کیا اور ہر رات کی طرح آج بھی وہ مضطرب سی لیٹ گئی تھی۔

☆......☆

بتایئے سریندر چچا؟ کہاں چھپایا ہے وجیتا کو، کس کے ساتھ گئی ہے وہ؟" جانتا ہوں میں...... شروع سے مجھے پسند نہیں کرتی تھی، کس یار کے ساتھ منہ کالا کر کے گئی ہے؟ آپ کا ہاتھ ہے اس میں۔ میری ہونے والی پتنی کو غائب کروا دیں گے اور میں خاموش رہوں گا، کیسے سوچ لیا آپ نے؟ سریندر سنگھ کو گلے سے دبوچے آکاش غصے سے پاگل ہو رہا تھا۔

پاربتی اپنے پتی کو اُس سے چھڑوا رہی تھی مگر اُس کی گرفت سخت تھی۔ وہ بری طرح سے کھانس رہے تھے، پاربتی روتے ہوئے مسلسل آکاش کی منت کر رہی تھی، مگر اُس پر کسی بات کا اثر نہیں ہو رہا تھا۔
حوریہ کی آنکھ اس بھیانک خواب سے کھلی تو اُس کا سانس دھونکنی کی مانند چل رہا تھا۔
"بابا" وہ سریندر سنگھ کو پکارتی رو پڑی۔
حوریہ سحر خیزی کی عادی تھی، پہلے دن سے آج تک اُس کے معمول میں کمی نہیں آئی تھی، سورج سر پر آچکا تھا مگر حوریہ ابھی تک کمرے سے نہیں نکلی تھی، ماں جی کو تشویش نے گھیرا تو وہ اُس کے کمرے میں چلی آئی، وہ سامنے بستر پر بے سُدھ پڑی تھی۔
قریب آ کر انہوں نے اُس کا ماتھا چھوا، وہ بُری طرح بخار میں جل رہی تھی۔ ماں جی اُس پر نظر کا دم کر رہی تھیں، اُن کا خیال تھا کل وہ بے حد خوبصورت لگ رہی تھی، کسی کی بُری نظر لگی ہوگی، سکندر بخار کی دوا لایا کہ اُس سے بہتر نہ ہوتی تو ڈاکٹر کو دکھا دیں گے۔ ماں جی نے اُسے دودھ کے ساتھ دوا دی تھی۔
کل سے وہ اپنے ماں باپ کو یاد کر رہی تھی پھر وہ بھیانک خواب اُس کے کمزور اعصاب جواب دے گئے تھے، دوپہر تک وہ بہتر لگ رہی تھی۔
ماں جی کی محبت اور خلوص نے ایک بار پھر اُسے شرمندہ کر دیا تھا۔

☆......☆

اس بات کو ایک ہفتہ گزرا ہوگا کہ حوریہ کے موبائل پر سریندر سنگھ کی کال آئی تھی۔ اپنے بابا سے اتنے عرصے بعد بات ہونے پر وہ بہت خوش تھی، تقریباً ایک گھنٹہ انہوں نے بات چیت کی، ان دونوں میاں بیوی نے سکندر اور ماں جی سے بات کر کے اُن کا بہت شکریہ ادا کیا تھا۔
سریندر سنگھ نے سکندر کو بتایا کہ وہ اپنی بیوی کے

ہمراہ اسی ہفتے پاکستان آرہے ہیں۔ وہ دن حوریہ کی زندگی کا بہترین دن تھا۔ تینوں ایک ساتھ شام کی چائے پی رہے تھے کہ ماں جی نے اُس سے سریندر سنگھ اور آکاش کی بابت پوچھا۔

اُس نے سریندر سنگھ کا بتایا ایک ایک لفظ ماں جی اور سکندر کو بتا دیا تھا۔

وجیتا کے فرار ہونے کے بعد وہ دونوں گاؤں سے آئے تو انہوں نے بہت واویلا کیا، سریندر سنگھ اور پاربتی سے بھی سختی سے پیش آئے مگر اُن دونوں نے اپنی لاعلمی ظاہر کی اور بیٹی کی اچانک گمشدگی اُن کے لیے صدمہ ہو، یوں ظاہر کیا دیانند اور پرکاس نے اُن دونوں میاں بیوی کی زندگی عذاب بنا دی تھی۔

اُن کا کہنا تھا کہ وہ دونوں نا صرف بیٹی کے فرار سے واقف ہے بلکہ اُن کا اس سارے واقع میں برابر کا ہاتھ ہے۔

سریندر سنگھ کی ہر کال ٹریس کی جاتی، ہر جگہ اُن کی جاسوسی کی جاتی، اُن کے پیچھے بندے لگائے جاتے، حتیٰ کہ گھر میں بھی وہ اپنی مرضی سے گھوم پھر نہیں سکتے تھے۔ پرکاش بہت بار اُن کے بڑے پن کا لحاظ کیے بغیر بدتمیزی کر چکا تھا۔

مختصراً یہ کہ پرکاش اور پریا دونوں بہنیں بھائی دن بدن ماں باپ کی عدم توجہ کے سبب بگڑتے جا رہے تھے۔

پرکاش کا راتوں کو گھر سے غائب رہنا کھلے عام ہر طرح کا نشہ کرنا اور دن بدن بڑھتے خرچوں کا مطالبہ کرنا، عام عادت بن چکا تھا۔

ایک دن باپ سے بڑی رقم کیش مانگی دیانند کے انکار اور ڈانٹ پر دلبرداشتہ ہو کر رات کو نشے کی حالت میں دیانند سنگھ، پریا اور لکشمی کو سوتے میں شوٹ کر دیا تھا اور خود فرار ہوتے ہوئے پولیس کے ہتھے چڑھ گیا۔ اُن کا ایمان اور صبر اُن کے کام آ گیا تھا سارا مال جائیداد سب کچھ اُن کو مل گیا۔

بڑے بھائی کے ہوتے ہوئے وہ اپنا مسلمان ہونا چھپائے ہوئے تھے اب انہوں نے اپنا قبول اسلام ظاہر کر دیا تھا۔

پاربتی اپنے شوہر کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اسلام لا چکی تھی، اللہ کا اُن کے گھرانے پر خاص کرم تھا کہ اُن کو مشرف با اسلام کر دیا تھا۔

برائی کا انجام برا، مگر پھر بھی لوگ برائی کرنے سے باز نہیں آتے، انسان ہونے کے ناطے اُسے چچا چچی اور پریا کے قتل کا بہت افسوس تھا۔

چچا چچی اگر شروع سے اُس کا اتنا لاڈ نہ اٹھاتے صحیح غلط کی پہچان کرواتے اور اُس کی سرگرمیوں پر نظر رکھتے تو آج حالات یکسر مختلف ہوتے۔ حوریہ چچا کے گھرانے کا اتنا بھیانک انجام کہتے ہوئے خود بھی رو پڑی تھی۔ ماں جی نے اس حسین صورت اور پیار بھرے دل کی مالک لڑکی کو محبت سے گلے لگایا تھا سکندر اس بات پر خوش تھا کہ بالآخر صبر رنگ لے آیا حوریہ کو اپنے ماں باپ مل گئے تھے۔

☆......☆

حوریہ بہت اہتمام سے تیار ہوئی تھی۔ ماں جی کے ساتھ مل کر بابا ممی کے لیے کھانا تیار کیا تھا۔ سکندر انہیں ایئرپورٹ سے لینے گیا تھا، اُن کے گھر میں داخل ہوتے ہی حوریہ بھاگ کر بابا کے گلے لگ گئی۔ دیر تک اُن کے گلے لگی وہ روتی رہی انہوں نے پیار سے ڈپٹ کر اُسے زبردستی خود سے الگ کیا، اسی طرح ماں کے گلے لگی وہ روتی رہی۔ ماں جی بھی اُس کا دیوانہ پن دیکھ کر آبدیدہ ہو گئیں تھیں۔

غسل و نماز سے فارغ ہو کر سب نے مل کر کھانا کھایا۔

حوریہ کو ممی بابا کا یوں اُس کے ساتھ اک دستر خوان پر کھانا کھانا اک خواب سا لگ رہا تھا۔

وہ دونوں ماں جی اور سکندر کے بے حد شکر گزار تھے کہ اُن کی بیٹی کو یہاں شہزادیوں کی طرح رکھا گیا تھا۔

وہ حوریہ کو لینے آئے تھے اسی ہفتے انہوں نے واپس جانا تھا۔

سریندر سنگھ نے اسلامی نام عبدالباقر اور پاربتی کا اسلامی نام خدیجہ رکھا گیا تھا۔ حوریہ کو اُن کے نئے نام بہت پسند آئے تھے۔

☆......☆

دیہات کی عورتیں اور بچیاں، اس گھر کے در و دیوار اُس کے اتنے عادی ہو چکے ہیں کہ لگتا ہی نہیں وہ کبھی یہاں تھی ہی نہیں، سب اُس سے اتنے مانوس ہو چکے ہیں کہ اُس سے جدائیگی کا خیال ہی سوہانِ روح ہے، وہ مجھے بیٹیوں کی طرح عزیز ہو چکی ہے، اُس کو اپنے گھر میں چلتا پھرتا دیکھتی ہوں تو زندگی جینے کے امنگ دل میں سر اٹھاتی ہے، میں بوڑھی ہو چکی ہوں مجھے مستقل اک سہارے کی ضرورت ہے اور حوریہ سے بہتر میری نظر میں اور کوئی سہارا نہیں۔''

ماں جی سکندر کے سامنے افسردہ سی بیٹھی تھیں۔

حوریہ کچھ ہی دنوں میں جانے والی تھی، اور یہ سوچ کچھ غلط بھی نہ تھی کہ وہ اُس کے حقیقی والدین تھے۔ سکندر خاموش رہا۔

میں ابھی، آج ہی حوریہ کے حوالے سے تمہارے اور حوریہ کے نکاح کی درخواست کرتی ہوں...... تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں؟ وہ پریشان سی صورت لیے پُرامید نظروں سے سکندر کے وجیہہ چہرے کو دیکھ رہی تھیں۔

''آپ کی خوشی میرے لیے ہر بات سے بڑھ کر مقدم ہے۔'' اُس نے مبہم سا جواب دے کر سر جھکا لیا تھا۔

جیتے رہو میرے شہزادے، تم نے آج مجھے بے پناہ خوشی دی ہے، ہمیشہ شاد و آباد رہو میرے پیارے بیٹے!! وہ خوشی سے نہال ہوتے سکندر کے ماتھے پر بوسہ دیتے ہوئے گویا ہوئیں تھیں۔ ماں جی نے اُسی رات عبدالباقر صاحب اور خدیجہ بیگم سے اپنی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ انہیں بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔

عبدالباقر کو وہ ذہین آنکھوں والا کم گو و سنجیدہ جوان بہت اچھا لگا تھا۔ ایسے ہی ایک دین دار اور فرمانبردار بیٹے کی اُن کو آرزو تھی جو حوریہ کے توسط سے پوری ہو رہی تھی۔

زندگی پل پل اُن پر مہربان ہو رہی تھی، ہر کوئی اپنی ذات میں بے پناہ خوش تھا۔

☆......☆

حوریہ آج بھی سیڑھیوں پر بیٹھی تھی۔ سکندر اُسے دیکھ کر پاس چلا آیا، آج ہی تو اُن کی بات طے ہوئی تھی حوریہ نے شرما کے سر جھکا لیا تھا۔

سکندر نے سیاہ لباس میں ملبوس چمکتی دمکتی حسین سراپے کی مالک لڑکی کو استحقاق سے دیکھا جو بہت جلد اُس کی زندگی میں شامل ہونے والی تھی۔

اُسے بے اختیار وہ رات یاد آئی تھی، سفید لبادے میں ملبوس چاندنی رات کا حصہ معلوم ہوتی وہ حسین لڑکی آج کی رات اور اُس رات میں فرق صرف یہ تھا کہ اُس رات ایک چاند آسمان پر دوسرا زمین پر روشنی بکھیر رہا تھا۔ آج صرف اُس کا چاند زمین کو روشن کیے دے رہا تھا۔ اُسے ماں جی کے انتخاب پر رشک آیا تھا۔

''بہت خوش قسمت ہوں، جسے اللہ نے تم جیسی ایماں پرور، شریک حیات کے لیے چنا ہے۔'' سکندر نے اُس کے حسین چہرے کو تکتے بوجھل آواز سے کہا تھا۔ ماحول کے سکوت کو اُس کی بھاری آواز نے توڑا۔

''مجھ پر بھی اللہ کا بے حد احسان ہے کہ اُس نے آپ جیسا بلند کردار شخص میری قسمت میں لکھا۔'' وہ سر جھکائے دھیمی آواز میں بولی تھی۔ سوچ لیں

کالعدم تنظیم کے فرد کو جیل بھی جانا پڑ سکتا ہے، مشکل میں پڑھ سکتی ہیں۔" وہ شرارت پر آمادہ نظر آیا۔ اُس کی بات کا مفہوم سمجھ کر وہ جھینپ گئی تھی۔

"میں جواب کا منتظر ہوں؟" وہ باز نہ آیا۔

"مجھے پھر بھی منظور ہے۔" حوریہ نے شرما کر کہتے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپالیا تھا۔

سکندر جو بہت دلچسپی سے اُس کے چہرے کی سمت دیکھ رہا تھا، حوریہ کی معصوم ادا پر بے اختیار اُس کے منہ سے قہقہہ بلند ہوا تھا۔

اپنے کمرے سے نکلتے عبدالباقر نے یہ منظر دیکھ کر اُن کو ہمیشہ خوش رہنے کی دعا دی تھی۔

زندگی ایک تپتے ریگستان سے نکل کر حسیں راہ گزر پر چلنے لگی تھی۔

☆......☆

غزل

وہ ساعتِ رات جو گزری' کڑی تھی
میری تنہائی جب مجھ پر ہنسی تھی

تیرے ہمراہ تھا سارا زمانہ
میرے ہمراہ، میری بے بسی تھی

مجھے سونپے تھے جس دم زخمِ فرقت
تیری پلکوں پہ ہلکی سی نمی تھی

مخاطب مجھ سے خاموشی تھی شب بھر
مرے اطراف اتنی خامشی تھی

بہ نامِ زیست جو میں نے بسر کی
وہ زنجیر زیاں کی اک کڑی تھی

کٹھن تھے مرحلے صحرائے جاں کے
سرابِ عمر تھے اور تشنگی تھی

ذرا سی تو نے جو مہلت عطا کی
میری سمت، میری واپسی تھی

رفاقت کا دِیا بجھنے سے پہلے
یہاں اے صرصرِ غم روشنی تھی

خوشی کتنے مراحل سے گزر کر
ملی تو درد میں لپٹی ہوئی تھی

پروین حیدر

"میرے خدا چار گھنٹوں سے شابو نہیں ہے اور تم لوگ اتنے سکون سے بیٹھے کیا میرا انتظار کر رہے تھے۔" میں اپنی بے بسی اور تینوں کی بے حسی پر جل پڑا۔ "اور ماہیے آپ اُس ڈاکٹر ریشم کی باتیں۔" سلمیٰ کو تو جیسے زہر اگلنے کا بہانہ مل گیا تھا۔ میں نے حیرانگی سے اسے......

محبت کو اُوجِ کمال پر لے جاتا، ایک حساس افسانہ

شابو کو گم ہوئے چار گھنٹے ہو چکے تھے۔

"کہاں گیا ہوگا؟"

"کس کے ساتھ ہوگا؟"

"اگر اسے کچھ ہوگیا تو......" میں یہ سوچتے ہی گھبرا گیا۔ ایک بار پھر ماہ نور، زیبا سے پوچھا کہ بھائی کو آخری بار انہوں نے کہاں دیکھا تھا۔"

وہ دونوں روہانسی اسے ہی ڈھونڈ رہی تھیں اور بار بار یہی کہے جا رہی تھیں۔

"ابو جی شابو دروازے کے پاس ہی کھڑا تھا۔ میں پھر چیخ پڑا۔

"اور تم لوگ سوئے ہوئے تھے اس وقت۔ اور آپ کہاں تھیں۔ جو بیٹے کا خیال نہ رکھ پائیں۔" مجھے رہ رہ کر سلمیٰ پر غصہ آرہا تھا کہ وہ تو ماں تھی۔ اس نے کیسے لاپرواہی کرلی کہ شابو کو داخلی دروازے پر دیکھا اور سرزنش نہیں کی۔

"آپ کو معلوم ہے نہ کہ وہ بول نہیں سکتا۔ کسی کو اپنی بات سمجھا نہیں سکتا۔ وہ اپنا دفاع نہیں کر سکتا۔" اس کے ساتھ ہی میری آواز نے میرا ساتھ چھوڑ دیا۔ مجھے شابو کی معذوری نے ذہنی مریض بنا ڈالا تھا۔ میں جو پوری دنیا کو اپنے کاندھے پر اٹھائے پھرتا تھا، اس کی پیدائش کے چھ ماہ بعد بھربھری مٹی کی طرح زمین بوس ہوگیا۔

"سنیئے! مل جائے گا شابو۔" سلمیٰ کے نرم ہاتھ بھی مجھے اپنے شانوں پر کانٹوں کی طرح لگ رہے تھے۔

شابو بھلا کہاں جا سکتا ہے؟ کوئی دوست تو دور کی بات اس کی تو اپنی ماں بھی اس کے لیے چھاؤں نہ تھی اور بہنیں بھی غمگسار نہ تھیں۔ گھر میں اسے اتنا ہی پوچھا جاتا جتنا ضروری ہوتا۔ میرے خدا اسے تو سوائے بلاوجہ ہنسنے، ایک ٹک بولنے والے کو دیکھتے رہنے یا چلتے رہنے کے علاوہ کچھ اور آتا بھی تو نہ تھا۔ میری آنکھوں میں اپنے بیٹے شابو کی تنہائی پر نمی سی اتر آئی۔ قدرت بھی عجیب تھی اس کی کل کائنات میں شابو کو صرف دو لفظ

نصیب ہوئے تھے''ابو اور پاری۔''

پاری کا ذہن میں آتے ہی میں اسے ڈھونڈنے صحن میں اپنے کمرے میں آ گیا کہ اس وقت وہ دونوں زیادہ تر میرے ہی کمرے میں کھیلتے تھے۔ میں نے جہاں تک ممکن ہو سکتا تھا ہر کونے میں، بیڈ کے نیچے، الماری کے اندر دیکھ ڈالا پر پاری ہوتی تو ملتی۔ پاری شابو کی بلی تھی جو ہم نے دو ماہ پہلے ڈاکٹر ریشم کے کہنے پر خریدی تھی۔

میں نے وہیں سے زیبا سے پاری کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ وہ بھی صبح ہی سے غائب ہے۔ اوہ میرے خدا کہیں شابو اسے ڈھونڈنے گھر سے باہر نہ چلا گیا ہو۔ سوچتے ہی میرے پیروں تلے جیسے زمین نکل گئی۔ حلق میں کانٹے سے پڑ گئے۔

''میرے خدا چار گھنٹوں سے شابو نہیں ہے اور تم لوگ اتنے سکون سے بیٹھے کیا میرا انتظار کر رہے تھے۔'' میں اپنی بے بسی اور تینوں کی بے حسی پر جل پڑا۔

''اور ماییے آپ اُس ڈاکٹر ریشم کی باتیں۔'' سلمٰی کو تو جیسے زہر اگلنے کا بہانہ مل گیا تھا۔ میں نے حیرانگی سے اسے دیکھا جو باورچی خانے سے مسلسل بول رہی تھی۔

خدایا یہ کون سا وقت ہے ڈاکٹر ریشم کو کوسنے کا، پر سلمٰی کی شکی اور جھکی طبیعت سے کون جیتے...... میں کمرے سے نکل کر دوبارہ صحن میں آ گیا۔

جہاں داخلی دروازے کے عین سامنے ایک چھوٹا سا چبوترا بنا ہوا تھا۔ صبح میں شابو کو یہیں بٹھا کر ناشتہ کروایا کرتا تھا اور یہیں سے اسے خدا حافظ کہہ کر آفس کے لیے گاڑی میں بیٹھ جاتا تھا اور وہ مسکرا کر کہتا۔ ''ابو پاری'' میں نے ایک بار پھر اس کی تلاش میں چبوترے کے آس پاس، اِدھر اُدھر دیکھا۔ بارہ سالہ شابو جس کی جسمانی ساخت اور ذہنی عمر صرف پانچ سال کی تھی۔ وہ کہیں پر نہیں تھا۔ پر میرے تصور میں وہ ابھی تک جیسے چبوترے پر ہی بیٹھا ہوا تھا۔ اور اس کے ساتھ اس کی بھوری بلی 'پاری' بھی اس سے جڑ کر بیٹھی ہوئی تھی۔ پاری کے بھورے جسم پر کالے رنگ کے دائرے اور کالے ہی پیر اسے کئی بلیوں میں منفرد کرتے تھے۔ جب وہ اپنے مخاطب کی بات سنتے ہوئے اپنے کان اسی رُخ پر ہلاتی اور اپنی بڑی ہلکی بھوری آنکھیں کھولتی بند کرتی تو جیسے چابی سے چلنے والی کوئی گڑیا لگتی۔ اس کے گلے میں لال رنگ کے بینڈ کے ساتھ پرویا ہوا چھوٹا سا سنہرا گھنگھرو جہاں کہیں بجتا شابو مسحور ہو کر اس کو ڈھونڈنے نکل پڑتا۔ پھر دونوں دنیا سے بے نیاز ایک دوسرے کے آمنے سامنے یوں بیٹھ جاتے جیسے دو دوست مدتوں بعد ایک دوسرے سے ملے ہوں۔ پر آج وہ دونوں دلدار گھر پر نہیں تھے۔

میں نے نمناک آنکھوں سے باہر بڑھتی ہوئی شام کو بے بسی سے دیکھا اور تیزی سے چھت کی طرف لپکا کہ کہیں وہ کھیلتے کھیلتے وہاں نہ چلے گئے ہوں۔ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے مجھے شابو کی زندگی کے اتار چڑھاؤ بھی یاد آتے گئے۔ وہ، ماہ نور اور زیبا دونوں سے بڑا تھا۔ اس کا اصل نام شاہین تھا پر لاڈ میں پیار سے ہم سب اسے شابو کہہ کر پکارتے تھے۔ میں شابو کو پا کر اتنا خوش تھا کہ اس دن میرا دل چاہا کہ خدا کو بھی مٹھائی بھیج دوں۔ میں اپنی اس نئی پہچان پر کہ میں اب سرخ وسفید، بولتی ہوئی آنکھوں اور پھولے ہوئے گالوں والے شابو کا باپ ہوں کئی بار خود پر فخر کرنے بیٹھ جاتا۔ میں اپنی خوشی میں مگن ہی رہتا جو سلمیٰ کی تشویش مجھے خبردار نہ کرتی، شابو کو گردن ٹکانے میں دقت ہو رہی تھی۔ سہارے۔ سے بھی بیٹھ نہ پاتا تھا۔ میں اسے سلمیٰ کا وہم ہی سمجھتا جو ایک دو ماہ کی دیر سویر ہوتی۔

پر شابو نے جب مجھے ابو کہہ کر نہیں پکارا تو میں چونک گیا۔ اس نے میری طرف محبت سے نہیں دیکھا تو میں ڈر گیا۔ میں جب آفس سے آیا تو وہ لپک کر مجھ تک نہیں پہنچ پایا تو میں خوفزدہ ہو گیا۔ سلمیٰ جو پہلے ہی سے پریشان تھی اب خاموشی سے مجھ سے لاتعلق ہو گئی جیسے شابو کی معذوری میں سارا قصور میرا تھا۔

سلمیٰ کی لاتعلقی اتنی بڑھی کہ میں اکیلا ہی شابو کو لیے ایک ڈاکٹر سے دوسرے ڈاکٹر تک دوڑتا رہا۔ پر ہماری قسمت لکھی جا چکی تھی۔ میں دن رات افسردہ اور الگ تھلگ رہنے لگا اور سلمیٰ اپنے معذور بچے کو ذہنی طور پر قبول نہ کر سکنے کی وجہ سے اس سے بھی دور ہو گئی۔

پھر یوں ہوا کہ سلمیٰ، ماہ نور اور زیبا ایک پارٹی بن گئے اور میں اپنے شابو کے ساتھ اکیلا پڑ گیا۔ سارا دن آفس میں رہنے کے بعد گھر آتا تو مجھ سے جو جو بن پڑتا میں شابو کے لیے کرتا۔ شاید اسی لیے کسی کو نہیں معلوم تھا کہ شابو اور پاری کہاں چلے گئے...... یوں لگ رہا تھا جیسے دل ہی دل میں سب دعا کر رہے ہوں کہ خدا نہ کرے کہ جو شابو ملے۔ معذور بچے کے کام دس بچوں کے برابر ہوتے ہیں۔ پیمپرز بدلنا، کھانا کھلانا، نہلانا دھلانا، اس کی

حفاظت کرنا۔ اس کی باتوں تک رسائی پاتا، لوگوں کے ہر وقت کے دل دکھا دینے والے سوالات کو جھیلنا، ہر پل اپنی تمناؤں اور خوابوں کو اجڑتے دیکھنا...... کچھ بھی تو آسان نہ تھا۔ شاید ہم میں سے کوئی بھی کسی کے لیے تسلی نہ بن سکا تھا۔ میں نے سرد آہ بھری۔ ان دونوں کو چھت پر بھی نہ پا کر مایوسی سے سر کو جھکائے سیڑھیاں اُتر کر پھر صحن میں آ گیا۔

جب سے ماہ نور اور زیبا نے اسکول جانا شروع کیا تھا تب سے شابو اور بھی تنہا ہو گیا تھا۔ سلمیٰ کے گھر پر ہونے کے باوجود وہ اُداس رہتا۔ میں جب بھی آفس سے واپس گھر آتا وہ اسی چبوترے پر ملتا جہاں چھوڑ کر گیا ہوتا جیسے سارا وقت وہ دھوپ چھاؤں کا گواہ رہا ہو۔ گھر بھر میں وہ صرف مجھ سے ہی مانوس تھا سو میری وجہ سے کھانا بھی ایک ہی وقت کھانے لگا تھا۔ اب تو کچھ ہفتوں سے اس کا وہ کھانا بھی برائے نام رہ گیا تھا۔ میں جب منت کرتا تو وہ اکثر میرے ہونٹوں پر ابو پاری کہتا ہوا اپنا منہ رکھ دیتا۔ ہائے میرے بیٹے کو چومنا بھی نہیں آتا تھا، پچھلے ہفتے ہی تو پڑوس کے کریم صاحب کہہ رہے تھے کہ شابو کا خیال رکھا کریں۔ اس کے سامنے گاڑی بھی آ جائے تو وہ ہٹنے کی بجائے اس کے آگے آگے چلتا رہتا ہے۔'' کریم صاحب کا ساتھ شمیم صاحب نے بھی دیا کہ وہ بھی اسی طرح کے واقعات کے چشم دید گواہ تھے کہ کئی بار انہوں نے شابو کو گلی کے کتے کے ساتھ بیٹھے دیکھا تھا۔ کتا بھونکتا رہتا اور شابو ہنستا رہتا...... میں شرمندہ ہو گیا۔ کیا کہتا کہ میں تو سارا دن آفس میں ہوتا ہوں اور سلمیٰ کو کچھ بھی سمجھانا بیکار ہے۔

اس دن کی شرمندگی، ضمیر کی ملامت اور سلمیٰ کی روز کی بحث و تکرار کا ایک فائدہ ہوا کہ شابو کو اسپیشل اسکول میں داخل کروانے کا ارادہ جو کئی برسوں سے غیر اہم جان کر آج اور کل پر ٹل رہا تھا وہ تکمیل پا گیا۔ اس کا اسپیشل اسکول صبح نو بجے سے دو پہر تین بجے تک کا تھا اور فیس بھی نہ ہونے کے برابر تھی۔ دل میں سکون سا اُتر آیا کہ اس بہانے سلمیٰ کو بھی تھوڑا آرام مل جائے گا اور وہ بھی کچھ سیکھ جائے گا۔

شابو کے اسکول کی ڈاکٹر ریشم نے اس کا جسمانی اور نفسیاتی تجزیہ کرنے کے بعد یہ کہہ کر ہمیں حیران کر دیا کہ شابو کو ڈپریشن ہے، وہ کہہ رہی تھی کہ دنیا اتنی خود غرض ہو چکی ہے کہ عام انسانوں کو قبولیت نہیں ملتی شابین تو پھر ایک معذور بچہ ہے۔'' میں بے بسی سے ڈاکٹر ریشم کو دیکھتا رہ گیا پر انہیں بتا نہ سکا کہ مجھے اپنے بیٹے کے ساتھ معذور کا لفظ کبھی اچھا نہیں لگا۔ ایسے لگتا ہے جیسے کسی نے مجھے باپ کی گالی دے دی ہو یا تہمت لگا کر بدنام کر ڈالا ہو۔ یا پھر اپنوں نے غیروں کی عدالت میں مجرم بنا دیا ہو۔ میں تو یہ بھی انہیں نہ بتا سکا کہ سلمیٰ اور بچے جہاں تک ممکن ہوتا شابو سے فاصلہ رکھ کر چلتے تھے، اسی لیے تو جبھی سے وہ الگ تھلگ رہنے لگا تھا۔ ڈاکٹر ریشم کی تجویز تھی کہ شابو کو ڈپریشن سے باہر لانے کے لیے کوئی پالتو جانور کتا یا بلی رکھ دیں تا کہ اس کا دل لگ جائے، توجہ بٹ جائے۔ بہت سوچ سمجھ کر ہم سب نے فیصلہ کیا کہ کم خرچ اور کم توجہ پر بھی خوش رہنے والی ایک بلی خرید لیتے ہیں، اتفاق سے اسی ہفتے بلی ہمارے گھر آ گئی۔ شابو اسے دیکھ کر حیران سا تھا۔ پھر جانے کیا ہوا، مسکراتے ہوئے اپنا منہ بلی کے سر پر رکھ دیا۔ ''ابو پاری'' کہہ کر مجھے تائید کے لیے دیکھا۔ میں نے خوشی سے سر ہلاتے ہوئے

پانچ ہفتے کی بلی کا نام 'پاری' رکھ دیا۔

پاری بڑی ہی ملنسار اور خوش اخلاق بلی تھی۔ پہلے ہی دن اس نے بھی شابو سے دوستی کرلی۔ وہ جہاں جاتا وہ سائے کی طرح اس کے ساتھ ہوتی۔ کبھی اس کی گود میں بیٹھی ہوتی، تو کبھی اس کو کھینچ کر باہر لے جا رہی ہوتی، تو کبھی دونوں ایک پتلی سی ڈنڈی جس پر میں نے لال رومال باندھ دیا تھا اس سے کھیل رہے ہوتے۔ شابو ڈنڈی گھماتا اور پاری اس کو پکڑنے کے لیے اس کے گرد گھومتی رہتی۔ کتنے مہینوں کے بعد شابو مسکرایا تھا۔ یونہی ایک دن کھانا کھاتے ہوئے شابو کے منہ سے نوالہ زمین پر گر گیا جسے پاری نے دوڑ کر اپنے دانتوں میں دبالیا اور اس کے سامنے لا کر رکھ دیا۔ شابو نے وہی نوالہ محبت سے پاری کو ایسے کھلایا جیسے میں اسے کھلایا کرتا تھا۔ شابو میں ایک مہربان انسان دوست کو دیکھ کر میں حیران ہی تو رہ گیا تھا۔

جس دن شابو دیر تک سوتا رہتا اس دن پاری کو تنہائی کاٹنی محال ہو جاتی۔ کبھی اس کے ماتھے کو چوم کر اسے جگا رہی ہوتی تو کبھی اس کے گالوں پر زبان پھیر کر شرارت کر رہی ہوتی۔ شابو کی آنکھ اس وقت کھل جاتی جب وہ اس کی گردن پر پیار کر رہی ہوتی۔ شابو اسے دیکھ کر ادھ کھلی آنکھوں سے مسکرا دیتا۔ اور پاری اس کی ساری رمزیں، باتیں سمجھ لیتی اور اس کے ساتھ اس وقت تک لیٹی رہتی جب تک شابو خود نہ اٹھ جاتا۔ ابھی کچھ ہفتوں پہلے ہی کی بات تھی۔ چھٹی کا دن تھا وہ اسی چبوترے پر ہی بیٹھا ہوا تھا۔ گلی کی طرف والی دیوار پر سے دو تین بلیاں کود کر ایک ساتھ گھر میں گھس آئیں۔ شابو انہیں دیکھ کر ہنستا جا رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ کوئی ان بلیوں کو شابو کے پاس سے ہٹاتا، جانے کس کونے سے پاری اڑتی ہوئی آئی اور غرا غرا کر پنجے مار مار کر انہیں گھر سے باہر نکال دیا اور خود شابو کی کمر سے اپنی کمر ٹکا کر آنکھیں بند کرلیں۔ اس دن شابو چبوترے سے اس وقت تک نہ اٹھا جب تک اس نے خود آنکھیں نہ کھولیں۔ اسی رات پاری آخری نوالہ شابو کے ہاتھ سے کھاتے ہوئے اس کی انگلیوں کو اپنی زبان سے چاٹ چاٹ کر خوشی کا اظہار کرتی رہی۔ میں رات گئے تک سوچتا رہا کہ خدا نے بولنے والوں کو ایسی محبت سے کیوں محروم رکھا۔ پھر دیر تک ایک ایسی محبت کے خواب دیکھتا رہا۔ جو غمگساری اور دلداری کی رمزیں سکھاتی ہے۔ اظہار اور رشتوں کی قید سے آزاد کر دیتی ہے۔

اب دونوں اکثر ساتھ ہی کھانا کھاتے تھے۔ پاری جب تک شابو کے ہاتھ سے اپنے کھانے کا آخری نوالہ نہ کھاتی اس کے پیچھے پیچھے پھرتی رہتی۔ کھانے کے بعد شابو ٹی وی دیکھ رہا ہوتا تو وہ اُچک کر اس کی گود میں بیٹھ جاتی اور اپنی زبان سے خود کو صاف کرتے کرتے اس کے ہاتھ پاؤں بھی صاف کرتی جاتی۔ شابو کو یہ سب بہت اچھا لگتا تھا۔ اب تو وہ پاری سے ہوں ہاں میں باتیں بھی کرنے لگا تھا۔ باتیں کرتے ہوئے جب وہ اس کی کمر پر ہاتھ رکھتا تو اس کا لمس پاتے ہی پاری بل کھا کر اپنی گرن اس کے سامنے رکھ دیتی جسے شابو اتنے پیار سے سہلاتا کہ پاری کی آنکھیں بند ہونے لگتیں۔

میرا بس نہ چلتا تھا کہ میں ڈاکٹر ریشم کو دنیا کا سب سے بڑا مسیحا کہہ دیتا جن کی وجہ سے شابو اب گھر میں کسی کو 'وجہ شرم' نہ لگتا تھا بلکہ پاری کی وجہ سے اکثر موضوع سخن رہتا۔ شابو کا یہ مثبت رویہ گھر کے ماحول کو جہاں خوشگوار بنا رہا تھا۔

وہاں اس کی جانب سے سب اتنے مطمئن رہنے لگے تھے کہ اکثر گھر میں کسی کو دھیان ہی نہ رہتا کہ وہ کہاں ہے؟ آج بھی یقیناً یہی ہوا ہوگا۔ پر اب سردیوں کا موسم شروع ہو چکا تھا۔ آج کل ویسے بھی دھند نے صبح کو شام اور شام کو رات بنا رکھا تھا۔ ایسے موسم اور وقت میں شابو اور پاری کو کہاں ڈھونڈوں؟'' اس پر گلی کے کتوں اور گاڑیوں کے ساتھ اندھیرے اور سردی کا خیال آتے ہی میری روح تک کانپ گئی۔ اب مجھے دونوں کو گھر کے باہر ڈھونڈنے میں ایک سیکنڈ بھی دیر نہیں کرنی چاہیے۔ میں نے جلدی سے کرسی کی پشت پر سے کالا کوٹ اُٹھا کر ابھی پہنا ہی تھا کہ ماہ نور کی آواز نے چونکا دیا۔

''ابو جی...... ابو جی...... جلدی سے آیئے، شابو اور پاری مل گئے ہیں۔'' ماہ نور کی آواز یوں لگی جیسے دونوں جہاں کی سب سے میٹھی آواز ہو۔

''کہاں سے ملے؟'' میں اپنی خوشی کو نہ چھپا سکا۔ ماہ نور مسکرادی۔

''آیئے میرے ساتھ۔'' وہ اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھے مجھے بھی خاموش رہنے کا کہتے ہوئے شابو کے کمرے کی طرف چل دی جو اس کے اور زیبا کے کمرے کے ساتھ ہی تھا۔ گھر لینے کے بعد ہم نے خاص طور پر ایک دروازہ دونوں کمروں کے بیچ بنوایا تھا جو ہمیشہ کھلا ہی رہتا تھا کہ ماہ نور اور زیبا کی نظر آتے جاتے شابو پر رہے۔ وہ دونوں اسی دروازے کے پیچھے سے ملے تھے۔ شابو شدید سردی میں کمبل کے بغیر ٹھنڈی ننگی زمین پر گھٹنے سکیڑے بے خبر سو رہا تھا اور اس کے ساتھ ہی پاری نیلے پھولوں والا کمبل اوڑھے شابو کے بازو پر اپنا سر اور ایک ہاتھ اس کی گردن پر رکھے سو رہی تھی۔ شابو نے کھڑکی کی طرف سے آنے والی ہوا

دادا ابا

دادی اماں نے فیشن کے شوق میں بال کٹوا دیئے۔ انہوں نے بالوں کو سنوارتے ہوئے اپنی پوتی سے پوچھا۔ ''کیا اب میں تمہاری بوڑھی دادی اماں لگتی ہوں؟''

پوتی۔ ''ہرگز نہیں اب تو آپ دادا ابا لگتی ہیں۔''

مرسلہ: اشعر کاشف۔ کراچی

سے بچانے کے لیے کمبل کے کونے کو اپنی مٹھی میں دبا رکھا تھا کہ کہیں پاری کو ٹھنڈ نہ لگ جائے۔ دونوں ایک دوسرے کی طرف منہ کر کے بے خبر سو رہے تھے۔ شابو رحم دلی اور محبت کے اوج کمال پر تھا۔

مجھے یاد آیا۔ کل ہی تو سب کے لیے نئے کمبل آئے تھے۔ میں نے جب شابو سے پوچھا کہ کون سا رنگ پسند ہے تو وہ مسکرا دیا۔ آہستگی سے بولا۔

''ابو پاری'' شابو کے لیے یہی دو لفظ اس کی کل کائنات اور اس کے ہر احساس کا اظہار تھے۔ پاری جو اس کے ساتھ ہی بیٹھی ہوئی تھی اُچک کر نیلے پھولوں والے کمبل پر بیٹھ گئی اور گردن موڑ کر شابو کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھیں جگنوؤں جیسی جل رہی تھیں۔ شابو نے ہاتھ بڑھا کر کمبل اپنے سینے سے لگا لیا اور 'ابو پاری' کہتا ہوا۔ اکیلے ہی کمبل گھسیٹتا ہوا اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔ اس کے پیچھے پیچھے مدھر گھنٹیاں بجاتی پاری جا رہی تھی۔ میں بے اختیار ہو کر وہیں دوزانو بیٹھ گیا۔ میرا وجود آنسوؤں میں ڈھل گیا۔ خدایا جو محبت کرنا جانتے ہیں انہیں بولنا کیوں نہیں آتا۔

☆☆......☆☆

''نوفل احمد کچھ نہیں جانتا تھا۔ اس کے سامنے تو سجل ایک سانس لیتی ، اُس کی ہر بات کا حکم بجا لانے والی وفادار بیوی کے روپ میں موجود تھی اور شاید ہر مرد کو عورت کی یہی ادا پسند ہے کہ اُس کی بیوی اُس کے آگے زبان چلانے کے بجائے اُس کی ہر بات مان لے، اس لیے......

زیست کے کینوس پہ بکھرے، محبت کے لازوال رنگ، افسانے کی صورت

مجھے نہیں پتا ایسا کیوں ہوتا ہے؟

جب آپ کا بہت پیارا آپ کا ساتھ چھوڑ جاتا ہے۔ پھر دوسرا اس کی جگہ کیوں لے لیتا ہے۔ ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟

وہ خود کو سمجھا سمجھا کے تھک جاتی۔ پھر سوچتی کہ کیا واقعی محبت کی جگہ کوئی لے سکتا ہے۔

'لیکن زندگی کسی ایک شخص پہ ختم نہیں ہوجاتی سجل۔ ورنہ دنیا نہ ہوتی، سب ختم ہوجاتا۔' اور پھر اندر اور باہر کی جنگ نے اُسے پھر سے جینا سکھا دیا۔

وقت کی اٹکھیلیاں پھر سے سرگوشی کرنے لگی تھیں۔ بے کشش مکانوں کی سرد راتیں، چاند راتوں میں ڈھل گئی تھیں۔ راستے بھی آباد ہوگئے تھے۔ زندگی، زندگی میں ڈھلنے لگی تھی۔

مگر زندگی ، زندگی سے خفا ہوگئی تھی۔ وہ جی رہی تھی مگر جینا نہیں چاہتی تھی۔ کیونکہ اُس نے اپنے میت سے عہد و پیماں کیے تھے۔ 'ہم مرتے دم تک ساتھ نہ چھوڑیں گے۔'

''سنو تمہاری ہر سانس پہ میرا نام لکھا ہے۔''

فیضان شاہ سطحی لہجے میں کہتا تو وہ اقرار میں گردن ہلا کر اپنے وعدے کی پاسداری کا یقین دلاتی۔

ایسے کتنے ہی اقرار دونوں نے ایک دوسرے کو گواہ بنا کر کیے تھے۔ کبھی درختوں پہ نام لکھ کر، کبھی سمندر کی لہروں کو گنتے ہوئے اور کبھی بابا تاجی کے مزار پر منت مانتے ہوئے۔ اور پھر کوئی منت ، کوئی دعا، کوئی سسکی ہچکی، اُس کی راتوں کا دکھ نہ جان سکی اور وہ فیضان کو نہ بچا سکی اور ہزاروں اور لاکھوں مداحوں نے اُسے سپردِ خاک کردیا۔

صرف دو سال بعد اماں اور ابا نے اسے نوفل احمد کے نکاح میں دے دیا۔

نوفل احمد کی زندگی میں آنے والی پہلی لڑکی سجل ہی تھی۔ اس لیے نوفل احمد نے اپنی تمام تر محبت و جذبات پہلی رات ہی اُس کے نام کردیے تھے۔

یہ جانے بغیر کہ سجل کے دل میں محبت کی پہلی بارش کسی اور کے لیے برستی ہے۔ اس کی آنکھوں

میں ٹوٹے ہوئے خوابوں کی کرچیاں کسی اور کی ہیں جن کی چبھن میں وہ دن رات تڑپتی ہے۔
سجل کسی اور سے اقرارِ وفا نبھانے کے وعدے کر آئی ہے۔
''نوفل احمد کچھ نہیں جانتا تھا۔ اس کے سامنے تو سجل ایک سانس لیتی، اُس کی ہر بات کا حکم بجالانے والی وفادار بیوی کے روپ میں موجود تھی اور شاید ہر مرد کو عورت کی یہی ادا پسند ہے کہ اُس کی بیوی اُس کے آگے زبان چلانے کے بجائے اُس کی ہر بات مان لے۔ اس لیے نوفل احمد خود کو شہنشاہ تصور کر رہا تھا کہ اُس نے بغیر کسی تگ و دو کے ایک عورت کو زیر کرلیا تھا۔
''سنو تم نے کبھی کسی سے محبت کی ہے۔''
نوفل احمد اپنی محبت کی سچائی اس کی پیشانی پر اپنے ہونٹوں سے ثبت کرتا ہوا پوچھتا تو سجل نظریں جھکائے خاموش رہتی۔
اس کے پاس نوفل احمد کی کسی بھی بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔ نوفل احمد سجل کی اس ادا کو شرم و حیا سمجھتا۔ اُسے سجل آج کی بے باک لڑکیوں سے الگ لگتی تھی۔
''تم پیازی رنگ کا لباس پہنو۔'' نوفل احمد کی بات پر سجل کسی مشین کی طرح الماری کھولتی اور ہینگر

میں لٹکا جھلمل ستاروں والا کوٹ زیب تن کرتی حرکت کرتی اور اُس کی خواہش کو پورا کردیتی کیونکہ اپنی محبت تو وہ منوں مٹی تلے دفنا چکی تھی اور اپنی زندگی کی سانسوں کی ڈور اور دل کی معمولی حرکت کے ساتھ گزار رہی تھی۔ سجل نہیں جانتی تھی کہ وہ جس شخص کے ساتھ ہے وہ اُس سے کتنی محبت کرتا ہے اور اپنی بے لوث محبت کا اظہار وہ برملا کرتا تھا۔

''میں بہت خوش قسمت ہوں کہ مجھے تم جیسی بیوی ملی، بلکہ میں یوں کہوں گا کہ مجھے تمہاری ہی تلاش تھی اور اگر مجھے تم نہ ملتیں تو شاید میں ادھورا رہتا۔ کیا تمہیں بھی ایسا ہی لگتا ہے؟'' مگر وہ خاموش رہتی۔

محبت حکم نہیں ہے، محبت جنگ نہیں ہے، محبت جیت نہیں ہے، محبت ہار نہیں ہے، یہ وہ جذبہ ہے جو انسان کے دل میں خون کے ساتھ گردش کرتا ہے۔ اس لیے محبت پالینے کا نام نہیں ہے، محبت کھونے کا نام نہیں ہے، محبت امر ہے، کسی ایک کی میراث نہیں ہوتی۔ یہ کسی ایک شخص پر ختم نہیں ہوجاتی بلکہ یہ اپنی منزل کی تلاش میں سرگرداں رہتی ہے اور سجل اس بات سے بے خبر تھی اس لیے وہ اپنی محبت کو فیضان شاہ کے ساتھ مٹی میں دفنا کر، اپنے الفاظ کو پھولوں کی مالا بنا کر اُس کی قبر پر سجا چکی تھی۔

وہ پلیٹ اپنے آگے رکھے نوفل احمد کے لیے گرم گرم روٹی رکھ رہی تھی تب وہ بولا۔ ''سجل کھانا کھالو۔'' اور وہ کھانے لگی۔

''بہت رات ہوگئی اب سوجاؤ۔'' نوفل احمد کے اشارے پر وہ سو بھی جاتی۔

سجل کو خود بھی پتا نہیں تھا کہ وہ آنکھیں بند کرکے سوجاتی ہے یا یوں ہی لیٹی رہتی ہے اور صبح نوفل احمد کے اٹھانے پر اُٹھ بھی جاتی ہے۔

''سنو تمہاری ہر سانس پر میرا نام لکھا ہے۔'' فیضان شاہ نے سجل کی ہر سانس اپنے نام سے منسوب کی تھی اس لیے سجل کو اپنے دل پر کبھی بھی نوفل احمد کی محبت کی دستک سنائی نہیں دی تھی۔

''سنو میرے بعد کیا کروگی؟'' فیضان شاہ نے سجل سے پوچھا تھا۔

''سانس لوگی یا مرجاؤ گی۔'' سجل مری نہیں تھی لیکن زندہ بھی نہیں رہی تھی۔

مرنا اتنا آسان تو نہیں ہوتا ورنہ ہر محبت کرنے والا ناکامی کے بعد مٹی اوڑھ کر سوجائے۔ زندہ رہنا پڑتا ہے۔ خود اپنے لیے نہیں تو اپنے وجود کے ساتھ جڑے لوگوں کے لیے، جیسے سجل زندہ تھی۔ صرف اماں ابا کے لیے خود اپنی ہستی مٹا کر، ہر آس کا دیا بجھا کر ایک ایسے شخص کے ساتھ جس سے وہ محبت نہیں کرتی تھی۔

''تم میرے ساتھ خوش تو ہو۔'' نوفل احمد اکثر سجل سے پوچھتا اور وہ ہنوز خموش رہتی۔

''میں بہت خوش ہوں سجل تمہیں پاکر۔ تم نہیں جانتیں کہ میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں۔''

نوفل احمد صرف اپنی ہی باتیں کرتا تھا اور اپنی بے لوث محبت سجل پر لٹاتا رہتا تھا۔ اس کے لیے شاید یہ ہی بہت تھا کہ سجل اُس کی ملکیت ہے۔ بیوی بنتے ہی عورت مرد کی ملکیت بن جاتی ہے۔

زندگی اپنی ہی موج میں بہہ رہی تھی۔ کتنے ہی دن اپنی رفتار میں گزر گئے تھے۔ سجل کے لیے کوئی انوکھی بات نہیں تھی مگر اس کے وجود میں اب محبت کا ایک انوکھا جذبہ بیدار ہونے لگا تھا۔ موسم کی کھنکتی بہار اُسے آواز دے رہی تھی۔

محبت حقیقت ہے، محبت سچائی ہے، محبت ایمان ہے، محبت زندگی ہے۔ سجل زندگی کی طرف واپس

آرہی تھی۔ یہ سب نوفل احمد کی محبت تھی یا کچھ اور ابھی سجل سمجھنے سے قاصر تھی، بس سجل کا گنگنانے کو دل چاہتا تھا۔ سجل ہنستی تھی، بولتی تھی۔

''نوفل آپ نے کھانا ٹھیک سے نہیں کھایا۔''

''نوفل آج موسم کتنا خوبصورت ہے ناں۔''

نوفل احمد اُس کی باتوں پر حیران تھا مگر خوش بھی، یہ وہی سجل تھی جو فیضان شاہ کی محبت میں ہر چیز سے کٹ کر رہ گئی تھی۔ اب اصل محبت کو سمجھ رہی تھی۔ نوفل احمد اُس کے انگ انگ سے پھوٹتی خوشی کو محسوس کررہا تھا لیکن اُسے کچھ کہہ نہیں سکتا تھا کیونکہ اُسے یہ زندہ سجل کچھ زیادہ ہی اچھی لگ رہی تھی اور شاید اُس کے لیے یہ ہی جیت تھی کہ وہ ایک مُردہ وجود میں زندگی بھر چکا تھا۔

سجل کے لیے محبت اب مہربان ہوگئی تھی۔ وہ اب اس لفظ کا اصل مطلب سمجھ کر خوشیوں کے دروازے پر کھڑی تھی۔ پچھلی تمام باتیں اس کے لیے خواب کی صورت اختیار کرچکی تھیں۔ زندگی لوٹ آئی تھی اور ایک نئے روپ میں اُسے اپنے اندر سمیٹ رہی تھی۔

محبت عبادت ہے، محبت جیت ہے، محبت ماں ہے۔

ماں کے درجے پر پہنچ کر سجل کو محبت کی حقیقت کا اندازہ ہوا تھا۔ محبت مرتی نہیں ہے بلکہ زندگی کے ساتھ رنگ و روپ بدلتی ہے۔ سجل محبت کے بلند درجات پر جا کھڑی ہوئی تھی۔ اُس کے سامنے کئی خوبصورت خواب تھے اور اَن دیکھی راہیں مگر ساتھ میں محبت کرنے والا ہمسفر بھی تھا اور اس کے ساتھ ایک ننھا وجود جو اُس کے جسم میں سانس لے رہا تھا اور اپنی محبت کی ابتدا وہ دنیا میں آنے سے پہلے ہی کرچکا تھا۔

☆☆......☆☆

ناولٹ

نعمان اسحق

میرے پرندۂ دل

رطابہ اور غالب کے پاس سے گزرتے ہوئے ان میں سے ایک کھنکاری تھی، جبکہ کچھ نے معنی خیز نظروں سے اور کچھ نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ دیکھا تھا۔ نئی جنریشن تو ویسے بھی گپ شپ کے لیے ایسے موضوعات کی ضرورت محسوس کرتی رہتی ہے۔ اب وہ لڑکیاں......

زندگی کی کٹھنائیوں کو عیاں کرتے، ایک خوبصورت ناولٹ کا چوتھا حصہ

''اصل میں میں نے جو لڑکی پسند کی ہے، نا صرف اس کا نام رطابہ ہے، بلکہ وہ بھی ایم بی بی ایس کر رہی ہے۔ کیا پتا ہم دونوں نے ایک ہی لڑکی پسند کی ہو۔'' غالب کو خوشگوار حیرت ہوئی تھی یہ سن کر۔

''دیکھنے میں کیسی ہے؟'' غالب کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔ عارفہ رطابہ کی ظاہری شخصیت کی تصویر کھینچنے لگی تھیں اور دوسری طرف غالب کے دل میں لڈو پھوٹنے لگے تھے۔

☆......☆......☆

کھیر پکوائی کی رسم کے دن جس طرح واویلا ہوا تھا، نینا کو لگا تھا کہ گھر میں کچھ دن خاموشی رہے گی۔ یہاں تک کہ بڑے جا کر خدیجہ پھوپو کو منا آئیں گے۔ لیکن گھر میں تو ہر چیز روٹین میں ہی تھی، یہاں تک کہ شام کی چائے پر بھی اس دن کافی چہل پہل تھی۔ البتہ اکرم صاحب کچھ ناراض ناراض سے تھے۔ انہیں افسوس تھا کہ ان کی بہن ناراض ہو کر چلی گئی تھی۔ بہر حال سال میں ایک دو بار تو خدیجہ پھوپو اسی طرح ناراض ہو کر ضرور جاتی تھیں اور پھر ان کو راضی کرنا بھی ایک مشکل کام ہوتا تھا۔

اگلے دن اکرم صاحب، زاہدہ، نفیسہ اور کلیم صاحب پھوپو کو منانے کے لیے گئے تھے اور ہمیشہ کی طرح نامراد لوٹے تھے۔ نفیسہ اور زاہدہ کو تو اندازہ تھا کہ ایک دو مہینے تک ان کی نند خود ہی آ جائے گی اور پھر ہر ناراضگی کو بھول کر اور آنے کے بعد ہفتہ دو ہفتہ یہ بھی جتائیں گی کہ وہ بڑے دل کی ہیں۔ البتہ اکرم صاحب کو کچھ دن تھوڑا بہت قلق رہا تھا، لیکن پھر وہ بھی اپنی روٹین میں سیٹ ہو گئے تھے اور نینا کے ساتھ ان کا موڈ بھی صحیح ہو رہا تھا۔

شاید اکرم صاحب بھی بہن کے مزاج سے آشنا ہو کر بھی ناآشنائی برتتے تھے۔ لیکن جو کچھ بھی تھا...... بس چل رہا تھا۔

☆......☆......☆

''تمہیں واقعی وہ مووی پسند آئی ہے۔'' ماریہ ایک دم بہت زیادہ پُرجوش ہو گئی تھی۔

”ہوں......“ مینا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ آج مینا ماریہ کے گھر آئی تھی اور ماریہ خاصی بے تکلفی کے ساتھ اسے لاؤنج میں لیے بیٹھی ہوئی تھی۔ جیسے وہ کافی پرانی سہیلیاں ہوں۔ تھری سیٹڈ صوفے کے ایک کونے میں ماریہ پاؤں پسارے بیٹھی تھی، جبکہ دوسری طرف مینا بیٹھی تھی۔ مینا صوفے پر ٹانگیں لٹکا کر بیٹھی ہوئی تھی۔ ماریہ نے اسے ایزی ہو کر بیٹھنے کا کہا تھا جس پر مینا نے کشن گود میں رکھ لیا تھا۔

”واقعی بہت اچھی فلم ہے۔ آرٹ فلم کا ہٹ ہونا غیر معمولی بات ہے۔ ویسے بھی اس فلم میں ہر چیز ہی کمال کی ہے رانی اور امیت جی کی اداکاری اور پھر سنجے لیلا کا جادو...... واقعی ہر چیز کمال ہے۔“ ماریہ نے ایکسائیٹڈ انداز میں کہا تھا، لیکن ساری بات مینا کے سر کے اوپر سے ہی گزر گئی۔

”تمہیں اس فلم کا کون سا سین سب سے زیادہ پسند آیا تھا۔“ ماریہ کے سوال پر مینا ہونقوں کی طرح اسے دیکھنے لگی تھی۔ کچھ دیر تو ماریہ مینا کے جواب کا انتظار کرتی رہی، لیکن جب جواب نہ آیا تو خود ہی

بولنے لگی۔

''مجھے توسب سے زیادہ وہ سین پسند آیا تھا جب وہ گریجویٹ کرلیتی ہے اور اپنی فیلنگز کا اظہار کرتے ہوئے بتاتی ہے کہ اسے گریجویٹ کرنے میں چالیس سال لگ گئے۔ اس کے علاوہ جب ڈائننگ ٹیبل پر رانی کی بہن کہتی ہے کہ رانی کو ہمیشہ اس پر Prefer کیا گیا ہے۔ وہاں پر بھی ڈائیلاگ بہت اچھے تھے۔'' ماریہ بتارہی تھی اور مینا چاپ چاپ سُن رہی تھی۔ ساتھ ہی دونوں سین بھی اس کے ذہن میں آئے تھے۔

''تمہیں کون سے سین پسند آئے تھے؟'' ماریہ نے اپنے پسندیدہ سین بتانے کے بعد ایک بار پھر پوچھا تھا۔

''مجھے......'' مینا نے تھوک نگلا تھا۔ ''اصل میں میں نے پہلی مووی دیکھی ہے۔ اس لیے میں نے ان باتوں پر غور نہیں کیا۔'' مینا کو یہ بتاتے ہوئے کچھ خجالت ہوئی تھی جو کہ نہیں ہونی چاہیے تھی۔

''سچ......تم مووز نہیں دیکھتی ہو، حیرت ہے، کیا واقعی تم نے یہ پہلی مووی دیکھی ہے۔'' ماریہ کو کافی سے زیادہ حیرت ہوئی تھی۔ ''ویسے تم مووز کیوں نہیں دیکھتیں؟'' ماریہ نے پوچھا تھا۔ مینا کو سمجھ نہیں آرہا تھا اس بات کا کیا جواب دے۔ بہر حال اس نے کچھ توقف سے جواب دے دیا۔

''بس ویسے کبھی دل ہی نہیں چاہا......'' مینا کا لہجہ کچھ دھیما تھا۔ اس نے بات کو ٹالتے ہوئے آدھی وجہ ہی بتائی تھی۔ مووز نہ دیکھنے کی وجہ یہ بھی تھی کہ شادی سے پہلے کبھی ایسا موقع بھی نہیں ملا تھا اور اگر کبھی کبھار کسی رشتے دار کے ہاں مل بھی گیا تو امی، ابو کی پرورش اور اسلامی خطوط مانع آگئے تھے۔

''اچھا......یار! میری مانو تو دیکھ ہی لیا کرو، کبھی کبھار ہی سہی۔ ویسے بھی سارا دن کیا کرتے رہتے ہیں۔ بندہ اچھی خاصی انٹرٹینمنٹ حاصل کرلیتا ہے۔'' ماریہ نے بے تکلف لہجے میں اپنے خیالات مینا تک پہنچائے تھے۔ اور ان خیالات نے ڈائریکٹ مینا کے دماغ تک رسائی حاصل کی تھی۔

''سچ پوچھو...... میں تو مووز کی دیوانی ہوں، واقعی بولی وڈ کی مووز کمال کی ہوتی ہیں۔ دن میں اور نہیں تو ایک آدھ فلم تو ضرور ہی دیکھ لیتی ہوں۔ اب یہ مت سمجھنا کہ میں کوئی کام چور، نکمی لڑکی ہوں۔ گھر کے کام بھی کرتی ہوں۔ لیکن فارغ وقت میں ٹی وی بھی دیکھ لیا۔'' ماریہ آگے بھی کچھ کہتی جارہی تھی اور پاس بیٹھی مینا کی سوچ میں کچھ نہ کچھ تبدیلی ضرور آئی تھی۔

☆......☆......☆

حسب معمول مغرب کے وقت کھانا کھا کر طٰہٰ اور مینا ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھے ہوئے تھے، برتن سمیٹنا باقی تھا۔

''ایسا کرتے ہیں گھنٹہ بھر بعد کہیں آؤٹنگ پر چلیں گے۔'' طٰہٰ نے نیپکن سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے کہا تھا۔

''نہیں آپ تھکے ہوئے ہوں گے۔'' مینا نے انکار کردیا اور اُٹھ کر برتن سمیٹنے لگی۔

''اسی لیے تو کہہ رہا ہوں گھنٹے بھر بعد چلیں گے۔'' طٰہٰ نے اپنے سامنے پڑی ہوئی پلیٹ مینا کی طرف بڑھائی تھی۔

''نہیں...... کوئی ضرورت نہیں...... دیکھیں رات تو ہوگئی ہے۔'' مینا نے طٰہٰ کے ہاتھ سے پلیٹ لی اور کچن کی طرف چلی گئی۔ ٹیبل پر ابھی اتنے برتن پڑے تھے کہ اس کے مزید دو چکر کچن کی طرف لگتے۔ ایک تو کام کی عادت تھی، دوسرا اسے رضیہ خالہ سے اس طرح کے قدرے ذاتی کام لیتے اچھا نہیں لگتا تھا، اسی لیے وہ برتن خود سمیٹ رہی تھی۔

''کوئی تھکن نہیں ہے، بس میں نے کہہ دیا نا کہ ہم آؤٹنگ کے لیے چل رہے ہیں تو پھر چل رہے ہیں اور رہی رات ..... تو جیسے پہلے کبھی ہم رات کو باہر نہیں گئے۔'' کچن کی طرف جاتے ہوئے یہ الفاظ مینا کے کانوں سے ٹکرائے تھے۔ اور ایک مسکراہٹ نے اس کے ہونٹوں کا احاطہ کیا تھا۔ اور جب وہ کچن سے واپس آئی تو اس نے یہ بھی سوچ لیا تھا کہ انہیں کہاں جانا چاہیے۔

''ایسا کرتے ہیں امی کی طرف ہو آتے ہیں۔'' مینا نے ڈائننگ ٹیبل سے مزید کچھ برتن اٹھائے تھے۔ طٰہٰ نے اپنے چہرے کے تیور مصنوعی طور پر بگاڑ لیے۔ جنہیں دیکھ کر مینا ہنس پڑی۔

'مینا ہنستے ہوئے کتنی اچھی لگتی ہے۔' کئی بار کی سوچی ہوئی بات کو اس نے ایک بار پھر سوچا تھا۔

''نہیں ہم لانگ ڈرائیو پر جائیں گے اور آئس کریم کھائیں گے۔'' طٰہٰ نے انہی بگڑے تیوروں کے ساتھ کہا تھا۔ اور مینا مسکراتے ہوئے دوبارہ کچن کی طرف چلی گئی تھی۔

اب جب وہ کچن سے آئی تو تیسرا چکر لگانے کی بجائے طٰہٰ کے سامنے ہی چیئر پر بیٹھ گئی۔

''لیکن امی کی طرف بھی تو کافی دنوں سے نہیں گئے۔''

''وہاں جا کر تم رطابہ سے نتھی ہو جاؤ گی اور میں سسر محترم کے ساتھ غائب دماغی میں بیٹھا ان سے گفتگو کرتا رہوں گا، لیکن سوچ یہی رہا ہوں گا کہ محترمہ مینا کہاں گم ہو گئی ہیں۔'' طٰہٰ کی بات پر مینا کو ایک بار پھر ہنسی آ گئی۔

''ایسا کرتے ہیں، کل آفس جاتے ہوئے میں تمہیں ڈراپ کر دوں گا۔ اور پھر شام کو لیتا آؤں گا۔''

''یہ ٹھیک ہے لیکن میں سوچ رہی تھی کہ شادی کے بعد ایک رات بھی میں نے میکے میں نہیں گزاری، اس لیے ہم رات وہیں ٹھہریں گے۔'' مینا کچھ دنوں سے یہ بات سوچ رہی تھی سو اس نے اپنی سوچ کو زبان دے دی۔

''نہیں...... رات رہنے کی کیا ضرورت ہے۔ شام کو میں تمہیں لے آؤں گا نا۔''

''پلیز میرا دل چاہ رہا ہے، منع مت کریں۔'' مینا کو میکے کی کچھ زیادہ یاد آ رہی تھی۔ طٰہٰ نے ایک نظر مینا کو دیکھا وہ بھلا مینا کی کوئی بات ٹال سکتا تھا۔

''چلو تم ایک رات ٹھہر لینا، میں تمہیں پھر اگلے دن لے آؤں گا۔''

''نہیں آپ بھی......'' مینا کچھ کہنا چاہ رہی تھی۔ لیکن طٰہٰ نے اس کی بات کاٹ لی۔

''بس تم رات ٹھہر لینا اور کھانے کی تم فکر مت کرو، رضیہ خالہ ہیں تو سہی یا پھر فرزانہ آپا کے ہاں کھا لوں گا۔'' طٰہٰ کو اندازہ تھا کہ مینا یہ سوچے گی کہ طٰہٰ کو کھانے کا مسئلہ نہ ہو، اس لیے اس نے کھانے کی بابت خود بات کر لی۔

مینا اصرار کرنا چاہتی تھی، لیکن طٰہٰ کا قطعی لہجہ دیکھ کر اس نے مزید اصرار نہ کیا۔

''آپ مغرب کی نماز پڑھ لیں۔ وقت تنگ ہو رہا ہے۔'' کچھ دیر بعد مینا نے ٹیبل پر پڑے ہوئے بقیا برتن اٹھاتے ہوئے کہا تھا اور طٰہٰ بھی نماز پڑھنے کے لیے اٹھنے ہی والا تھا۔ وضو کرنے کے لیے اس نے واش روم کا رُخ کیا تھا۔

'ویسے مینا کو رات میکے میں نہیں گزارنی چاہیے۔ میں پیچھے اکیلا ہوتا ہوں۔' واش بیسن کا نل کھولتے ہوئے طٰہٰ کے ذہن میں خیال آیا تھا۔

'میں بھی کیا اوٹ پٹانگ سوچ رہا ہوں۔ میکے سے اسے بالکل گھر جیسی انسیت ہو گی اور وہاں جانے اور رہنے کی خواہش فطری ہی ہے۔' طٰہٰ نے اپنی لمحاتی سوچ کو اگلے لمحے میں ہی رد کر دیا۔

'لیکن پھر بھی اسے رات میکے میں نہیں گزارنی چاہیے۔ ویسے سارا دن وہیں گزار لے۔' پہلے سے ملتی جلتی سوچ پھر آ دھمکی تھی۔

'میں کچھ خود غرض انداز میں سوچ رہا ہوں...... یہ صحیح نہیں ہے۔' طٰہٰ نے اپنے آپ کو سرزنش کی تھی اور ہاتھ دھونے لگا تھا۔

☆......☆......☆

تھکی ہاری رطابہ ابھی ابھی گھر پہنچی تھی۔ اور اندر ہال کمرے میں ہی اس کی ملاقات مینا سے ہوئی تھی۔ رطابہ کے منہ سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ آج کافی دنوں بعد مینا نے یہاں کا رُخ کیا تھا۔ کمرے میں اس وقت سلطانہ اور شاہین بھی تھیں۔

''السلام وعلیکم!'' رطابہ نے سب کو مشترکہ سلام کیا تھا اور پھر اس کے بعد مینا سے گلے ملی تھی۔

''تم کب آئی ہو؟'' پُرجوش انداز میں ملتے ہوئے رطابہ نے کہا تھا۔

''صبح آئی تھی، طٰہٰ کے ساتھ۔ تم اس وقت تک کالج جا چکی تھیں۔'' مینا نے مسکرا کر جواب دیا تھا۔

'' کچھ دیر رطابہ مینا کے پاس بیٹھی حال احوال دریافت کرتی رہی، ساتھ ساتھ یہ شکوہ بھی کیا کہ وہ تو بس شادی کے بعد انہیں بھول ہی گئی ہے اور جواباً مینا بس مسکرا دی تھی۔ پھر وہ کپڑے بدلنے کے لیے اُٹھ کھڑی ہوئی اور اپنے روم کی طرف جاتے ہوئے وہ مینا کو بھی گھسیٹ لائی تھی جو کہ دو اڑھائی ماہ پہلے ان تین بہنوں کا مشترکہ کمرہ ہوا کرتا تھا۔

''تم واقعی ہمیں بھول گئی ہو۔'' کمرے میں داخل ہوتے ہوئے رطابہ نے ایک بار پھر شکوہ کیا تھا اور مینا اس بار بھی بس مسکرا دی تھی۔

کمرے کی سیٹنگ اب بھی بالکل ویسی ہی تھی۔

تین سنگل بیڈ ایک ترتیب میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر پڑے تھے۔ جن کے سامنے صوفہ تھا اور کمرے کے ایک کونے میں ڈریسنگ ٹیبل پڑا تھا۔

''ابھی تک روم کی سیٹنگ تبدیل نہیں کی۔'' مینا پہلے رطابہ کی غیر موجودگی میں بھی آئی تھی اور دیکھ گئی تھی، ہر چیز ویسے کی ویسے پڑی ہے۔

''نہیں بس دل نہیں چاہا۔ امی نے کہا تو تھا لیکن میں نے منع کر دیا تھا کہ چند دنوں تک تبدیل کر لیں گے۔'' رطابہ نے جو جواب دیا تھا وہ مینا پہلے ہی سلطانہ سے متعلقہ سوال پوچھنے پر سن چکی تھی۔

''میں بس ابھی دو منٹ میں آتی ہوں۔'' رطابہ نے صوفوں سے کچھ فاصلے پر موجود وارڈ روب سے ایک ہلکا پھلکا سوٹ نکالا اور اسے لے کر واش روم میں گھس گئی اور کچھ ہی دیر میں منہ ہاتھ دھو کر اور کپڑے بدل کر مینا کے پاس بیٹھی تھی۔

''سچی یار! میں تم دونوں کو بہت مس کرتی ہوں۔'' رطابہ نے کہا تھا۔

''میں بھی 'بہت' یاد کرتی ہوں۔'' مینا نے 'بہت' ملا کر مبالغہ آرائی سے کام لیا تھا۔

''چلو، جھوٹ مت بولو۔ تمہیں تو طٰہٰ بھائی کے علاوہ کچھ سوجھتا ہی نہیں ہوگا۔'' رطابہ نے ہنستے ہوئے کہا تو مینا بھی ہنس دی۔

''ابھی تو شادی کو تین مہینے بھی نہیں ہوئے اور آج تم پورے آٹھ دن بعد آ رہی ہو۔'' رطابہ نے ایک بار پھر شکوہ کیا تھا۔

''تم سے اچھی تو نینا ہے اور نہیں تو دوسرے تیسرے دن شکل تو دکھا جاتی ہے۔''

''وہ یہیں پڑوس میں تو رہتی ہے اس لیے آ جاتی ہے، میرا گھر تو اٹھارہ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔''

''تو اسی شہر میں یا پھر کسی دوسرے براعظم میں بیاہ کر چلی گئی ہو۔'' رطابہ نے مینا کی توجیہہ کو رد کر دیا تھا۔

''چلو اب گلے مت کرو، آج رات یہیں ٹھہروں گی۔'' مینا نے کہا تھا۔

''سچ......'' رطابہ یہ سُن کر ابھی پوری طرح پُر جوش بھی نہیں ہوئی تھی کہ ایک خیال اس کے ذہن میں آیا۔

''تو پھر طٰہٰ بھائی کھانا کہاں سے کھائیں گے یا پھر وہ بھی......''

''نہیں وہ گھر میں ہی رہیں گے، حالانکہ میں نے کافی اصرار کیا تھا، لیکن وہ راضی نہیں ہوئے اور رہی بات کھانے کی تو وہ فرزانہ آپا کے گھر سے کھائیں گے، ویسے بھی رضیہ خالہ تو گھر میں ہیں ہی۔'' رطابہ کو مینا کی ترتیب کچھ عجیب لگی تھی۔

''میں نے کہا تھا لیکن وہ کسی طور نہیں مانے، کہہ رہے تھے کافی لمبی ڈرائیونگ کرنی پڑے گی، یہاں آنے کے لیے، اسی لیے فرزانہ آپا کے ہاں سے کھا لیں گے۔''

''تمہیں بھی تو وہ چھوڑ گئے ہوں گے۔''

''ہاں۔''

''تو اس وقت فاصلہ زیادہ نہیں ہوا۔''

''یہ تو مجھے نہیں پتا لیکن شاید وہ فرزانہ آپا کے ہاں سے کھانا چاہتے ہوں گے، اس لیے انکار کر دیا ہوگا۔'' رطابہ کو اس 'ہوگا' میں کچھ زیادہ وزن محسوس نہیں ہوا تھا۔

مینا کا یوں طٰہٰ کو اکیلے چھوڑ کر یہاں رہنا بھی نامناسب لگ رہا تھا، لیکن اس نے نہ تو مزید کچھ کہا اور نہ سوچا۔

''نینا کو بھی فون کر کے بلوا لیتیں۔'' رطابہ نے موضوع تبدیل کر دیا تھا۔

''دو بار فون کر چکی ہوں اور دونوں بار اس نے یہی کہا ہے کہ بس تھوڑی دیر میں آ رہی ہوں اور یہ

تھوڑی دیر ہے کہ ابھی تک ختم نہیں ہوئی۔'' مینا نے منہ بناتے ہوئے کہا تو رطابہ کو ہنسی آ گئی۔

''وہ کسی کام میں مصروف ہوگی، اس لیے نہیں آئی ہوگی۔'' جواباً مینا نے کچھ نہیں کہا۔

''تم نے بھی تو اپنی ایک ملازمہ کی چھٹی کردی تھی۔''

''ہاں! میرے لیے تو کچھ کرنے کو بچتا نہیں تھا، سوائے اس کے کہ کام کی نگرانی کروں، جو مجھ سے ہوتی نہیں تھی، سو اس کو آنے سے منع کردیا۔ اب تو بس فراغت نہیں ملتی، لیکن اپنے ہاتھ سے کام کرنے میں مزہ بھی بہت آتا ہے۔''

اتنے میں شاہین کمرے میں داخل ہوئی تھیں۔ وہ انہیں کھانے کے لیے بلانے آئی تھیں اور ابھی وہ کھانا کھا ہی رہے تھے جب نینا بھی آ گئی۔

''آ گئی میری بیٹی۔'' شاہین نے مسکراتے ہوئے استقبال کیا تھا۔ نینا نے مسکراتے ہوئے سب کو مشترکہ سلام کیا تھا۔

''فرصت مل گئی۔'' مینا نے لقمہ منہ میں ڈالتے ہوئے کچھ جتانا چاہا۔

''نہیں فرصت ملی نہیں، بلکہ نکال کے آ رہی ہوں۔'' نینا نے مسکراتے ہوئے کہا تھا اور مینا کے ساتھ بیٹھ کر اسی کی پلیٹ سے کھانے لگی تھی۔

''تم تو ہمیشہ سسرال سے بھوکی آتی ہو، شاید تمہیں وہ لوگ بھوکا ہی رکھتے ہیں؟'' اب کی بار رطابہ نے کہا تھا جس پر ہمیشہ کی طرح سلطانہ نے تنبیہی اور شاہین نے مسکراتی نظروں سے دیکھا تھا۔

''چونچ بند رکھو اور مجھے کھانے دو۔'' نینا نے دو بدو جواب دیا تھا اور کھانے لگی تھی۔

''واقعی امی آپ کے ہاتھ میں جو ذائقہ ہے۔ میری پکی ہوئی چیزوں میں تو وہ آ ہی نہیں سکتا۔'' نینا کو ہمیشہ یہ قلق ہی رہتا کہ اس کے ہاتھ کی پکی ہوئی چیز آخر بہترین کیوں نہیں ہوتی جس کا اظہار وہ اب تک کرتی رہتی تھی۔

حالانکہ یہ بھی بس نینا کی اپنی سوچ تھی کہ اس کی پکی ہوئی چیز بس اچھی ہوتی ہے، جبکہ باقی سب کا یہی کہنا تھا کہ نینا کے ہاتھ میں کمال کا ذائقہ ہے۔

ہلکی ہلکی نوک جھونک میں کھانا کھایا گیا۔ درمیان میں سلطانہ نے ٹوکا بھی تھا کہ کھانا خاموشی سے کھاؤ، لیکن تینوں بہنوں کو چند لمحوں بعد کوئی نہ کوئی 'ضروری بات' یاد آ ہی جاتی، جسے اسی وقت بتانا ضروری ہوتا تھا۔

کھانا کھانے اور برتن سمیٹنے کے بعد مینا اور نینا دونوں نے اپنی اپنی جگہ پر مصمم ارادہ کیا تھا کہ سلطانہ اور شاہین کے ساتھ بہت دیر بیٹھیں گی اور ڈھیر ساری باتیں کریں گی، لیکن مسئلہ یہ تھا کہ انہیں آپس میں باتیں شیئر کرنے کی جلدی تھی، سو تھوڑی دیر بعد امیوں کے ساتھ بیٹھنے کا سوچ کر اسی کمرے میں آ گئیں جس میں شادی سے پہلے وہ رہتی تھیں۔ رطابہ بھی ان کے ساتھ ہی آ گئی تھی۔

''ویسے میں دوپہر کو کھانا نہیں کھاتی، شام کو طٰہٰ کے ساتھ کھاتی ہوں۔ آج بس تم لوگوں کے ساتھ کھالیا۔'' مینا نے آرام دہ نشست اپناتے ہوئے کہا تھا۔

''لیکن میں تو بعد میں آئی ہوں اور رطابہ نے بھی یقیناً کھانے کے لیے نہیں کہا ہوگا۔'' نینا نے رطابہ سے پوچھتے ہوئے کہا تھا۔

''ہاں میں نے بھی کھانے کے لیے نہیں کہا۔ خود ہی من للچا رہا ہوگا، آخر امی نے بھی آج کافی اچھی ڈشیں بنائی تھیں۔''

اور پھر نینا نے زور و شور سے مینا کے اب تک کے ندیدے پن کے من گھڑت قصے سنانا شروع کردیے اور رطابہ بھی اسی زور و شور سے نینا کی ہاں

میں ہاں ملاتی رہی اور مینا نے بھی چیخ چیخ کر اپنی وکالت کرنے کی کوشش کی تھی، لیکن ان دو کے سامنے وہ اکیلی ہار گئی۔

اس ہنگامہ آرائی کے بعد وہ تینوں ان واقعات کو بتانے کے لیے تیار تھیں جو اس مختصر عرصے میں ان کے ساتھ پیش آئے تھے۔

رطابہ نے بتایا کہ اس کے کالج میں ایک لڑکا اسے دیکھتا رہتا ہے۔ شکل سے شریف لگتا ہے، کوئی اور منفی بات بھی سامنے نہیں آئی لیکن یہ سمجھ نہیں آئی کہ وہ آخر اسے کیوں گھورتا رہتا ہے؟ اس کے اندازے کے مطابق وہ لڑکا ہو سکتا ہے اسے پسند کرتا ہو۔ لیکن بقول رطابہ کے وہ اس لڑکے پر دھیان نہیں دیتی، ویسے وہ لڑکا رطابہ سے دو سال سینئر ہے۔

مینا نے ان دونوں کو نیلوفر کے بارے میں بتایا تھا اور اب اس 'نیلوفر نامے' میں کچھ اضافہ کیا تھا کہ کس طرح سب کے مطابق نیلوفر کی وجہ سے اس کی کھیر کی رسم کھٹائی میں پڑ گئی تھی اور اس کے علاوہ خدیجہ پھوپو کی ناراضگی سے ملحقہ داستان اور ساتھ ساتھ گھر میں موجود لڑکیوں کی ملی جلی لڑائیاں اور شوخیاں، اس کے علاوہ مینا نے ساتھ ساتھ عاشر کی بھی تعریف کی تھی کہ وہ بہت اچھے ہیں اور بہت خیال رکھنے والے ہیں۔

اور آخر میں مینا نے بتانا شروع کیا کہ طٰہٰ بہت اچھے ہیں۔ بہت ہی کیئرنگ ہیں، اس کے علاوہ طٰہٰ کی لامحدود خوبیاں...... طٰہٰ کے بعد اس نے اپنی پڑوسن اور نئی سہیلی ماریہ کے بارے میں بتانا شروع کیا تھا۔ کافی شوخ ہے ماریہ۔ ہر وقت ہنستی مسکراتی رہتی ہے۔ اس کے علاوہ ٹی وی میں بہت دلچسپی رکھتی ہے اور آخر میں مینا نے وہ بات بھی بتا دی جسے بتانے میں اسے سب سے زیادہ دلچسپی تھی۔

''میں نے ایک انڈین مووی دیکھی ہے۔'' مینا نے کافی دلچسپی سے بتایا تھا۔ ''مجھے بہت پسند بھی آئی ہے۔'' کچھ وقفے سے اس نے مزید اضافہ کیا تھا۔

نینا اور رطابہ نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ یہ بات واقعی عام باتوں سے ہٹ کر تھی۔

''اچھا ہے، ریفریشمنٹ کے لیے آدمی کبھی کبھار ٹی وی دیکھ لیتا ہے۔'' رطابہ نے کہا تھا۔ اور پھر مینا نے بتانا شروع کیا کہ کس طرح اس نے اتفاقی طور پر مووی دیکھی اور وہ واقعی اچھی مووی تھی۔ ایکسپوزنگ بھی نہیں تھی۔ اس نے ساتھ ساتھ فلم کی اسٹوری بھی سنائی جسے نینا اور رطابہ دونوں نے سرسری سا سن لیا۔

نینا اور رطابہ کو معلوم تھا کہ مینا کو شروع سے ناولوں اور افسانوں میں کس قدر دلچسپی تھی۔ اس لیے انہوں نے کوئی خاص نوٹس نہیں لیا۔

اسی طرح اٹھتے بیٹھتے اور گپ شپ کرتے مغرب ہو گئی اور مغرب کی نماز ادا کرتے ہی نینا نے جانے کے لیے پر تولے تھے۔ اور تھوڑی دیر بعد وہ ساربان کے ساتھ چلی گئی۔

''طٰہٰ کب آئے گا؟'' سلطانہ نے تسبیح کے دانے گرانے کے درمیان پوچھا۔ مغرب کی نماز کے بعد وہ تسبیح ضرور پڑھتی تھیں۔

''وہ نہیں آئیں گے۔'' مینا نے اطمینان سے سرسری انداز میں بتایا تھا۔ ''میں آج رات یہیں رہوں گی۔'' سلطانہ کے مزید کچھ پوچھنے سے پہلے ہی اس نے وضاحت کی تھی۔

ایک دانہ بغیر تسبیح پڑھے، پڑھے ہوئے دانوں میں چلا گیا تھا، جس کا سلطانہ کو پتا بھی نہ چلا تھا لیکن اس نے اس تسبیح کے دانے کے بارے میں نہیں سوچا تھا، کیوں کہ انہیں مینا کی بات کافی حیران کن لگی تھی۔

جلد ہی ان کی یہ حیرانی، تشویش میں بدل گئی۔ مینا جو کچھ کہہ رہی تھی وہ کسی طور بھی مناسب نہیں تھا۔

''لیکن کیوں؟'' سلطانہ نے پوچھا تھا۔ اس نے تسبیح ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل کی تھی۔ تسبیح کے دانے بھی اس نے مکس کر لیے تھے۔

''کیوں کا کیا مطلب ہے؟ میں بس ویسے ہی رہنے آئی ہوں۔'' مینا کا لہجہ اور انداز دونوں عامیانہ تھے۔

''لیکن بیٹا......'' سلطانہ سے کوئی بات نہ کہی جا سکی۔

لیکن کچھ ہی دیر میں اس نے الفاظ ترتیب دیے اور کہنا شروع کیا۔

''تم یہ بھی دیکھو نا، پیچھے تمہارا میاں اکیلا ہوتا ہے۔ تمہاری کوئی نند یا ساس تو نہیں بیٹھی جو طٰہٰ کا خیال کرے گی اور پھر مسئلہ صرف اکیلے پن کا نہیں، طٰہٰ کھائے گا کہاں سے؟'' سلطانہ نے اپنے تئیں اسے مناسب الفاظ میں سمجھایا تھا۔

''اکیلا پن کہاں امی...... ٹی وی دیکھ لیں گے، بہت سارے چینلز ہیں۔ ویسے بھی وہ ٹی وی دیکھا کرتے ہیں اور رہی بات کھانے کی تو وہ فرزانہ آپا کے ہاں کھا لیں گے۔ میں نے کہا تھا ان سے کہ یہیں آ کر کھا لیں، لیکن انہوں نے ہی کہا تھا کہ فرزانہ آپا کے گھر سے کھا لوں گا۔'' مینا نے ماں کی باتوں کو رد کر دیا تھا۔

''مشینیں انسانوں کا بدل نہیں ہوتی، غیر ذمہ داری سے کام مت لو، اور رہی بات فرزانہ کی...... بلاشبہ وہ طٰہٰ کی بہن بنی ہوئی ہے اور ٹھیک ہے کہ فرزانہ نے ایک لمبا عرصہ طٰہٰ کا خیال رکھا ہے، لیکن تمہارے ہوتے ہوئے فرزانہ کو تکلیف دینے کی کیا تک بنتی ہے۔'' سلطانہ نے مینا کو سمجھانے کی کوشش کی تھی اور انہیں اندازہ تھا کہ مینا کو بات سمجھ آ جائے گی۔

''امی! ایک دن میں کچھ نہیں ہوتا۔ فرزانہ آپا بھی کچھ نہیں سوچیں گی۔ آپ بھی ٹینشن مت لیں۔'' مینا نے الٹا ماں کو سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ سلطانہ کو مینا کے الفاظ کافی برے لگے تھے۔ ابھی کچھ کہنے کا ارادہ رکھتی تھی لیکن اسے احساس ہوا تھا کہ شاہین اس بات کو بہتر انداز میں سمجھا سکتی ہے، اسی لیے کچھ کہنے کی بجائے وہ کچن کی طرف چلی گئی تھیں۔ جہاں رطابہ اور شاہین کچھ پکانے میں مصروف تھیں۔

تھوڑی دیر بعد شاہین مینا کے ساتھ بیٹھی اسے سمجھا رہی تھیں۔ انہوں نے کہا کہ طٰہٰ کا خیال رکھنا اس کا اولین فرض ہے، اس لیے اسے طٰہٰ سے غافل نہیں ہونا چاہیے، ساتھ ساتھ شاہین نے نینا کی مثال بھی دی۔ بھرا پرا سسرال ہے لیکن پھر بھی عاشر کو چھوڑ کر یہاں رہنا اس نے مناسب خیال نہیں کیا۔'' نینا کی مثال سے زیادہ شاہین کے انداز نے اسے سمجھایا تھا۔ واقعی وہ ٹھیک کہہ رہی تھیں۔ مینا کی فطرت میں سب سے اچھی بات بھی یہی تھی کہ وہ ہٹ دھرم طبیعت مالک کی نہیں تھی۔ اگر کوئی انسان اسے سمجھانے کی کوشش کرتا اور اسے محسوس ہو جاتا کہ وہ انسان ٹھیک کہہ رہا ہے تو اسے اپنے آپ کو غلط قرار دینے میں کوئی عار محسوس نہیں ہوتا تھا۔ اسی لیے چند لمحوں بعد وہ فون اٹھائے طٰہٰ کا نمبر ملا رہی تھی تاکہ اسے کہے کہ کھانا یہیں آ کر کھا لے اور اسے بھی لے جائے۔

☆......☆......☆

''اس قدر اہتمام کی کیا ضرورت تھی آپا......'' دور تک لوازمات سے سجی ڈائننگ ٹیبل کو دیکھتے ہوئے طٰہٰ نے کہا تھا۔

فرزانہ آپا نے ڈھیروں اہتمام کیا تھا۔ جب آفس سے طٰہٰ نے فون کیا تھا کہ آج مینا کی غیر موجودگی کی وجہ سے وہ کھانا فرزانہ آپا کے ہاں کھائے گا۔ تو وہ بہت پُر جوش ہو گئی تھیں۔

''آج کتنے عرصے بعد تو میرا بھائی یہاں کھانا کھا رہا ہے، بس اسی لیے جو دل چاہا پکالیا۔'' فرزانہ آپا کے لہجے میں خلوص و پیار کی آمیزش تھی۔ فرزانہ آپا کی بات سُن کر طٰہٰ نے سرشاری محسوس کی تھی۔

نرگسی کوفتے، شملہ مرچ اور قیمہ، کابلی پلاؤ اور چکن جلفریزی......تمام چیزیں طٰہٰ کی پسند کی تھیں۔

''اگر مینا ہوتی تو ہر چیز کتنی اچھی لگتی۔'' طٰہٰ کے ذہن پر اس سوچ نے دستک دی تھی۔

''میٹھا ابھی فریج میں پڑا ہے بعد میں لے لیں گے۔'' فرزانہ آپا نے کہا تھا۔

''آئیں کھانا کھائیں۔'' طٰہٰ نے پاس کھڑی فرزانہ آپا کو پیش کش کی تھی۔

''ہاں میں نے بھی کھانا نہیں کھایا، سوچا کہ تمہارے ساتھ ہی کھاؤں گی۔'' فرزانہ آپا نے مسکراتے ہوئے کہا تھا اور کرسی کھینچ کر طٰہٰ کے ساتھ بیٹھ گئیں۔

''اوہ......آپا آپ کو اس طرح بھوکا نہیں رہنا چاہیے تھا، کچھ کھالیتیں۔'' طٰہٰ نے کہا تھا۔

''کچھ نہیں ہوتا...... چلو کھانا شروع کرتے ہیں۔'' فرزانہ آپا نے ایک ڈونگے کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا تھا۔

''یا خدا! مینا بس یہیں پر آجائے کسی بھی طرح۔'' طٰہٰ نے دعائیہ انداز میں سوچا تھا۔

مینا کے ساتھ گزرا ہر وقت طٰہٰ کے لیے یادگار رہتا تھا، سو شاید وہ یہ پل بھی یادگار بنانا چاہتا تھا۔

وقت کی برکت تھی یا پھر طٰہٰ کے دل سے نکلے الفاظ صداقت لیے ہوئے تھے۔ جو کچھ بھی تھا۔ طٰہٰ ابھی کسی ڈونگے کی طرف ہاتھ بڑھانا ہی چاہتا تھا کہ اس کا فون بج اٹھا۔

''سوئیٹو (Sweeto)'' موبائل فون کی اسکرین پر جگمگا رہا تھا۔ ایک مسکراہٹ نے طٰہٰ کے لبوں کا احاطہ کیا تھا اور اس نے موبائل کان سے لگالیا۔

''السلام وعلیکم!'' طٰہٰ نے گلا کھنکھارتے ہوئے کچھ شوخی دکھائی تھی۔

ایک منٹ اور گیارہ سیکنڈ کی اس کال میں گیارہ سیکنڈ طٰہٰ نے فرزانہ آپا کے بارے میں سوچا تھا کہ کیا وہ مزید کچھ دیر بھوکا رہ لیں گی۔

''آپا! مینا کا فون تھا۔ کہہ رہی تھی کہ آکر مجھے لے جاؤ اگر آپ مزید کچھ دیر انتظار کرسکیں تو ہم تینوں......''

''کیوں نہیں، لے آؤ! بلکہ یہ بہت اچھا ہے۔'' فرزانہ آپا نے مسکراتے ہوئے کہا تھا اور طٰہٰ خوش دلی سے اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔

''مینا واقعی بہت اچھی لڑکی ہے۔ دیکھو میکے رات گزارنے گئی تھی اور ابھی مغرب ہی ہوئی ہے اور تمہیں فون گھما کر کہہ دیا کہ آکر لے جاؤ۔ وہ نصیب والی ہے اور تم نصیبوں والے۔'' جاتے ہوئے طٰہٰ کے کانوں سے فرزانہ آپا کے یہ الفاظ ٹکرائے تھے۔ جسے سنتے ہی طٰہٰ آسمان پر جا پہنچا تھا اور ساتھ ہی ساتھ چہرہ بھی خوشی سے دمکنے لگا تھا۔

''آپا میں بس ابھی آیا۔'' طٰہٰ نے کہا تھا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ چالیس منٹ بعد مینا طٰہٰ کے ساتھ مسکراتے ہوئے فرزانہ آپا کے سامنے بیٹھی تھی۔

نیم ٹھنڈے سالن کو فرزانہ آپا اوون میں گرم کرچکی تھیں۔ خوشگوار ماحول میں تینوں نے کھانا کھایا تھا۔ جس میں مینا کھانا کھانے کے ساتھ ساتھ چہکتی رہی تھی، جبکہ فرزانہ آپا اور طٰہٰ مسکراتے رہے تھے۔ فرزانہ آپا سے نظر بچا کر طٰہٰ نے مینا کے کان میں بھی کچھ کہا تھا، جس پر مینا شرما گئی تھی۔

''ماشاء اللہ! میرے بھائی کی خوشیوں کو کسی کی

نظر نہ لگے۔'' فرزانہ آپا نے کھانا کھانے کے دوران سوچا تھا۔

اگر اس وقت کوئی طٰہٰ سے پوچھتا کہ اس دنیا کا سب سے خوش قسمت انسان کون ہے۔ تو وہ مائیکرو سیکنڈز میں جواب دیتا۔

''میں۔''

☆......☆......☆

کہتے ہیں کہ وہ انسان بہت اچھا ہے۔ پھر کسی دوسرے انسان کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ انسان بہت برا ہے۔ اسی طرح اگر کسی تیسرے کے بارے میں تبصرہ کیا جائے تو یہ سنائی دیتا ہے کہ صحیح ہے۔ لیکن انسان تو سارے ایک جیسے ہی ہوتے ہیں۔

بات ساری دل کی ہوتی ہے۔ یہ دل ہی کسی انسان کو اچھا یا برا بناتا ہے، لیکن کبھی کبھار ایسا بھی ہوجاتا ہے کہ ایک آدمی کا من بیک وقت اچھا بھی ہوتا ہے اور برا بھی......

اس کی ایک سادہ وجہ ہے جو بہت کم لوگوں کو سمجھ آتی ہے اور جنہیں سمجھ آتی ہے وہ ایک کامیاب زندگی گزارتے ہیں۔ خوشگوار اور پُرسکون زندگی......

اور وہ سادہ بات بس اتنی سی ہے کہ ہم ایک دوسرے کو سمجھنے میں غلطی کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کو سمجھ نہیں پاتے، ایک دوسرے کی خواہش کے بارے میں یہ نہیں سوچتے کہ آخر یہ خواہش کہاں سے آئی ہے؟ اور کیوں ہے؟ اور یوں کسی کو سمجھنے میں غلطی کرنے کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ ہم اس شخص سے بہت زیادہ اُمیدیں لگا بیٹھتے ہیں یا پھر تمام اُمیدیں چھوڑ بیٹھتے ہیں۔ دونوں باتوں کا انجام 'ایک' ہی ہوتا ہے۔

کسی کو سمجھنا مشکل کام نہیں ہے بس اگر ہم اپنی تھوڑی سی خود غرضی خود ختم کردیں، آخر ہم ایک دوسرے کی خواہش کا احترام کیوں نہیں کرتے؟

دوسروں کو کم تر کیوں جانتے ہیں؟ ساری باتوں کی وجہ مخصوص پیمانے سے بڑھی ہوئی خود غرضی ہے۔ ہمیں اپنے اردگرد پائے جانے والے لوگوں سے پیار ہوتا ہے جو کہ بڑھتا اور گھٹتا رہتا ہے۔

جب ہم بچے ہوتے ہیں تو والدین پیارے ہوتے ہیں۔ جب ہم نوعمر ہوتے ہیں، جوانی چھائی ہوتی ہے۔ اس وقت ہمیں دوست اور محبت پیارے ہوتے ہیں۔ اور جب خود ہمارے بچے ہوتے ہیں تو ہمیں اپنے بچے پیارے ہوتے ہیں۔ یہی پیار اور محبت زندگی کے نظارے بنتے جاتے ہیں اور یہی نظارے ایک ایک کرکے گزر جاتے ہیں۔

دنیا میں بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جنہیں بہت کم محبت نصیب ہوتی ہے، لیکن وہ بھی زندگی کے نظارے دیکھتے ہیں جو کچھ پھیکے ہوتے ہیں۔

ان پھیکے نظاروں کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ان میں محبت کا فقدان ہوتا ہے۔ اور محبت کا فقدان کسی طور اچھا نہیں ہوتا۔

☆......☆......☆

''ایکسکیوزمی!''

رطابہ کے Forensic Medicine کے ڈپارٹمنٹ کی طرف تیزی سے بڑھتے ہوئے قدم رُک گئے۔ اس نے مڑ کر آواز کے رُخ دیکھا۔

وہاں وہی لڑکا کھڑا تھا جس کے بارے میں وہ کچھ عرصے سے محسوس کررہی تھی کہ وہ اسے ہر جگہ تکتا ہے۔

رطابہ کو کوفت سی ہوئی تھی لیکن اس نے پھر بھی اخلاق کا دامن نہ چھوڑا۔

''جی فرمائیے'' یہ کہہ کر رطابہ نے ایک نظر اس لڑکے کا جائزہ بھی لیا۔ قدرے سوبر سے لباس میں ملبوس وہ اچھی شکل کا لڑکا تھا۔

''وہ میں نے آپ سے ایک ضروری بات کرنی

ہے۔'' غالب کو سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کہے۔

''ضروری بات۔'' رطابہ کو کھٹکا ہوا لیکن اب اسے کیا کرنا چاہیے؟ یہ رطابہ کے لیے سوال تھا۔

اسی وقت لڑکیوں کا ایک گروپ اسی طرف آتا دکھائی دیا، جس کوریڈور میں رطابہ اس لڑکے کے ساتھ کھڑی تھی۔ وہ لڑکیاں رطابہ کی کلاس میٹس تھیں اور ان میں ایک دو تو رطابہ کی سہیلیاں بھی تھیں۔ انہیں دیکھ کر رطابہ تھوڑا اسٹپٹا سی گئی تھی۔ ان لڑکیوں نے اسے بعد میں چھیڑنا تھا کہ وہ وہاں کیوں کھڑی تھی اور وہ بھی ایک سینئر کولیگ کے ساتھ، اور پھر بات کا بتنگڑ بن جانا تھا، لیکن مصیبت اب سر پر پڑ چکی تھی۔

رطابہ اور غالب کے پاس سے گزرتے ہوئے ان میں سے ایک کھنکاری تھی، جبکہ کچھ نے معنی خیز نظروں سے اور کچھ نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ دیکھا تھا۔

نئی جنریشن تو ویسے بھی گپ شپ کے لیے ایسے موضوعات کی ضرورت محسوس کرتی رہتی ہے۔ اب وہ لڑکیاں آگے کی طرف بڑھ گئی تھیں۔

کوریڈور کے آخری دہانے پر فارنسک میڈیسن کا شعبہ تھا۔

''جی کہیے...... کیا کہنا ہے؟'' رطابہ کی کوفت کا پیمانہ لبریز ہوا چاہتا تھا۔ اس نے ایک نظر گھڑی کو بھی دیکھا۔ لیکچر شروع ہونے میں ابھی دس منٹ رہتے تھے۔

غالب گڑبڑا سا گیا۔ ''اب کیا کہوں؟'' جو بات وہ کہنا چاہتا تھا۔ اب وہ اس وقت اور اس سچویشن میں کہنا اسے آناً فاناً نامناسب لگنے لگی تھی۔

''وہ اگر آپ کو اسٹڈیز میں ہیلپ کی ضرورت ہو تو...... آپ......'' رطابہ نے خشمگیں نگاہوں سے غالب کو دیکھا تھا۔

''یہ کہنا تھا آپ کو۔'' غالب سٹپٹا گیا۔

رطابہ نے ایک نظر غالب پر ڈالی، جو واضح طور پر جتا رہی تھی کہ وہ فرسٹ ایئر میں آنے والی کوئی بوکھلائی ہوئی اسٹوڈنٹ نہیں، جسے سینئرز یہ کہتے پھریں کہ اگر آپ کو اسٹڈیز کی طرف سے مشکل پیش آ رہی ہے تو ہم آپ کی مدد کر سکتے ہیں۔'' وہ تھرڈ ایئر کی ایک میچور اسٹوڈنٹ تھی، جو اپنے مسائل خود اپنی کلاس میٹس سے مدد لے کر حل کر سکتی تھی۔

''نو تھینکس۔'' رطابہ نے غالب کو بس اتنا کہا اور ایک نظر پھر گھڑی پر ڈالی اور مطمئن ہو کر دوبارہ ڈیپارٹمنٹ کی طرف قدم بڑھا دیے۔

''کہیں کچھ گڑبڑ ہے۔'' رطابہ نے سوچا تھا۔

جو بات تھی وہ رطابہ کو سمجھ آ رہی تھی...... لیکن رطابہ کی نیچر ایسی تھی کہ وہ ان باتوں کو بالکل ناپسند کرتی تھی۔

یہ پسند کرنا، محبت کرنا اور پھر اس پسند، محبت کے نام پر ایک دوسرے کے ساتھ ڈیٹس پر جانا، لائبریری میں پڑھائی کے بہانے گھنٹوں ساتھ بیٹھنا...... اور پھر ایک دوسرے کو تحائف دینا......

''بکواس، واہیات......'' ان سب چیزوں کے بارے میں رطابہ کی یہی رائے تھی۔

ڈیپارٹمنٹ کے اندر داخل ہونے پر رطابہ نے ان تمام باتوں کو ذہن سے جھٹکا تھا، تاکہ وہ لیکچر اچھی طرح اٹینڈ کر سکے اور پیچھے کھڑے غالب نے دل ہی دل میں اپنے آپ کو بہت ملامت کی تھی۔

☆......☆......☆

''ابے یار تجھ سے اتنا کام بھی نہیں ہو سکتا۔ میں تو تجھے کچھ اور ہی سمجھتا تھا۔'' حماد نے پیکٹ میں پڑے آخری بسکٹ کو اٹھاتے ہوئے کہا تھا اور پھر اس نے پورا بسکٹ منہ میں ڈال لیا تھا۔ اسے منہ بھر کر کھانا شروع سے پسند تھا۔ اسی لیے وہ ہمیشہ بری بائٹ لیا

کرتا تھا۔

''مجھے دیکھ پوری پریکٹس ہے اس چیز کی۔'' بسکٹ نگلنے کے بعد اس نے کہا تھا۔ حماد نے غالب کو سمجھانے کے لیے ہاتھ سے اشارہ کیا تھا۔

اور پھر نیچی آواز میں اپنی وہی رام کہانی سنانے لگ گیا جو غالب ایک ہزار ایک مرتبہ پہلے بھی سُن چکا تھا۔ بلکہ جب سے یہ پریم کتھا شروع ہوئی تھی اور جیسے جیسے بڑھتی گئی تھی..... تب سے غالب اس سے واقف تھا۔

''پہلی بار میٹرک میں جب مجھے سونیا سے محبت ہوئی تھی تو بس اظہار کا سوچتا ہی رہا۔ اور میٹرک ختم ہوگئی اور میں اظہارِ محبت نہ کرسکا۔ اس بات پر بڑا پچھتایا تھا میں۔ اور جب دوسری بار مجھے ایف ایس سی فرسٹ ایئر میں ناہید سے محبت ہوئی تھی تو اپنی محبت کی تکمیل کے لیے میں نے ناہید کے بھائی سے پینگیں بڑھائیں۔ بس یار تھوڑی سی غلطی ہوگئی۔ جلد بازی کرلی تھی میں نے۔ آصف کے ذریعے ان سارے چھ کے چھ کو علیحدہ علیحدہ عید کارڈ بھیجے..... پیسے بھی بڑے خرچ ہوئے تھے۔ وہاں سے بھی نامراد ہوا پھر ایف ایس سی فرسٹ ایئر کے آخر میں ہی مجھے سدرہ.....''

''اچھا اب تم اپنی بکواس بند کرو گے۔ یاد ہیں مجھے تمہاری ناکام محبتوں کی داستانیں..... لیکن اب خدا کے لیے تم میری اس پاکیزہ محبت کو اپنی ان داستانوں سے علیحدہ رکھو۔ میں رطابہ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

غالب نے چائے کا مگ ٹیبل پر پٹخ دیا۔ وہ اس وقت حماد کے گھر کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا تھا۔ حماد کے ساتھ اس کی اسکول لائف کی دوستی تھی، اور وہ بھی کافی گہری۔ ''اس کا آسان حل یہ ہے کہ تم ایک گلاب کا پھول لے جاؤ اور رطابہ کو دیتے ہوئے کہو'' مجھ سے شادی کرو گی؟''

''ہاں میں تو شاہ رخ خان ہوں۔ اسے پھول دوں گا اور وہ ہیروئن کی طرح مسکراتے شرماتے پھول لے لے گی اور پھر بیک گراؤنڈ میوزک بجنا شروع ہوجائے گا..... ایسے نا۔'' غالب نے دانت پیستے ہوئے کہا تھا۔

''ایک اور حل ہے میرے پاس۔ تم خط کیوں نہیں لکھتے۔ کوئی اظہارِ محبت سے لبریز خط..... جسے ہم چھپ کر اس کی کتاب میں رکھ دیں گے۔''

''حماد کے بچے میں تمہیں جان سے مار ڈالوں گا، بے تکے انسان۔'' غالب نے آگے بڑھ کر حماد کی گردن دبوچ لی تھی۔

کچھ دیر ایسی دھینگا مشتی چلتی رہی۔ اور پھر جب وہ سیدھے ہوکر بیٹھے تو دونوں ہانپ رہے تھے۔ البتہ حماد ہنس بھی رہا تھا۔ کچھ دیر بعد حماد نے بولنا شروع کیا۔

''یار مسئلہ کیا ہے۔ جب تمہاری امی نے بھی اس لڑکی کو پسند کرلیا ہے اور تم نے بھی پسند کرلیا ہے تو ڈائریکٹ رشتہ بھیجو اس کے گھر۔ اور جس طرح کا ماحول تُو ان کے گھر کا بتاتا ہے، مجھے اُمید ہے کہ ہاں کردیں گے۔''

''لیکن یار میں اس کے خیالات جاننا چاہتا ہوں، خود اس کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ اسے پتا چلے کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں اور یہی محبت.....''

غالب کو یہی محبت پر بریک لگ گئی۔ آگے بولنے کے لیے اس کے پاس ڈائیلاگ ختم ہوچکے تھے۔

''دیکھ غالب..... تُو میرا سب سے اچھا دوست ہے۔ اس لیے میرا پُرخلوص مشورہ یہی ہے کہ تُو اس مسئلے کو خود حل کر، یہ تیرا پرسنل معاملہ ہے۔ میں کسی

صورت کوئی مشورہ نہیں دے سکتا۔'' حماد نے کہا تھا۔

حماد کی بات غالب کے دل کو لگی تھی۔ وہ واقعی صحیح کہہ رہا تھا۔ کچھ دیر غالب اسی طرح غائب دماغی سے بیٹھا رہا اور تب ایک بار پھر حماد کی آواز سنائی دی۔

''اچھا یار اب پڑھنے کا موڈ بنا، کل اسائنمنٹ جمع کروانے کی آخری تاریخ ہے۔ میں کتابیں لے کر آتا ہوں۔'' حماد نے اٹھنے سے پہلے غالب کا کندھا تھپتھپایا تھا اور چائے کے برتن اور بسکٹ کا خالی ریپر اٹھا کر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ حماد کے جانے کے بعد غالب نے ایک ٹھنڈی سانس بھری تھی۔

☆......☆......☆

غالب اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھا۔ عارفہ حیات اور زین العابدین صاحب نے غالب کے تمام لاڈ اٹھائے تھے گھر میں کسی قسم کی کوئی معاشی تنگی نہیں تھی، اس لیے حقیقی معنوں میں وہ 'دکھ' کے لفظ سے روشناس نہیں تھا۔

عارفہ اور زین العابدین صاحب نے غالب کی پرورش ایک حد میں رہتے ہوئے جدید تقاضوں کے مطابق کی تھی۔

غالب ایک سلجھا ہوا لڑکا تھا۔ اس کا حلقہ احباب کافی وسیع تھا۔ جس میں حماد اس کا سب سے اچھا اور گہرا دوست تھا، جس سے وہ کچھ بھی نہ چھپاتا اور پھر کزنز اور کلاس فیلوز وغیرہ......

ایک اہم بات یہ تھی کہ اس کی دوستی لڑکیوں سے بھی تھی، اور اس اہم بات کا اہم نکتہ یہ بھی تھا کہ ان لڑکیوں میں کوئی بھی اس کی گرل فرینڈ نہیں تھی۔

لڑکیوں کے ساتھ دوستی کرنا اسے پسند تھا لیکن ایک خاص حد تک...... فلرٹ کرنا، افیئر چلانا...... یہ سب اسے ناپسند تھا۔ اس لیے لڑکیوں پر مشتمل اس کا حلقہ احباب زیادہ وسیع نہیں تھا۔

زندگی گزارنے کے لیے اس نے کچھ اصول بنائے ہوئے تھے جن کی وہ پیروی کرتا تھا، اور ان اصولوں میں ردو بدل کی اس نے گنجائش نہیں چھوڑی تھی۔

دن ایسے ہی گزر رہے تھے کہ اسے رطابہ پسند آ گئی تھی۔ اتنی پسند، اتنی پسند کہ اس نے رطابہ کو شریکِ سفر بنانے کا فیصلہ کرلیا۔ اسے یقین ہو گیا کہ اسے رطابہ سے محبت ہو گئی ہے۔

اور شاید اس کی خوش نصیبی تھی کہ عارفہ نے بھی اس لڑکی کو پسند کیا تھا، بس اب صرف رطابہ نے ہری جھنڈی دکھانا تھی۔ لیکن، کیسے اور کس طرح؟ اس کا جواب غالب کو ڈھونڈنا تھا۔

☆......☆......☆

مینا نے چہرے پر آئی ہوئی لٹ کو ایک بار پھر کان کے پیچھے اڑسا تھا۔ اور دوبارہ چولہے پر چڑھی چکن جلفریزی کی طرف متوجہ ہو گئی تھی جواب آخری مراحل میں تھی، جلفریزی کے بعد اس کا ارادہ منچورین بنانے کا تھا۔ وہ چولہے کی آنچ دھیمی کر رہی تھی جب اسے ماریہ کی آواز سنائی دی تھی۔

سلام دعا اور استقبالیہ جملوں کا تبادلہ ہونے تک ماریہ کچن میں پڑے اسٹول کو کھینچ کر بیٹھ چکی تھی۔

''کیا بنا رہی ہو؟'' ماریہ نے پوچھا تھا۔

''فی الحال تو جلفریزی، اس کے بعد میرا ارادہ منچورین بنانے کا ہے۔'' مینا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا تھا۔

''کیا روز دو تین ڈشز بنانا ضروری ہوتا ہے؟'' ماریہ نے اپنے دائیں ہاتھ میں موجود آرٹیفیشل رنگ سے کھیلتے ہوئے کہا تھا اور جملہ ختم ہونے سے پہلے ہی وہ رنگ دائیں ہاتھ سے بائیں ہاتھ میں منتقل کر چکی تھی۔

''بس ضروری ہی سمجھ لو۔ بس مجھے ہی اچھا لگتا ہے کہ جب کھانے کے لیے ٹیبل پر بیٹھیں تو کم از کم وہ بھری ہوئی تو ہو، ورنہ مجھے اپنے آپ سے شرمندگی ہونے لگتی ہے۔''

''لو بھئی یہ بھی کوئی بات ہوئی، خوامخواہ ایسے ہی شرمندگی، ویسے میں جب بھی آتی ہوں تمہیں کچن میں ہی پاتی ہوں۔ لگتا ہے تمہیں کچن میں کام کرنا کچھ زیادہ ہی پسند ہے۔'' ماریہ کی بات پر مینا مسکرا دی تھی۔

''مجھے دوسرے کاموں کی نسبت کوکنگ زیادہ پسند ہے۔''

''پسند ہونے کا مطلب یہ تو نہیں ہر وقت وہی کام کیے جاؤ۔ میرے خیال میں آج تم لوگ صرف جلفریزی پر گزارا کرلو، منچورین کسی اور دن بنالینا، آج تم میرے گھر چلو۔''

''آج......'' مینا کچھ سوچنے لگی۔

''سوچ کیا رہی ہو۔ بس پروگرام بن گیا ہے کہ تم ابھی میرے ساتھ، میرے گھر چل رہی ہو۔ بس اب تم جلدی سے کچن سمیٹو۔''

''لیکن میں نے طٰہٰ سے بھی تو نہیں پوچھا۔'' مینا نے عذر پیش کیا۔

''تو کیا طٰہٰ بھائی صاحب منع کردیں گے۔''

''منع تو نہیں کرتے لیکن پھر بھی پوچھ لینا چاہیے۔''

مینا نے جلفریزی میں آخری چمچ ہلایا اور چولہا بند کردیا۔

''موبائل کس چیز کی دوا ہے۔ موبائل پر پوچھ لو۔'' ماریہ کے پاس تو جیسے ہر مسئلے کا حل تھا۔ مینا چند لمحے سوچتی رہی اور پھر اس نے اقرار کرلیا۔

''چلو ٹھیک ہے چلتے ہیں۔'' کچن سمیٹنے اور طٰہٰ سے فون پر پوچھنے میں اسے لگ بھگ پندرہ منٹ لگ گئے۔ اور پھر اس نے کپڑے تبدیل کیے اور نماز پڑھی، مینا کی دیکھا دیکھی ماریہ نے بھی نماز پڑھ لی اور جب وہ ماریہ کے ساتھ گھر سے نکل رہی تھی اس وقت دو بج رہے تھے۔

ماریہ نے مینا کے نقاب اوڑھنے پر حیرت کا اظہار کیا تھا۔

''مجھے بس یہی بہتر لگتا ہے۔'' مسکراہٹ کے ساتھ مینا نے جواب دیا تھا۔ ماریہ نے مزید کچھ نہ پوچھا۔

☆......☆......☆

ماریہ کے گھر ماریہ کی والدہ صفیہ بڑی گرمجوشی سے ملی تھیں اور انہوں نے اس بات پر خوشی کا اظہار کیا تھا کہ ماریہ کی بھی کوئی سہیلی نقاب کرتی ہے اور صفیہ کی بات سن کر مینا شرما گئی تھی۔

ماریہ کا کمرہ کافی اچھا تھا۔ کچھ دیر وہ یونہی باتیں کرتی رہیں، لیکن مسئلہ یہ تھا کہ باتیں کرنے کے لیے موضوع نہیں تھا اور جو موضوع مینا کے لیے دلچسپ تھا وہ ماریہ کے لیے غیر دلچسپ تھا، اور ماریہ کے دلچسپ ترین موضوع کے متعلق بات کرنے کے لیے مینا کے پاس کچھ نہ تھا۔

''بولی وڈ اور فلم انڈسٹری کے متعلق وہ کیا باتیں کرے۔'' آخر پندرہ بیس منٹ بعد اُٹھ کر ماریہ نے فلم لگادی۔ مینا نے بھی منع نہیں کیا۔ ٹی وی اور ڈی وی ڈی پلیئر ماریہ کے کمرے میں موجود تھے۔

مینا کو فلم پسند آئی تھی اور ساتھ ساتھ ماریہ کی طرف سے دوران فلم، فلم سے متعلق دی گئی معلومات بھی اچھی لگی تھیں۔

☆......☆......☆

''اچھا تو تم نے وہاں جا کر فلم دیکھی ہے؟'' طٰہٰ نے مسکراتے ہوئے کہا تھا ساتھ ہی نوالہ منہ میں لیا تھا۔

''جی......''

''کون سی فلم دیکھی ہے۔'' طٰہٰ نے نوالہ بناتے ہوئے پوچھا تھا۔

''کرن جوہر کی کل ہو نہ ہو۔''

''کرن جوہر کی۔'' طٰہٰ کو کچھ زیادہ حیرت ہوئی تھی۔

''تمہیں کیسے پتا ہے کہ یہ کرن جوہر کی فلم ہے۔''

''ماریہ نے بتایا ہے...... پتا ہے اسے تو موویز کے بارے میں سب کچھ پتا ہے۔''

''سب کچھ......'' مینا نے جس انداز میں کہا تھا طٰہٰ کو ہنسی آ گئی۔

''دلچسپی ہو گی اسے فلم انڈسٹری سے۔'' طٰہٰ نے کہا تھا۔

''ایسی ویسی، بہت پسند کرتی ہے فلموں کو۔''

''اور اب تمہیں بھی موویز پسند آنے لگی ہیں۔'' طٰہٰ نے سرسری سا پوچھا تھا۔ اس بے ضرر پسند سے اسے کیا فرق پڑتا تھا، پھر بھی مینا کے میکے کی زندگی دیکھ کر مینا کو اس قدر جلدی مائل ہوتے ہوئے دیکھنا اسے کچھ عجیب سا لگا تھا۔

''اب ایسا بھی نہیں۔'' مینا نے گڑبڑاتے ہوئے جواب دیا تھا۔

کچھ نہ کچھ اور کسی حد تک لیکن...... تبدیلی آ چکی تھی، جسے قبول کرنے میں خود مینا کو بھی وقت لگنا تھا۔

☆......☆......☆

سمن کے لیے رشتا آیا ہوا تھا۔ سارے لوگ تھوڑے تھوڑے نروس تھے۔ ہاشم اور حاشر کے کمرے میں تھوڑی بہت ترمیم کی گئی تھی اور اب مہمانوں کو اسی کمرے میں بٹھایا ہوا تھا۔

سمن چائے کی ٹرالی لے کر آئی۔ مہمانوں کو چائے پیش کی اور چلی گئی۔ پسند تو وہ لوگ پہلے ہی کسی تقریب میں کر چکے تھے سمن کو، آج تو صرف رشتہ ڈالنے آئے تھے۔ جاوید کافی سلجھا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ نینا کچھ دیر مہمانوں کے ساتھ بیٹھی اور جب وہ کمرے سے نکل رہی تھی تو اسے نیلوفر آتی دکھائی دی۔ ''اوہ...... مصیبت......'' نینا کے منہ سے بے اختیار نکلا تھا۔ ویسے تو خدیجہ پھوپو کے گھر سے کھیر پکوائی کی رسم میں ہونے والی بدمزگی کے بعد کوئی نہیں آیا تھا۔ اور آج نیلوفر کی آمد......شاید انہیں بھی پتا چل گیا ہو گا کہ کچھ لوگ سمن کے لیے آج رشتہ لے کر آنے والے ہیں۔ نینا کو نیلوفر کو اندر جانے سے روکنا تھا۔ نیلوفر اندر 'کچھ' بھی کر سکتی تھی۔ فوری طور پر اسے سمجھ نہ آیا کہ کس طرح؟ لیکن اس نے نیلوفر کو کوریڈور میں ہی روک لیا۔

نینا کے سلام کا جواب نیلوفر نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ دیا تھا۔

''کیسی ہو؟'' نینا نے پوچھا تھا۔ اسی وقت اچانک اس کے ذہن میں بھی ایک ترکیب آ گئی جس سے وہ نیلوفر کو اندر جانے سے روک سکتی تھی۔ اس لیے اس نے نیلوفر کے جواب کا انتظار کیے بغیر ہی دوسرا سوال پوچھ لیا۔

''اصل میں نیلوفر...... وہ...... میں تم سے پوچھنا چاہتی تھی کہ عاشر واقعی تم سے......'' نینا یہیں پر رک گئی۔

''نیلوفر نے لحہ بھر نینا کو دیکھا تھا، لیکن نیلوفر کے کچھ بولنے سے پہلے نینا دوبارہ بول پڑی۔

''میں نے سنا ہے...... اگر تم پلیز میرے ذہن میں موجود گرہ کو کھول دو تو...... روم میں چلیں......؟''

نیلوفر نے نینا کو غور سے دیکھا تھا۔ یہ ہوائی کس نے اڑائی ہے؟ یہ سوچنا نیلوفر کو فضول لگا...... کیسے بیٹھے بٹھائے عاشر سے بدلہ لینے کا موقع مل رہا تھا۔

''اب تو پورے حساب چکاؤں گی۔'' نیلوفر نینا کے کمرے کی طرف قدم بڑھانے ہی والی تھی کہ اسے وہ 'مقصد' یاد آیا جس کے لیے وہ آئی تھی۔

"یہ اندر مہمان کون آئے بیٹھے ہیں...... ذرا دیکھ لوں۔"

"اوہ تو میرا اندازہ صحیح نکلا۔" نینا نے سوچا تھا اور ساتھ ہی نیلوفر سے کہا تھا۔

"سمن کا رشتہ لے کر آئے ہوئے ہیں کچھ لوگ، پچھلے بلاک سے ائے ہیں۔ ابھی آئے ہیں، تم بعد میں مل لینا...... پلیز پہلے مجھے بتادو...... میرا دماغ بھٹی کی طرح پک رہا ہے۔"

نینا کا دماغ بھٹی کی طرح پکنے کا سن کر نیلوفر خوش ہوگئی اور دوسرا مہمان بھی ابھی ابھی آئے تھے، سو وہ ان سے بعد میں بھی مل سکتی تھی۔

کمرے میں پہنچ کر نیلوفر نے نینا کو بتانا شروع کر دیا کہ کس طرح عاشر اسے پسند کرتا تھا۔ اس نے مجھے پرپوز بھی کیا تھا، لیکن یہ زاہدہ ممانی بھی...... اس نے کیا کیا خواب سجائے تھے۔ سب ڈھیر ہوگئے۔ عاشر کے دل میں موجود درد وہ اب بھی محسوس کرتی ہے لیکن بے بس ہے۔ اور نینا کے ساتھ عاشر کی لگاوٹ ایک دکھاوا ہے۔ دنیا نبھانے کا دستور۔

کچھ نیلوفر نے لمبی بات کی اور کچھ نینا کے چہرے کے تاثرات ایسے تھے جو نیلوفر کو بات بڑھانے پر مجبور کر رہے تھے اور کچھ نینا نے سوال ایسے پوچھے کہ بات مزید بڑھتی گئی۔

اور اس طرح پچیس منٹ گزر گئے۔ نینا نے سکون کا سانس لیا کہ چلو مہمان چلے گئے ہوں گے، بچت ہوگئی، دوسرا عاشر اور سمن کو بتانے کے لیے ایک لاجواب کہانی بھی مل گئی۔

اور جب نیلوفر نے نینا کے کمرے سے نکلنے کے بعد مہمانوں کو نہ پایا تو اسے تھوڑا بہت قلق تو ہوا...... لیکن یہ قلق اس خوشی سے کہیں کم تھا جو اسے نینا کو ساری معاشرتی مجبوریوں میں لپٹی عاشر کی 'پریم کتھا' سنانے پر ہوا تھا۔

نیلوفر کے کمرے سے جانے کے بعد نینا نے بھی باہر آکر اطمینان کر لیا کہ مہمان چلے گئے ہیں اور پھر وہ کمرے میں آکر کافی دیر ہنستی رہی تھی۔

"شادی کی رات تو کہا تھا کہ اگر میں تم سے زیادہ خوبصورت ہوتی تو تمہاری جگہ بیٹھی ہوتی اور آج اس نے زاہدہ کی ناپسندیدگی کو وجہ بتایا کہ جس کی وجہ سے وہ عاشر کی دلہن نہیں بن سکی۔ تھوڑا سا سوچ تو لے بندہ۔" نینا نے مسکراتے ہوئے سوچا تھا۔

تھوڑی دیر بعد جب اس نے سمن کو بتایا تو وہ بھی خوب ہنسی تھی۔

☆......☆......☆

ابھی کینٹین میں لڑکیاں رطابہ کو اس لڑکے کے حوالے سے تنگ کر رہی تھیں سو وہ بدمزہ ہو کر وہاں سے کچھ کھائے پیے بغیر ہی اُٹھ آئی تھی اور کینٹین سے کچھ فاصلے پر اسے پھر وہی لڑکا نظر آ گیا تھا۔

رطابہ کو دیکھ کر اس نے ایک مسکراہٹ پاس کی۔ رطابہ کے تو سر کو لگی اور پیروں میں بجھی۔

"سمجھتا کیا ہے، آخر کیا مصیبت ہے۔" رطابہ اسے کھری کھری سنانے کے لیے آگے بڑھی تھی۔

"السلام وعلیکم!" رطابہ کے کچھ کہنے سے پہلے اس لڑکے نے سلام کر دیا۔

"وعلیکم السلام!" رطابہ کے لہجے میں تندی تھی۔

"کیا حال ہیں آپ کے؟" رطابہ کے مزید کچھ کہنے سے پہلے اس نے حال احوال دریافت کر لیا۔

رطابہ کا دل چاہا کہ اسے قتل کر دے۔ بمشکل اپنے آپ کو اس فعل سے روکتے ہوئے وہ پھر کچھ کہنے ہی والی تھی کہ رطابہ کے دریافت کیے بغیر ہی وہ اپنا حال احوال بتا رہا تھا۔

"میں ٹھیک ٹھاک ہوں۔" رطابہ دانت کچکچا کر رہ گئی۔

"آپ کو ہے کیا؟" ابھی رطابہ کچھ اور کہنا ہی

چاہتی تھی کہ اسے پیچھے سے سینڈلوں کی ہلکی ہلکی کھٹ پٹ اور لڑکیوں کی گپ شپ کرتی مدھم آوازیں سنائی دیں۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو اس کی اپنی میٹس جنہیں وہ کینٹین چھوڑ کر آئی تھی، آ رہی تھیں۔

رطابہ کا دل چاہا بھاگ جائے لیکن اب تو بلا سر پر آ چکی تھی۔ رطابہ کو اپنی طرف دیکھ کر ان لڑکیوں نے بھی مسکراہٹ پاس کی، معنی خیز مسکراہٹ......

اب کی بار بھی پاس سے گزرتے ہوئے ان لڑکیوں نے کھنکھارا تھا، ساتھ میں معنی خیز مسکراہٹ اور معنی خیز نگاہیں بونس میں دی تھیں۔ اس کے علاوہ ان کے آگے بڑھنے کے بعد چند لڑکیوں نے انہیں مڑ مڑ کر بھی دیکھا تھا اور ہتک کے احساس سے رطابہ کا رنگ سرخ ہو گیا تھا اور اس نے مٹھیاں بھینچتے ہوئے گھور کر اس لڑکے کو دیکھا تھا۔

اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی، وہ لڑکا بول پڑا۔

''میں آپ سے محبت کرتا ہوں اور آپ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ ایک دو دن تک میری مدر رشتہ لے کر آپ کے گھر آ رہی ہیں۔'' غالب نے آرام وسکون سے ٹھہر ٹھہر کر کہا تھا۔ رطابہ کا غصہ دھرے کا دھرا رہ گیا۔ بے ساختہ اس نے دو تین بار بڑے زور سے پلکیں جھپکیں تھیں۔

☆......☆......☆

''میں آپ سے محبت کرتا ہوں اور آپ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ ایک دو دن تک میری مدر رشتہ لے کر آپ کے گھر آ رہی ہیں۔'' اس فقرے کی تشکیل میں غالب کو ایک ہفتے سے اوپر لگ گیا تھا۔ دل کا معاملہ تھا، دل کی مانی تھی غالب نے، کیونکہ دل تو آخر دل ہے۔ دل کی نہ مانتا تو کیا کرتا۔ اس نے رطابہ سے ڈائریکٹ بات کی تھی۔ رطابہ سے ڈائریکٹ بات کرنا بہتر تھا۔

عارفہ نے زاہدہ سے رابطہ کر کے سیف کے گھر پیغام بھیج دیا تھا کہ وہ رشتہ لے کر آ رہے ہیں۔

☆......☆......☆

نہ بہت زیادہ اسٹائلش، نہ بہت زیادہ سادہ، پنک کلر کا وہ شرارہ رطابہ پر کافی جچ رہا تھا۔ غالب بلیک کلر کے ٹو پیس میں تھا اور بہت اچھا لگ رہا تھا۔ کوئی باقاعدہ فنکشن نہیں تھا۔ بس یہی تھوڑے سے لوگ، چند ایک قریبی رشتہ دار، اور رطابہ کی سہیلیاں اور غالب کے گہرے دوست......

آج ان کا نکاح تھا۔ رشتہ پکا ہونے کے بعد عارفہ اور زین العابدین کا ارادہ تو ایک ہلکی پھلکی تقریب میں منگنی کرنے کا تھا۔ لیکن سیف نے کہا تھا کہ منگنی نہیں نکاح کر دیا جائے۔

عارفہ اور زین العابدین کو کچھ عجیب تو لگا تھا بلکہ خود غالب بھی اس مطالبے پر حیران ہوا تھا لیکن انہیں کیا اعتراض ہونا تھا۔

''نہیں...... منگنی جیسے کچے بندھن پر میں اپنی بیٹی کے جذبات کا رُخ ایک سمت نہیں کروں گا، نکاح بہتر ہے۔ منگنی کی ویسے بھی کوئی شرعی حیثیت نہیں ہے۔'' سیف نے شاہین اور سلطانہ سے کہا تھا۔ سیف کی باتوں میں دم تھا، سو آج رطابہ اور غالب کا نکاح تھا۔

ایجاب وقبول کا مرحلہ شروع ہو چکا تھا اور چند لمحوں کے بعد مبارک سلامت کی صدائیں سنائی دی تھیں۔ طٰہ اور عاشر ایک ساتھ بیٹھے تھے اور گپ شپ کر رہے تھے۔ 'سیاسی گپ شپ' اس لیے مینا اور نینا ان کے پاس نہیں بیٹھی تھیں سیف، شاہین اور سلطانہ بہت مطمئن نظر آ رہے تھے۔ زین العابدین اور عارفہ بھی بہت خوش نظر آ رہے تھے۔ غالب ان کا اکلوتا بیٹا تھا۔ نینا اور مینا اپنی جگہ خوش تھیں۔

(زندگی کی اونچی نیچی کٹھنائیوں پر سفر کرتے اِس خوبصورت ناولٹ کی چوتھی قسط ماہِ فروری میں ملاحظہ فرمائیں)

اُس کو رفاقت کا مفہوم اور اہمیت سمجھنے میں بہت دیر ہوگئی تبھی تو وہ عمر بھر Travel Alone ہی کرتی رہی۔ بظاہر اُس کی زندگی پھولوں سے سجی اور مہکتی ہوئی تھی۔ مگر اندر کا خلا...... سچ تو یہ ہے کہ رواں دواں زندگی میں اُس نے ان چیزوں کو نا پا کر بھی کچھ ایسا خاص خلا محسوس نہیں......

ماضی کا قصاص ادا کرتی ایک یادگار تحریر، افسانے کی صورت

نائلہ یونہی کتابوں کی ریک پر جھکی کتابیں الٹ پلٹ کر رہی تھی، یہ بھی اُس کا روز کا معمول تھا۔ وہ کوئی نا کوئی کتاب بالآخر ڈھونڈ ہی لیتی تھی، دوبارہ سہ بارہ پڑھنے کے لیے۔ اس کے علاوہ اُس کے پاس اور کوئی مصروفیت بھی تو نہیں تھی، پھر بھی دن تو کسی نہ کسی طور گزر ہی جاتا تھا مگر رات...... اُف رات جانے اب اتنی لمبی کیوں ہونے لگی تھی۔ رات آتی تو اُسے ایک سزا کی طرح لگتی۔ کبھی کبھی تو اُسے جنید پر رشک سا آتا۔ وہ کتنی گہری نیند سوتا تھا۔ وہ بار بار اُٹھتی، بیٹھتی، ٹہلتی، گھنٹوں لیٹی توبہ استغفار کرتی۔ پلٹ پلٹ کر گھڑی دیکھتی مگر اُسے ہمیشہ وقت رینگتا ہوا لگتا۔ ویسے تو وہ ہمیشہ ہی کم سونے کی عادی تھی۔ ہوتی بھی کیوں نہ، ابھی پڑھ ہی رہی تھی کہ جاب کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ پھر تو وہی معمول صبح صبح اُٹھو، بھاگم بھاگ تیاری پکڑو۔ وقت کے لمحے لمحے کا حساب رکھنے کے باوجود جانے کب صبح ہوتی تھی، کب شام۔ وقت ہاتھ سے پھسلا جاتا تھا اور اب ہائے اب تو واقعی صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا اُس کی سمجھ میں ٹھیک ٹھیک آ گیا تھا۔ ورنہ پہلے تو دن چھوٹا اور کاموں کا سلسلہ دراز، وہ ایسی ہی زندگی گزارتی آئی تھی، اس کی عادی تھی مگر اب جب قویٰ تھک سے گئے تو وقت الاسٹک کی طرح کھنچتا چلا گیا۔ اب بھی وہ سارے گھر کے سوئے رہنے پر علی الصبح اُٹھ جاتی پھر اُس کی کھٹر پٹر سے کبھی کبھی اُس کی بہو جھنجلاتی ہوئی اپنے کمرے سے باہر آتی۔

”کیا ہے امی آپ آج بھی اتنی صبح اُٹھ گئیں۔ آج تو اتوار ہے۔“ وہ زور سے جمائی لیتے ہوئے پوچھتی۔

”کچھ چاہیے تھا آپ کو۔“ اُس کا جھلایا ہوا لہجہ پکار پکار کر کہتا اُسے نائلہ کے بیٹے نے اٹھا کر بھیجا ہے۔ یہ بیٹے بھی خوب ہوتے ہیں۔ اپنے بوڑھے ماں باپ کو اپنی نہیں اپنی بیوی کی ذمہ داری سمجھتے ہیں کیوں؟ اس کا جواب وہ لاکھ تاویلیں ڈھونڈیں مگر یہاں تو مذہب کی چادر بھی انہیں تحفظ نہیں دیتی۔ وہ جھلائی ہوئی بہو کی طرف دیکھتی اور آہستہ سے کہتی۔ ”نہیں تم سو جاؤ۔“

بہو ایک لفظ کہے بغیر مڑ جاتی مگر اُسے اندازہ تھا
کہ وہ چڑ چکی ہے۔ ''پہلے اُٹھا دیتی ہیں پھر کہتی ہیں
سوجاؤ۔'' وہ شاید کچھ بڑبڑاتی بھی ہے مگر اچھا تھا

کان اب کم ہی سنتے تھے۔
وہ بہت کوشش کرتی تھی کہ آواز نا ہو مگر اُس سے
ہمیشہ اندازے کی غلطی ہو جاتی تھی۔ کوئی نا کوئی چیز اُس

کے پاؤں لگنے سے گر جاتی یا پھر ہاتھ سے کوئی برتن چھوٹ جاتا وہ گھبرا جاتی تو اور بھی مشکل ہو جاتی۔ صبح چائے کا ایک کپ اُس کی کمزوری تھا۔ وہ یاد کرتی کیسے وہ اپنے دفتر میں جاتی ہی تھی تو کبھی ہاشم کبھی اسلم فوراً گرما گرم چائے یا کافی اُس کی ٹیبل پر رکھ جاتے تھے۔ وہ تو ہمیشہ سب سے کہتی آئی تھی کہ مجھ سے کچھ بھی پکوالو مگر چائے یا کافی میں کبھی اچھی نہیں بناتی۔ وہ تو عادی تھی کہ کوئی سرو کرے اور بار بار کرے۔

35 سال کا عرصہ کم تو نہیں ہوتا عادتیں بنانے اور بگاڑنے میں، سو اُس کو طلب سی ہوتی تھی۔ پھر وہ خود کو نا روک پاتی مگر اِس کوشش میں کبھی کبھی تو چائے کی کیتلی ہی ہاتھ سے چھوٹ جاتی۔ پاؤں جلنے کی اذیت اُسے بلبلانے پر مجبور کر دیتی مگر وہ ضبط کی انتہائی منازل طے کرتی رہتی، اپنی آواز دبا لیتی۔ وہ کب کسی کو زحمت دینا چاہتی تھی مگر کیتلی گرنے کی آواز خاموش گھر میں گونج سی جاتی اور اِدھر اُدھر سب ہڑبڑا کر اُٹھ جاتے۔

جنید کو بھی تو یہی گلہ تھا کہ ایک تو تم میں قرار بالکل نہیں، پارہ سا بھرا رہتا ہے تم میں، کچھ خیال کرو۔ اب تم پہلے جیسی نہیں۔ کم از کم چھٹی کے دن تو سونے دیا کرو بچاریوں کو۔'' اُس کی تقریر جاری رہتی اور نائلہ سوچتی کہ میں کہاں کسی کو بے آرام کرنا چاہتی ہوں۔ میں تو خود کو بھی سلانا چاہتی ہوں، گہری اور پُرسکون نیند مگر کیا کروں...... نیند ہی روٹھ گئی ہے۔''

کہیں اندر سے آواز آتی۔ '''' تم نے قدر ہی نہیں کی آسانی سے مل جانے والی چیزوں کی۔ یاد نہیں کتنی نیند ستاتی تھی تمہیں مگر تم وہ ترکیبیں ڈھونڈتی تھیں کہ کیسے نیند بھگائی جائے۔'' بس اِس خیال کا آنا ہوتا کہ پھر تو کسی کے کہے ہوئے جملے ہولے ہولے سنائی دینے لگتے۔

'' مجھے تمہاری صبح خیزی کی عادت بہت اچھی لگتی ہے۔ فریش ایئر کے مزے لینا...... دن کا آغاز اچھا ہو تو انجام بخیر ہوتا ہے۔''

'' کچھ اندازہ ہے تمہیں سب تمہاری یہ صبح صبح کھٹر پٹر سے کتنے ڈسٹرب ہوتے ہیں؟'' جنید کی آواز اُسے حال میں کھینچ لائی۔

وہ جنید کی تلخ باتوں سے اتنی پریشان نہیں ہوتی تھی جتنی اذیت اُسے یہ آہستہ سے پیار بھرے لہجے میں کہے ہوئے الفاظ دیتے تھے۔ آنسوؤں کو راستہ مل جاتا۔

'' ایک تو تم ذرا ذرا سی بات پر رونا دھونا شروع کر دیتی ہو۔ بوڑھی ہو گئیں مگر میچور نہیں ہو پائیں۔'' وہ چڑ سا جاتا۔ وہ اُس کی کوئی بات نہیں سن رہی ہوتی۔ اُس کے کانوں میں تو جب یہ سلسلہ شروع ہوتا تھا تو جیسے ماضی کی کتاب کھل جاتی تھی ایک کے بعد دوسرا......

'' تمہارا دل تو بالکل چڑیا جیسا ہے۔ کوئی بھی بات ہو آنسو پلکوں پر دھرے رہتے ہیں۔ سوچتا ہوں میں تمہیں خوش بھی رکھ پاؤں گا یا نہیں۔''

'' اچھا اب بس بھی کرو۔'' جنید کی جھلائی ہوئی آواز اُسے حال میں کھینچ لاتی۔

پھر جب بیٹے، بہویں اور بچے اُٹھ جاتے تو پھر شور میں آواز دب جاتی، وہ بھی کچھ مگن سی ہو جاتی۔ بیٹے اُسے زبردستی ناشتے کی میز پر گھسیٹ لاتے۔ وہ اپنے خاندان میں گھر کر بھول جاتی مگر کبھی کبھی وہ جب لڑکھڑا کر گرتی یا ذرا بھی ڈس بیلنس ہوتی تو بیٹے چیختے۔

'' آپ کو کتنی دفعہ سمجھایا ہے آہستہ چلا کریں مگر آپ بہت تیز چلتی ہیں۔'' بہویں کہتیں۔

'' امی جی آپ اُٹھتی ہی کیوں ہیں۔ جب آپ سے کہا ہے ہمیں بلا لیا کیجیے اگر کچھ چاہیے۔'' جنید تو اکثر ہی کہتے تھے۔

'' ارے اس جلدی بازی میں تم کوئی ہڈی وڈی تڑوا بیٹھیں تو سمجھ لینا اب وہ ٹھیک نہیں ہو پائے گی۔ پھر بستر پر پڑی ہائے وائے کرتی رہنا۔'' اور پھر وہی

مدھم سا لہجہ کہیں قریب سے سنائی دیتا۔
''ارے کہیں چوٹ تو نہیں لگی۔ ایک تو تم بس اتنی جگہ پاؤ کہ گر سکو فوراً گر جاتی ہو اور میں ہولتا رہتا ہوں۔''
وہ بھی کبھی سوچتی یہ جملے تو وہ کب کے بھول بھال چکی تھی۔ زندگی کے کتنے ہی شب و روز ماہ و سال بنتے گزرتے گئے کبھی بھول کر بھی اُسے کچھ یاد نہ آیا۔ بیٹے صحیح کہتے تھے وہ تیز چلنے بلکہ بھاگنے کی عادی تھی۔ جنید بھی ٹھیک کہتے ہیں وہ جلد باز ہی تو تھی۔ جلدی جلدی بھاگ بھاگ کر سب کچھ فوراً مل جائے۔ وہ حریص تھی۔ زیادہ سے زیادہ، سب کچھ فوراً اُس نے حاصل بھی کیا۔ زندگی کامیابیوں اور ریوارڈز سے سجی سنوری تھی۔ کیا نہیں ملا۔ اچھا خوبصورت سجا سنورا پوش علاقے میں گھر، ہمیشہ برانڈ نیو زبردست بڑی گاڑیاں پھر اوپر والے کے کرم سے بچے...... وہ بھی بیٹے اور ایسے کہ دنیا رشک کرے۔ تعلیم، تہذیب اور سعادت میں مثالی، اُسے تو خود پر بھی بہت ناز تھا۔ آپ ہی آپ اُس کے اندر سے طمانیت کی سرشاری اور فخر کی تاجداری سما سی گئی تھی۔ دنیا کو نصیحتیں کرتی، محنت کرو، زندگی کو پلان کرو، خوبصورت بناؤ۔'' فوراً اپنا حوالہ نا بھی دے تو اندر کہیں یہ احساس جاگتا تھا۔ ''میری طرح۔''
پھر پتا نہیں وقت کی کیسی کروٹ تھی کہ اُس کا تیز انداز آہستہ روی میں یوں دبے پاؤں بدلا کہ اُسے احساس تک نا ہو پایا، وہ سنبھل جانے کی شعوری کوشش کے باوجود بے انداز غلطیاں کرنے لگی۔ بھول انتہا درجے پر پہنچ گئی۔ چیز رکھتی کہیں تھی، ڈھونڈتی کہیں تھی۔ دن دن بھر الماریاں کھولے چیزیں تلاش کرتی مگر کل کی رکھی چیز بھول جاتی اور یہ برسوں پرانی باتیں یوں یاد آئے جاتیں جیسے کل کی بات ہو۔
شروع شروع میں وہ خود پر ہنستی تھی، اندر ہی اندر مگر پھر اُسے خود احساس ہونے لگا کہ یہ کچھ نارمل نہیں اور پھر جیسے ایک خیال نے اُسے کڑی گرفت میں لے لیا۔ وہ احتساب کے عمل سے گزر رہی تھی لیکن بھلا اُس نے کیا کیا تھا۔ وہ تو خود اپنی نظر میں اور سب کی نظر میں ہمیشہ معتبر ہی رہی تھی اچانک خود کو اپنی ہی عدالت میں سزاوار لگنے لگی۔ پھر یہ سزا رکی نہیں اس کی چبھن بڑھتی رہی، دن ہو یا رات مسلسل کچوکے لگتے رہے۔ جسم توانائیاں کھو رہا تھا مگر دماغ تو اب بھی تیز تیز چلتا تھا۔ اُسے مشورہ ملا، مجھے معافی مانگ لینی چاہیے۔ اعتراف کر لینا چاہیے۔''
''کس بات کی معافی؟ کیسا اعتراف؟'' سوال و جواب شروع ہو گئے۔
''کیا کہو گی اُس سے، کب اور کیسے کہو گی؟ برسوں سے تو کوئی رابطہ نہیں رہا، گرچہ وہ قریبی کزن تھا۔''
مگر وقت نے سگے رشتوں کو بھی خاصہ بیگانہ کر دیا ہے اور پھر اُس رشتے کی ڈور تو کب سے اُس کے ہاتھوں سے نکل گئی تھی، بالکل ایسے جیسے گیس کے غبارے کی ڈوری۔ اُن لوگوں سے تو اب شاید پورے گھرانے کا ملنا جلنا نہیں تھا اور اُس کا کس سے ملنا جلنا باقی رہ گیا۔ جنید کو کہاں پسند تھا اُس کے رشتے داروں سے ملنا اور اُس کے خود اپنے پاس بھی کہاں وقت تھا رشتہ داریاں نبھانے کا۔ وہ تو بس وقت کی رو میں بہے چلی جا رہی تھی۔
پھر جب اذیت نا قابلِ برداشت ہونے لگی تو پھر معافی کا خیال آنے لگا۔ کسی سے فون نمبر مانگتی ہوں مگر ہمت ہی نا ہو پائی۔
وہ رات رات بھر سوچتی۔ عجیب سا احساس تاسف تھا، وہ سنگسار ہوتی۔
وہ بھی تو قاتل تھی، احساس کی قاتل۔
وہ بھی تو مقتول تھا جذبوں کا خوبصورت جذبوں کا مقتول اور یہ جذبے بیدار بھی تو خود نائلہ نے ہی کیے تھے۔ وہ دوست تھا، قریبی کزن تھا۔ بچپن کا

ساتھی تھا۔ ہر وقت آنا جانا، ہنسی مذاق...... مگر اُس نے کسی اور جذبے کا اظہار نہیں کیا تھا۔ خود وہ بھی تو جلد باز تھی۔ اس نے خود ہی بتادیا کہ تم میرے دل میں بستے ہو۔ سوتے جاگتے بس تمہارے ہی خواب ہیں۔ تم میرے لیے پوری دنیا ہو۔"

وہ حیران سا سنتا رہا پھر مست ہوگیا۔ خوشی سے نہال ہوگیا چاہا جانا اور اتنا چاہا جانا...... وہ عمر بھی ایسی تھی رنگ، خوشبو، چاند، چاندنی، گانے، فلمیں خوشیوں کے سب رنگ، ترنگ ہی ترنگ اور وہ اُس خوبصورت جذبے میں مسلسل رنگ بھی تو بھرتی رہی۔ اُس وقت وہ یوں محسوس کررہی تھی کہ زندگی تو بس یہی ہے۔

گنگنانے کو جی چاہتا، سجنے سنورنے کو جی چاہتا اور اُسے ستانے کو جی چاہتا تو وہ ہمیشہ اپنے دل کی تابع تھی۔

تو پھر جب دل نے راستے بدلے تو اُس نے آسانی سے بدل لیے، مگر وہ اُلجھ کر رہ گیا۔ پریشان ہوگیا۔ دوڑا دوڑا آیا۔

"کیا ہوا ہے! اتنی بے رخی؟ ایسے کیوں کررہی ہو۔ مجھ سے کچھ غلطی ہوگئی ہے۔ معاف کردو مجھے۔ دیکھو میں اپنے کان پکڑ رہا ہوں۔" وہ شاید ایسے ہی کوئی چھوٹی سی بات سمجھ رہا تھا مگر پھر جلد ہی اُسے اندازہ ہوگیا۔ وہ پریشان ہوگیا تھا۔

"مجھے یہ سزا نا دو مر جاؤں گا۔"

وہ کہاں سن پائی اور سمجھ پائی۔ وہ تو پور پور کسی اور رنگ میں رنگ چکی تھی۔ اُسے لگ رہا تھا وہ تو بس بچپنا تھا میرا، محبت تو مجھے اب ہوئی ہے، جنید سے۔ سچی محبت، جنوں تھی جنید کی محبت۔ اُس میں تپش تھی۔ وہ اُس کی محبت کی طرح دکھتی ہی کہاں تھی۔

وہ محبت کو شاید کبھی سمجھی ہی نہیں، تبھی تو اُس کا دامن محبت سے خالی ہی رہا۔

اُس کو رفاقت کا مفہوم اور اہمیت سمجھنے میں بہت دیر ہوگئی تبھی تو وہ عمر بھر Travel Alone ہی

کرتی رہی۔ بظاہر اُس کی زندگی پھولوں سے سجی اور مہکتی ہوئی تھی۔ مگر اندر کا خلا...... سچ تو یہ ہے کہ رواں دواں زندگی میں اُس نے ان چیزوں کو تاپا کر بھی کچھ ایسا خاص خلا محسوس نہیں کیا، بس کبھی کبھی ایسے جیسے تیز تیز چلتے ہوئے لگے کہ کوئی ایک آدھ ہارٹ بیٹ شاید مس ہوئی ہے۔

اوں ہوں بھاگتے رہو بس بھاگتے رہو۔

محبت تو اُس کی سمجھ میں بہت بعد میں آئی، اپنی بھی اور جنید کی بھی۔ وقت کی ٹھوکریں سب کو سب کچھ سمجھا دیتی ہیں۔ اُس نے اپنی بہن سے اس وقت کہا تھا۔

"جنید کا کسی سے کوئی تقابل نہیں اور اُس سے دو کمروں کا چھوٹا سا تو گھر ہے اُن لوگوں کا۔" ایسا کہتے ہوئے وہ بالکل بھول گئی تھی کہ اُس دو کمرے اور دالان نے اُس کی انسیت اور محبت کے کتنے ہی منظر محفوظ کیے تھے۔ وہ تو اپنے ہر اُس سے متعلقہ جذبوں کو کہیں سلا چکی تھی۔ اور اُس نے کہا تھا کہ بھی تم جنید کا گھر دیکھنا کیا شاندار گھر ہے اُس کا۔"

"مگر آپی تعلیمی لحاظ سے تو دونوں ہی ایک جیسے ہیں اور جاب بھی بس ایک ہی جیسی ہے۔" بہن چھوٹی تھی مگر اُسے سمجھانا چاہتی تھی۔

"ہاں مگر صرف جاب پر ہی تھوڑی انحصار ہے اُن کے گھر کا۔ ارے اُس کے والد کا بہت چلتا ہوا اچھا کاروبار ہے۔ پیسے کی تو ریل پیل سمجھو۔"

پہلی ٹھوکر شادی کے دوسرے ہی دن ولیمے میں لگی جب خود اُس کے وجود ہی سے حد درجہ لاپروائی برتی گئی۔ اُس کے خاندان کو کیا پروٹوکول ملتا؟

پھر دو دن بعد ہی سسر صاحب شادی کے اخراجات کی فہرست اٹھائے نانکہ سے اُس کے بنک اکاؤنٹ کی تفصیل پوچھ رہے تھے۔ یہی نہیں جنید نے اُس کے چار روز بعد ہی پوچھا۔

"اُف! بڑا خرچہ ہوگیا۔ تمہاری سیلری کب

کریڈٹ ہوتی ہے۔'' وہ ہکا بکا رہ گئی۔

مگر یہ سچ تھا اُس نے پیچھے پلٹ کر کبھی نہیں دیکھا تو اب کیوں؟ یہ بڑا سا سوالیہ نشان اُس کے ذہن پر بوجھ تھا۔

شاید یونہی وقت سب سے حساب لیتا ہے۔ وہ قاتل تھی، جذبوں اور احساسات کی قاتل، کسی کے اعتماد کی قاتل کیونکہ اُس نے سنا تھا وہ بہت بدل گیا ہے۔ بیوی ہی نہیں بیٹیاں بھی انتہائی آزاد خیال اور ماڈرن ازم کا شکار ہیں۔ اُن کے پہناوے، اُن کے انداز لوگوں کو اچھے نہیں لگتے تھے۔ جبکہ وہ کہتا تھا۔

''میں چاہتا ہوں تم ہمیشہ یوں ہی رہو۔'' وہ اپنے ہاتھوں میں اس کے چھوٹے سے ہاتھوں کو چھپا کر کہتا۔ ''ایسے جیسے سیپ میں موتی۔''

عورت کو ہمیشہ بری نظر سے بھی بچانا چاہیے اور مرد اُس کے لیے پناہ گاہ ہے۔ وہ تو نوکری کرنے کا بھی مخالف تھا کیوں بلا ضرورت کی جائے گھر محفوظ ہے چادر اور چار دیواری ہی تحفظ کی نشانیاں ہیں۔ وہ تو حجاب لینا پسند کرتا تھا۔ پھر اب وہ عملی زندگی میں ایسا کیوں کر رہا ہے۔ جب اُس نے سنا تھا تو سوچا تھا کہ لوگ بدل جاتے ہیں مگر اب سوچتی تھی۔ شاید اُس کا عورت پر سے اعتبار بھی ختم ہوگیا تھا۔ کیا فائدہ جب اُسے سیپ میں بند رہتے ہوئے بھی نئے ٹھکانے ڈھونڈنے آتے ہیں تو پھر جو چاہے کرے اُس کی مرضی۔ اتنے خیال، اتنی محبت کے باوجود بھی..... تو پھر کسی روک ٹوک کی ضرورت ہی کیا ہے۔ شاید وہ پھر کسی سے محبت ہی نہ کر پایا ہو۔ وہ شاید سچا تھا۔ اُس کی بے تابیاں، اُس کی بے قراریاں ...... پھر جب اُس کا دل ٹوٹا۔ جو ملا وہ کبھی مندمل ہوا یا نہیں؟

پتا نہیں، جوانی کی جولانیوں نے خود اُس سے کیا کیا کروایا، اب یہ احساس اُسے کچوکے دیتا تھا۔ وہ تو کبھی بیمار بھی نہیں پڑی کہ کچھ دن بستر پر لیٹی رہتی، کچھ سوچتی سا چتی بس بھاگتی رہی، بھاگتی رہی۔ ایک دن اور اتنے کام، عادت ہی بنالی تھی۔ پاؤں میں چکر، سر میں سودا۔ یہ کرلوں وہ کرلوں مگر کسی سے معافی مانگنی ہے، کوئی دیت وقصاص ڈیو ہے...... یہ خیال تو اُسے کبھی بھول کر بھی نہیں آیا تھا پھر اب کیوں؟ اب کیوں رات میں فائل کھل جاتی تھی اور دن میں خود اپنے کہے ہوئے الفاظ اپنے لیے سزا تجویز کرنے لگتے تھے؟

شاید اُس کے اندر کا اچھا انسان ابھی مرا نہیں تھا۔ وہ قاتل کسی کے اعتماد کی، کسی کے خوبصورت جذبوں کی، کسی کے احساس کی مگر اُس کی دیت و قصاص کیسے ادا ہو......

وہ پیسے سے تو کمزور نہیں تھی مگر پیسہ کیا ہر غم کا مداوا کرسکتا ہے؟ ہر اذیت کا مرہم ہے۔ وہ سوچتی، روتی اور رات رات بھر پریشان رہتی۔

وہ کیا کرے؟ وقت کے پہیے کو پیچھے کیسے لائے۔ معافی مانگے تو کیوں کر اور مانگ بھی لے تو وہ سارے اذیت ناک دن، وہ کربناک راتیں......

اُس کا اعتماد بحال ہوجائے گا کیا؟

وہ تو ہمیشہ کہتی تھی بیچاری عورت مظلوم ہے، معصوم ہے۔ فطرتاً نرم مزاج اور حساس ہے مگر کیا یہ قتل دانستہ یا نادانستہ اُس کے اور اُس کے جیسی سب عورتوں کے ذمے نہیں۔

جوانی دیوانی ہوتی ہے۔ جذبوں کی منہ زوری جانے کیا کیا کرا ڈالتی ہے۔

مگر سوچیے کسی کو اذیت، دکھ دینے، تکلیف پہنچانے کا قصاص کس کس پر ہے؟ کیا وہ لوگ جو زندگی کی شاہراہ پر قدم رکھ رہے ہیں، اس سے بچ سکتے ہیں؟ مگر کہاں؟ اِس اذیت پرست معاشرے میں جہاں انسانی جان قدر و قیمت کھو چکی ہو کوئی ایک معصوم بچے کے دونوں بازو کسی آرا مشین سے کاٹ کر پھینک سکتا ہو وہاں دل جیسی بے قیمت چیز کا کیا مول؟

☆☆......☆☆

وہ وقت سے خوفزدہ تھی جو بہت تیزی سے گزر رہا تھا۔ بلکہ سدرہ کو یہ ڈر بھی ستا رہا تھا کہ تعلیم مکمل ہوتے ہی اس کے والدین نے آئے ہوئے رشتوں میں سے کسی ایک کو منتخب کر کے اس کو وداع کرنے میں دیر نہیں لگانی۔ وہ تو پہلے ہی اسے یونیورسٹی......

عورت اور مرد کی نفسیات سے جڑا ایک سچ، افسانے کی صورت

"عورت اور بلی میں کوئی فرق نہیں ہے۔" شامی اور سدرہ کی اکثر بحث ہوتی تھی۔ "بلی کو جب تک پیار سے پچکارتے رہو، وہ آرام سے بیٹھی رہے گی۔ جہاں آپ نے اس کی مرضی کے خلاف بات کی۔ اس کے پنجے باہر آجائیں گے اور ایسی کینہ توز نظروں سے دیکھے گی کہ مانو اپنے پنجوں سے آنکھیں ہی نکال لے گی۔"

"ہاں تو صحیح ہے نا۔" وہ اس کی بات کی تائید کرتی، انداز چڑانے والا ہوتا۔ "اب دیکھو نا، بلی کتنا معصوم سا جانور ہے۔ وہ چپ چاپ بیٹھی رہتی ہے اور اپنی حفاظت کا حق تو ہر جاندار کو حاصل ہے، چاہے وہ عورت ہو یا بلی یا پھر...... کوئی اور جانور۔ اور تمہاری یہ بات بالکل غلط ہے کہ بلی اپنے مالک کی آنکھیں نکال لیتی ہے۔" تائید کے ساتھ ساتھ اس کے افکار کی نفی بھی ضروری تھی۔

"نہ مانو بھئی، میں نے تو جو تشبیہ دی ہے اس پر دل و جان سے قائل ہوں کہ عورت اور بلی میں کوئی فرق نہیں ہے۔"

"اگر تم ایسا سمجھتے ہو تو......" سدرہ نے ایک لمحہ توقف کیا۔ کبھی کبھار شامی کو چڑانے میں اور اس کے ساتھ کسی لاحاصل سی بحث کرنے میں اسے بڑا مزہ آتا تھا۔

"عورت تو تمہاری ماں بھی ہے اور...... تمہاری بہن بھی ایک عورت ہی ہے نا۔"

"بس...... بس ماں بیٹے کا رشتہ یا بہن بھائی کا ناتا بلی یا بلے کے زُمرے میں نہیں آتا۔" سدرہ اسے چڑانے میں کامیاب ہو ہی جاتی تھی۔

"چلو، ان رشتوں سے ہٹ کر دیکھو، تب تو وہ عورت ہی ہے نا۔" سدرہ اسے قائل کرنے کی کوشش کرتی۔

"تم جو مرضی کہتی رہو۔" اندر سے وہ شاید قائل ہو جاتا ہوگا مگر ہارنا مرد کی سرشت میں نہیں ہے۔ "میں اپنی بات پر قائم ہوں۔"

"اور، مردوں کو تم کس جانور سے تشبیہ دو گے۔"

وہ اسے زچ کرنے کا ایک اور موقع ڈھونڈتی۔
''ہا...... ہا...... ہا بھئی جو میں نے کہنا تھا کہہ دیا اب یہ تمہارا کام ہے۔ دیکھتے ہیں تم کس جانور سے

ملاتی ہو ہم مردوں کو۔'' وہ قہقہہ لگا کر کہتا۔
''میں تو ہرگز ہرگز بھی کسی انسان کو جانور سے ملانے کے حق میں نہیں ہوں۔'' وہ بحث سمیٹنے کی کوشش

کرتی۔ یہ بحث مباحثے تب کی باتیں ہیں جب ان کے تعلقات بہت اچھے ہوا کرتے تھے مگر اب......

☆......☆......☆

یونیورسٹی کی آزاد دُنیا میں دل بھی آزاد ہونے کو ہمکتا ہے۔ اسی آزادی کی چاہ میں سدرہ کا دل ملک احتشام کا اسیر ہوگیا۔ گریس فل سا شامی سدرہ سے ایک سال سینئر تھا مگر ڈیپارٹمنٹ تو ایک ہی تھا۔ سو کہیں نا کہیں ٹاکرا تو ہو ہی جاتا تھا۔ سدرہ کا چپکے چپکے اسے دیکھنا ملک احتشام کو بھی نظر آگیا اور وہ موہنی سی صورت ملک احتشام کے دل میں بھی اُتر گئی۔ یونیورسٹی کی فضا تو ویسے ہی بڑی رنگین اور رومانوی ہوتی ہے۔ ایسی سازگار فضا میں محبتوں کو پروان چڑھتے دیر نہیں لگتی۔ کچھ چھپاتے، کچھ بتاتے ان کی محبت کی خوشبو چار سو پھیلنے لگی۔ مگر محبت کے متوالوں کو اس بات کی پروا کب تھی۔ وہ تو بس اپنی دنیا میں گم تھے۔

سال کیسے گزرا پتا ہی نہیں چلا۔ بچھڑنے کی گھڑی آئی تو انہیں ہوش آیا۔

''فکر مت کرو سدرہ، میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ بہت جلد اپنے گھر والوں کو تمہارے ہاں بھیجوں گا۔'' شامی نے اسے تسلی دی۔

وہ سچ کہتا تھا، وہ واقعی سدرہ کے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ اپنے گھر والوں کو تو سدرہ کے ہاں نہ بھیج سکا۔ البتہ اسے یونیورسٹی ہی سے جاب کی آفر آئی تو اس نے اسے قبول کرنے میں ایک منٹ کی دیر نہ لگائی۔ حالانکہ اس کے مستقبل کے ارادوں میں لیکچرر شپ کہیں بھی موجود نہیں تھی مگر محبت سب کچھ کروا لیتی ہے۔ ان کی محبت کا سفر ایک مرتبہ پھر شروع ہوگیا۔ اس سفر میں اب سدرہ کا ایک ہی مطالبہ تھا۔

''شامی اپنے گھر والوں کو جلد از جلد ہمارے ہاں بھیجو۔''

وہ وقت سے خوفزدہ تھی جو بہت تیزی سے گزر رہا تھا۔ بلکہ سدرہ کو یہ ڈر بھی ستا رہا تھا کہ تعلیم مکمل ہوتے ہی اس کے والدین نے آئے ہوئے رشتوں میں سے کسی ایک کو منتخب کر کے اس کو وداع کرنے میں دیر نہیں لگانی۔ وہ تو پہلے ہی اسے یونیورسٹی بھیجنے کے خلاف تھے اور صرف اس کی ضد کی وجہ سے اسے پڑھنے کی اجازت دی تھی۔ حالانکہ سدرہ کی دونوں بڑی بہنوں نے یونیورسٹی تو کیا کالج کی شکل بھی نہیں دیکھی تھی۔ کچھ تو انہیں پڑھنے کا شوق نہیں تھا اور کچھ والدین بھی زیادہ پڑھانے میں دلچسپی نہ رکھتے تھے۔ یہ تو سدرہ ہی تھی جو علم کی تلاش میں یونیورسٹی تک آ گئی تھی۔ دونوں بھائی چھوٹے تھے اور سدرہ کی دیکھا دیکھی وہ بھی پڑھنے کا شوق رکھتے تھے۔

دوسری طرف شامی تین بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا۔ اپنی محنت اور ذہانت کے بل بوتے پر وہ آج یونیورسٹی کے شعبہ تدریس کا حصہ تھا اور آگے اس کا ارادہ سی ایس ایس کرنے کا تھا۔ مڈل کلاس سے تعلق رکھنے والوں کے لیے مقابلے کا امتحان پاس کرنا شاید زندگی کی سب سے بڑی کامیابی ہوتی ہے۔ اور وہ اس کامیابی کے لیے پُرامید بھی تھا۔

''شامی آخر کب تک تم اپنے گھر والوں کو بھیجو گے۔'' فائنل سمسٹر کی ڈیٹ شیٹ آئی تو وہ شامی کے پیچھے ہی پڑ گئی۔ شامی بھی شاید روز روز کے بہانوں سے اُکتا گیا تھا اسی لیے اس نے صاف صاف بات کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

''میرے گھر والے راضی نہیں ہو رہے ہیں سدرہ۔'' اس نے بالآخر تھکے تھکے لہجے میں بم پھوڑا۔ ''امی میری شادی اپنی بھتیجی سے کرنا چاہ رہی ہیں۔ لیکن تم فکر مت کرو۔ میں انہیں راضی کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اور انہیں راضی ہونا ہی پڑے گا۔'' اس نے قطعیت سے کہا۔

اور یہی پُریقین لہجہ سدرہ کے دل میں اُمیدوں

کے پھول کھلا رہا تھا۔
پھر پتا نہیں شامی نے اپنی امی کو کیسے راضی کیا مگر فائنل ایگزام کے بعد وہ رشتہ لینے سدرہ کے گھر آ ہی گئیں۔
ان کا طمطراق اور رشتہ مانگنے کا انداز دیکھ کر سدرہ کے والدین تو کیا سدرہ بھی بددل ہو گئی۔ ابھی اتنے کروفر سے رشتہ مانگنے آئی ہیں تو شادی کے بعد جو عزت افزائی ہوتی، اس کا اندازہ سدرہ کو اچھی طرح ہو گیا تھا۔ اس کے والدین کو بھی شامی کی ماں بہنوں کا رویہ پسند نہیں آیا تھا لہٰذا ان کا یہاں اپنی بیٹی بیاہنے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ وہ سدرہ کے لیے آئے ہوئے دوسرے رشتوں پر غور کر رہے تھے۔
اس دن شامی کی فرمائش پر سدرہ اس سے ملنے یونیورسٹی گئی۔ وہ سی ایس ایس کی تیاریاں کر رہا تھا۔ وہ سدرہ سے پوچھنا چاہتا تھا کہ اس کے والدین کا کیا ارادہ ہے۔ جواباً سدرہ نے اس کی ماں بہنوں کے رویے کا گلہ کرتے ہوئے اپنے والدین کا ارادہ بھی بتا دیا۔
''دراصل وہ صرف میری خواہش پر تمہارے ہاں رشتہ لے کر گئی تھیں۔'' اس نے صفائی پیش کرتے ہوئے کہا۔ ''میں نے بتایا تو تھا تمہیں کہ وہ میری شادی اپنی بھتیجی سے کرنا چاہ رہی ہیں اور میں نے انہیں جیسے منایا ہے وہ میں ہی جانتا ہوں۔''
سدرہ خاموشی سے سُن رہی تھی۔
''لیکن مجھے یقین ہے تم اپنے حسنِ سلوک اور برداشت سے ان کا دل جیت لو گی۔'' اس نے سدرہ کا ہاتھ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔
''مگر شادی ہو گی تب نا'' سدرہ نے خدشات بھرے لہجے میں کہا۔ ''امی ابو تو بالکل راضی نہیں ہوں گے۔''
''تو انہیں راضی کرو نا۔'' شامی نے جلدی سے کہا۔
''دیکھو میں نے بھی تو اپنے گھر والوں کو راضی کیا ہے نا۔ اب اپنے والدین کو راضی کرنا تمہارا کام ہے۔'' اس نے چند لمحے توقف کیا پھر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔
''مگر یہ بات یاد رکھنا کہ تمہارے بغیر میں زندہ تو رہوں گا مگر...... جی نہیں پاؤں گا۔''

☆......☆......☆

اور وہ بے وقوف عورت، ازل کی احمق عورت پھر سے ایک مرد کی باتوں کے جال میں پھنس گئی۔ اس نے بہن کے ذریعے ماں کو کہلوا بھیجا۔
''شامی کے رشتے پر غور کر لیں۔ میں وہیں شادی کرنا چاہتی ہوں۔''
اور بیٹیاں جب اپنے منہ سے کسی مرد سے شادی کی خواہش کا اظہار کریں تو والدین کو اپنی عزت بچانے کے لیے خاموش ہونا ہی پڑتا ہے۔ مگر خاموش ہونے سے پہلے ماں نے بیٹی کو سمجھانے کی بہت کوشش کی۔ اسے آنے والی زندگی کے نشیب و فراز سے آگاہ کیا۔ مگر وہ سمجھنے کی کوشش کرتی تو ضرور سمجھ جاتی۔ مگر اس کی سمجھداری پر تو شامی نے اپنی لچھے دار باتوں سے پٹی باندھی ہوئی تھی پھر وہ کیسے سمجھتی۔
سو نہ چاہتے ہوئے بھی والدین نے دل پر پتھر رکھ کر اپنی لاڈلی کو شامی کے ہمراہ رخصت کر دیا۔

☆......☆......☆

سسرال میں اس کا استقبال گو اس کی توقعات کے مطابق تو نہ تھا مگر شاید اس کی ساس نندوں نے دنیا دکھاوے کے لیے سرد مزاجی سے سہی مگر سب رسمیں نبھائیں۔ مگر اکیلے میں اسے یہ بات اچھی طرح باور کرا دی کہ وہ ایک ناپسندیدہ بہو کے طور پر گھر میں آئی ہے۔ سدرہ کو ان کے رویوں سے دُکھ تو بہت ہوا مگر شامی نے اس کے دل پر اپنی محبت کے پھائے کچھ اس طرح رکھے کہ اسے اپنا آپ ہواؤں میں اُڑتا محسوس ہو رہا تھا۔ مگر وہ اس بات سے بے خبر تھی کہ ہوا میں اندھا دھند اڑنے والے ہمیشہ منہ کے

بل زمین پر گرتے ہیں۔

ولیمے کے دوسرے ہی دن اس کی ساس نے باورچی خانے کا چارج اسے سونپ دیا۔ مگر اصل اختیار سارا اپنے پاس رکھا۔ کیا کھانا ہے، کیا پکانا ہے، کتنا راشن آنا ہے، کتنا بچانا ہے۔ کس کے لیے کیا پکنا ہے اور کیا نہیں پکنا، یہ سب فیصلے ساس صاحبہ کرتی تھیں۔ سدرہ کو بہت جلد اندازہ ہوگیا کہ اس کی آئندہ زندگی کیسے گزرے گی۔ لیکن اسے یقین تھا کہ شامی کی محبتوں کے سہارے وہ بڑی اچھی زندگی گزارے گی۔ وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ کبھی کبھار محبتوں کے سہارے بھی بڑے بودے ہوجاتے ہیں۔

شادی کا پہلا سال تو واقعی ہنڈولوں میں جھولتا گزرا تھا۔ اسی دوران اللہ پاک نے اسے زندگی کی سب سے بڑی خوش خبری سے بھی نوازا تھا۔ شامی نے تو اسے گویا ہتھیلی کا چھالا بنا کر رکھا۔ اس کی صحت اور خوراک کا خیال رکھنا گویا اس پر فرض ہوگیا تھا۔ ماں بولتی رہتی۔

''ارے ہم نے بھی بچے پیدا کیے ہیں مگر ایسے نخرے تو ہمارے کسی نے نہ اٹھائے۔'' مگر وہ دونوں سنی ان سنی کردیتے۔ جب شامی اس کے ساتھ تھا تو اسے کسی کی کیا پروا ہوتی۔ کبھی اکٹھے ڈاکٹر کے پاس چیک اپ کے لیے جایا جارہا ہے تو کبھی بچے کے لیے شاپنگ کی جارہی ہے۔

ننھی حاجرہ دنیا میں آئی تو شامی نے تو بہت خوشیاں منائیں مگر ماں کا منہ بن گیا۔

''اے لو، یہ کیا...... ہمارے خاندان میں تو کئی پشتوں سے بیٹا پیدا ہوتا آرہا ہے۔'' انہوں نے پوتی کی آمد کا سنتے ہی پہلا تبصرہ کیا۔ ''اگر کی ہوتی نا میری بھتیجی سے شادی پھر دیکھتی کیسے نہ بیٹا پیدا ہوتا۔'' نعوذ اللہ جیسے بیٹے پیدا کرنے کا اختیار ان کی بھتیجی کو ہو۔

ننھی حاجرہ ماں باپ دونوں کی آنکھوں کا تارا تھی۔ اور یہ پیار دادی کو ہضم نہیں ہورہا تھا۔

''بیٹی پیدا کی ہے مگر نخرے ایسے ہیں جیسے بیٹے کی ماں بنی ہو۔ اور باپ کو دیکھو پرائی چیز کے پیچھے باؤلا ہوا جارہا ہے۔'' وہ اپنی بیٹیوں کے آگے رونے روتیں۔

☆......☆......☆

وقت کچھ اور آگے بڑھا۔ حاجرہ کے پیچھے مریم اور اس کے بعد زینب آن وارد ہوئی تو ماں کے ساتھ ساتھ بیٹے کا موڈ بھی خراب ہونے لگا۔ چھوٹی چھوٹی جھڑپیں اب لڑائی کی صورت اختیار کرتی جارہی تھیں۔

شامی کے ذہن و دل سے محبتوں کا خمار اترا تو ماں کی پڑھائی ہوئی پٹیوں نے اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا۔

''میری بھتیجی سے شادی کی ہوتی تو آج بیٹیوں کی جگہ بیٹوں کی بہار ہوتی۔'' وہ وقتاً فوقتاً یہ جملہ شامی کے کانوں میں انڈیلتیں۔

''خیر اب بھی وقت نہیں گزرا۔'' وہ ٹھنڈی سانس بھر کر شامی کو اکسانے والے انداز میں کہتیں۔

''بشریٰ ابھی تک تیرے نام پر بیٹھی ہے۔ اس کرموں جلی نے تو قسم کھائی ہوئی ہے کہ تیرے علاوہ کہیں شادی نہیں کرنی اور ساری زندگی تیرے نام پر بیٹھی رہنا ہے۔'' اب بیچ کی بات کا تو انہیں نہیں پتا تھا کہ اس کی کم صورتی اور بداخلاقی اس کے رشتے میں بڑی رکاوٹ ہے۔ انہیں تو بس ماں جائے کی بیٹی نظر آتی تھی۔

''تُو راضی ہو تو میں اب بھی رشتہ لے کر جاسکتی ہوں۔ دیکھنا اگلے ہی سال بیٹے کا منہ دیکھے گا۔'' وہ اسے سبز باغ دکھاتیں۔

سدرہ کا اعتماد اب رخصت ہونے لگا تھا۔ وہ شامی کے رویے سے ہولنے لگی تھی۔ بیٹیوں کی پیدائش نے اس کی پوزیشن کمزور کردی تھی۔ ایک بھی بیٹا ہوجاتا تو وہ مضبوط ہوجاتی۔ وہ اب شعوری طور پر کوشش کرتی تھی کہ شامی یا اس کی ماں کو کوئی شکایت نہ ہو۔ جبکہ شامی اور اس کی ماں کی کوشش یہی ہوتی

تھی کہ اس کی کسی نہ کسی غلطی پر محاذ کھڑا کیے رکھیں۔
"تمہاری محبت شادی کے نو سالوں میں ہی ختم ہوگئی ہے۔"
وہ تصور میں شامی کو مخاطب کرتی۔ کئی مرتبہ کہنے کی کوشش بھی کی مگر گھر میں اکثر و بیشتر اس کے منہ کے زاویے بگڑے ہی رہتے تھے۔ ایک مرتبہ کہنے کی ہمت بھی کرلی۔ تب وہ استہزائیہ انداز میں ہنس پڑا تھا، کہنے لگا۔
"زندگی صرف محبت کا نام تو نہیں ہے سدرہ بیگم! ہمیں محبت کے علاوہ اور بھی بہت کچھ درکار ہوتا ہے۔"
"سب...... سب کچھ تو ہے ہمارے پاس؟"
سدرہ نے جلدی سے کہا مبادا اس کے منہ کے زاویے پھر بگڑ جائیں اور بات ادھوری رہ جائے۔
"سب کچھ...... ہونہہ!" اس نے تاسف سے سرہلایا۔ "بیٹا...... بیٹا ہے ہمارے پاس؟"
"بیٹا بھی ہوجائے گا، ابھی کون سی ہماری عمر نکلی جارہی ہے۔"
"کیا تم گارنٹی دیتی ہو کہ اس بار بیٹا ہوگا۔"
شامی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔
"دعا تو کی جاسکتی ہے نا۔"
"ہونہہ دعا۔"
"تو اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ دوسری بیوی سے بیٹا ہی پیدا ہوگا۔" اس کا انداز کچھ جارحانہ سا ہوگیا تھا۔ اپنے حق کو استعمال تو کرنا تھا نا۔ سُن گن تو اسے بھی تھی کہ اماں احتشام کی دوسری شادی کے لیے کمربستہ ہیں۔
"تین بیٹیاں پیدا کرنے کے بعد چوتھی بیٹی کی اُمید تو رکھی جاسکتی ہے بیٹے کی نہیں۔" اس نے کچھ لمحے توقف کیا۔ "اور سدرہ بیگم ہمارے خاندان کی عورتوں کے ہاں پہلا بیٹا ہی ہوا کرتا ہے۔" شامی کی باتوں سے کہیں نہیں لگ رہا تھا کہ وہ سی ایس ایس گریڈ انیس کا آفیسر ہے۔ وہ سراسر اس وقت کوئی جاہل انسان نظر آرہا تھا۔ اور اس سے مزید بحث کرنے کا سدرہ کا کوئی ارادہ نہ تھا۔

☆......☆......☆

اور بالآخر احتشام نے ماں کے دکھائے ہوئے سبز باغوں سے استفادہ کرنے کا ارادہ کر ہی لیا۔ احتشام جب تک راضی نہ ہوا تھا۔ سدرہ کو کوئی پروانہ تھی اور اب جبکہ وہ دوسری شادی کے لیے تیار ہوگیا تو سدرہ شیرنی بن گئی۔
"میں اپنی جگہ کسی اور کو نہیں لینے دوں گی۔" وہ تن کر ماں بیٹے کے سامنے کھڑی ہوگئی۔
"ہاں تو ظاہر ہے تمہارا جو مقام اس گھر میں ہے، وہی رہے گا۔" احتشام نے لاپروائی سے کہا۔
"میرا اس گھر میں مقام بیوی کی حیثیت سے ہے اور وہ مقام میں تمہیں کسی اور کو دینے نہیں دوں گی۔"
"تمہارا اس گھر میں مقام میری بیٹیوں کی ماں کی حیثیت سے ہے۔ میرے بیٹے کی ماں ہوتیں تو تمہارا مقام ہی کچھ اور ہوتا۔" احتشام کے لہجے میں رعونت تھی۔ وہ محبت لٹانے والا شامی تو جانے کہاں تھا۔
"بیٹے کی ماں بھی بن جاؤں گی۔ تم کچھ صبر تو کرو۔" وہ اسے دوسری شادی کرنے سے ہر طریقے سے باز رکھنا چاہتی تھی۔
"بیٹے کی خواہش میں، میں مزید بیٹیاں نہیں پیدا کرنا چاہتا۔"
اماں خاموشی سے دونوں میاں بیوی کی بحث سُن رہی تھی۔ اس نے بیٹے کی اتنی اچھی برین واشنگ کردی تھی کہ اسے اب کچھ بولنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔
"بہرحال میں تمہیں دوسری شادی کی اجازت ہرگز نہیں دوں گی۔" وہ تن من کر بولی۔ احتشام ہنس پڑا جیسے اس نے کوئی لطیفہ سنادیا ہو۔
"دوسری شادی کی اجازت میں نے تم سے نہیں

لینی۔ اس کی اجازت تو مجھے میرا مذہب دیتا ہے۔ اور سدرہ بیگم۔'' اس نے توقف کیا۔
''میں نے کہا تھا نا عورت اور بلی میں کوئی فرق نہیں۔ جب تک میں تمہارے ساتھ پیار محبت سے رہا۔ تم آرام سے رہیں اب جبکہ میں تمہاری مرضی کے خلاف لیکن، اپنا حق استعمال کرتے ہوئے دوسری شادی کرنا چاہ رہا ہوں تو تمہارے پنجے باہر آرہے ہیں۔ ہونہہ۔''
''اور، احتشام صاحب میں نے بھی تو یہ کہا تھا کہ اپنی حفاظت کا حق تو ہر جاندار کو ہے چاہے وہ عورت ہو یا بلی۔'' سدرہ نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔
''اور میں اپنے حقوق کی حفاظت کرنا اچھی طرح جانتی ہوں۔ آپ بغیر اجازت کے دوسری شادی کریں گے تو میں کورٹ تک جاؤں گی۔ اور دیکھوں گی کہ آپ دوسری شادی کیسے کرتے ہیں۔''
''کورٹ تک جانے کی کیا ضرورت ہے۔ میں ابھی تمہارا فیصلہ کیے دیتا ہوں۔'' کورٹ کی بات آتے ہی احتشام کا گویا پارہ آسمان کو چھونے لگا۔ اسے یوں لگا کہ سدرہ نے اسے گالی دی ہو۔
''میں تمہیں طلاق دیتا ہوں۔'' احتشام کی آنکھوں اور لہجے سے شعلے نکل رہے تھے۔
''میں تمہیں طلاق دیتا ہوں۔'' شیطان کی خوشی کی انتہا نہ تھی۔ وہ ان کے سروں پر ناچ رہا تھا۔
''میں تمہیں طلاق دیتا ہوں۔'' زمین و آسمان سدرہ کی آنکھوں کے آگے گھوم گئے۔ آناً فاناً ہی کہانی ختم ہوگئی۔
کیا یہی انت ہے عورت کا کہ مرد تین لفظوں میں کہانی ختم کردے۔
کیا یہی عزت ہے عورت کی کہ جب جی چاہا سر کا تاج بنالیا جائے اور جب جی چاہا پیروں میں مسل دیا جائے۔
کیا یہی محبت ہے عورت سے کہ اچھی لگے تو سینے سے لگالے اور بُری لگے تو دھتکار دے۔
''آپ سچ کہتے تھے احتشام صاحب کہ عورت اور بلی میں کوئی فرق نہیں ہے۔''

☆......☆......☆

یہ اگلی صبح کی بات ہے جب وہ اپنی اور بچیوں کی ضروری اشیا کا سامان لے کر اس گھر کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر جارہی تھی۔ وہ ساری رات اپنی بچیوں کو بانہوں میں سمیٹ کر اپنی اور ان بچیوں کی قسمت کا ماتم کرتی رہی تھی۔ رات کے اس پہر وہ کہاں جاتی۔ لیکن اسے جانا تو تھا ہی نا۔ سو صبح ہوتے ہی وہ جانے کو تیار تھی۔ ابھی تو والدین کے گھر جانا تھا پھر حالات کو دیکھتے ہوئے ہی کوئی فیصلہ کرنا تھا کہ مستقبل میں کیا کرنا ہے۔
وہ دونوں ماں بیٹے لاؤنج میں بیٹھے چائے پی رہے تھے جب سدرہ بچیوں کو لے کر کمرے سے باہر نکلی تھی۔
''اور آج میں یہ کہہ رہی ہوں کہ مرد اور بلے میں بھی کوئی فرق نہیں ہوتا۔'' وہ بڑے رسان سے کہہ رہی تھی۔
''بلی کو جب تک پیار سے سہلاتے رہو وہ آپ کو کچھ نہیں کہے گی۔ اسی طرح بلے کو بھی جب تک پیار سے پچکارتے رہو۔ وہ آرام سے بیٹھا رہے گا۔ لیکن ...... بلی اور بلے میں ایک فرق ضرور ہوتا ہے۔'' کچھ دیر رُک کر اس نے دونوں ماں بیٹے کو دیکھا۔
''بلی اپنے بچوں کو اپنے سینے سے لگا کر رکھتی ہے جبکہ بلا...... اپنے بچوں کو کھانے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ اور احتشام صاحب، آپ وہ بلے ہیں جس نے اپنی بچیوں کا مستقبل کھالیا ہے۔
اور وہ گھر سے ہی نہیں احتشام کی زندگی سے بھی نکل گئی۔
احتشام ابھی تک ورطۂ حیرت میں تھا کہ وہ اسے کیا کہہ گئی ہے اور شاید ساری زندگی اسے عالم حیرت میں ہی رہنا تھا۔

☆☆......☆☆

افسانہ

محبت

محبت کی ایک ان دیکھی آگ میں میرا وجود جل رہا تھا۔ بہت دن گزر گئے۔ میں نے بہت بار اُس سے بات کی۔ وہ مختصر سا جواب دیتا۔ کبھی کبھی میں کوئی ایسی بات کہہ دیتی کہ وہ صرف پل بھر کے لیے نظریں اُٹھا کر مجھے دیکھتا، پھر نظریں جھکا لیتا۔ پھر میں نے اُسے خط لکھنے کا فیصلہ کیا......

محبت سے پیوستہ، ایک تسکین آفرین افسانہ

"لوگ کہتے ہیں کہ محبت دانت کے درد کی طرح ہوتی ہے۔" دانت کے درد میں پورا وجود درد بن جاتا ہے۔ اُس درد کے علاوہ کوئی احساس باقی نہیں رہتا۔ مگر جب درد کا آرام آجاتا ہے تو یوں لگتا ہے جیسے درد کبھی ہوا ہی نہیں تھا۔ اسی طرح جب محبت ہوتی ہے تو اس احساس کے علاوہ کچھ بھی یاد نہیں رہتا۔ مگر جب محبت دم توڑ دیتی ہے یا نفرت میں بدل جاتی ہے تو یوں لگتا ہے جیسے محبت کبھی ہوئی ہی نہیں تھی مگر......

میں کہتی ہوں۔ "مرد" کی محبت دانت کے درد کی طرح ہوتی ہے۔ مرد جب محبت کرتا ہے تو شدت سے کرتا ہے اور جب اُس کی محبت ختم ہوتی ہے تو اُسے سب کچھ بھول جاتا ہے یوں لگتا ہے جیسے اُس نے کبھی محبت کی ہی نہیں تھی۔

"عورت" کی محبت سر درد کی طرح ہوتی ہے۔ سر کا درد جب ہوتا ہے تو سارا وجود درد بن جاتا ہے۔ لمحہ لمحہ یہ درد بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ سارا جسم اِس درد سے بے سکون ہوجاتا ہے۔ اور جب سر کا درد ٹھیک ہوجاتا ہے تو بھی بہت دیر تک سارا وجود مضمحل رہتا ہے۔ سر کا درد ختم ہونے کے بہت دیر تک اپنے ہونے کا احساس دلاتا رہتا ہے۔ اسی طرح جب کوئی عورت محبت کرتی ہے تو جسم و جان کی شدت سے کرتی ہے۔

محبت کے علاوہ اُسے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ جب اُس کی محبت اُس کے ساتھ بے وفائی بھی کرے یا نفرت میں بھی بدل جائے تو بھی بہت عرصہ تک محبت کا احساس عورت کو نہیں بھولتا۔ وہ اِسی کیفیت میں زندگی گزار دیتی ہے۔

میں نے بھی محبت کی تھی۔ اُس وقت میں سولہ سال کی تھی۔ سولہ سال کی عمر بہت خوبصورت ہوتی ہے۔ یہ وہ عمر ہوتی ہے جب ہر چیز نئی اور دلکش لگتی ہے بارش میں بھیگنا اور بھیگا ہوا دوپٹا نچوڑنا بہت دلفریب لگتا ہے۔ جب پھول، ہوا، راستے اور منظر بہت بھلے لگتے ہیں۔ کچی عمر کی محبت پہلی بارش کی طرح ہوتی ہے جو جسم و جاں کو بھگو دیتی ہے۔

اس کا نام 'طیب' تھا۔ ہمارے محلے کی مسجد کے امام صاحب ملتان سے آئے ہوئے تھے اور مسجد میں ہی رہتے تھے۔ اُن کی بیوی اور بچے ملتان میں ہی تھے۔ محلے کے مختلف گھروں سے اُن کے لیے کھانا جاتا تھا۔ محلے کے بچوں کو وہ قرآن پاک بھی پڑھایا کرتے تھے۔ میں اور میرا چھوٹا بھائی بھی اُن سے قرآن کا سبق لیا کرتے تھے۔ ہمیں وہ ہمارے گھر آکر پڑھاتے تھے۔ میرے ابا اُن کا بہت احترام کرتے تھے پھر یوں ہوا کہ ابا کے حکم کے مطابق روزانہ رات کا کھانا اُن کے لیے ہمارے گھر سے جانے لگا۔

مغرب کی نماز پڑھ کر وہ کسی بچے کو ہمارے گھر کھانا لینے کے لیے بھیج دیتے تھے۔ امی کھانا ٹرے میں لگا کر مجھے پکڑا دیتیں اور میں دروازے پر جاکر کھانا بچے کو دے دیتی۔

آہستہ آہستہ یہ مکمل میری ذمہ داری بن گئی کہ میں روزاہ کھانا ٹرے میں رکھ کر بچے کے ہاتھ اُن کو بھجوا دیتی۔

☆......☆......☆

ایک شام مغرب کے بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے کھانے کی ٹرے اٹھائی اور دروازے پر آگئی۔ دروازہ کھولا تو سامنے ایک جوان لڑکا کھڑا تھا۔ نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ نظریں جھکائے جھکائے اُس نے کہا۔

"اباجان نے کھانا منگوایا ہے۔"

"تم کون ہو؟" میں نے پوچھا۔

"جی ...... میں مولوی عبدالعزیز صاحب کا بیٹا

ہوں اور ملتان سے آیا ہوں۔'' وہ ویسے ہی نظریں جھکائے جھکائے بول رہا تھا۔ اُس نے ایک بار بھی نظر اُٹھا کر میری طرف نہیں دیکھا۔ میں نے ٹرے اُسے پکڑائی وہ چلا گیا۔ میں کتنی ہی دیر وہاں کھڑی رہی۔

وہ رات پہلی رات تھی جو میں نے جاگ کر گزاری۔ سرخ وسفید رنگت والا وہ خوبصورت لڑکا میرے 'رت جگے' کی وجہ تھا۔ وہ بہت خوبصورت تھا۔ مجھے پہلی نظر میں اُس سے محبت ہوگئی۔ اگلے دن میں نے صبح سے ہی انتظار شروع کر دیا۔ شام کو دروازے پر دستک سنتے ہی پہنچ گئی۔ وہ سامنے کھڑا تھا۔

''تمہارا نام کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''طیب نام ہے میرا؟'' اُس نے جواب دیا۔

''پڑھتے ہو؟''

''جی۔ میٹرک کر کے یہاں آیا ہوں۔ اب مزید تعلیم حاصل کروں گا۔'' اُس نے بتایا انداز وہی تھا نظریں نیچے کیے ہوئے۔ مجھے غصہ آنے لگا۔ آخر یہ میری طرف دیکھتا کیوں نہیں؟''

''جی، کھانا دے دیں۔'' اُس نے کہا۔

''یہ لو۔'' میں نے اُسے ٹرے پکڑائی۔ وہ چلا گیا۔

☆......☆......☆

محبت کی ایک اَن دیکھی آگ میں میرا وجود جل رہا تھا۔ بہت دن گزر گئے۔ میں نے بہت بار اُس سے بات کی۔ وہ مختصر سا جواب دیتا۔ کبھی کبھی میں کوئی ایسی بات کہہ دیتی کہ وہ صرف پل بھر کے لیے نظریں اُٹھا کر مجھے دیکھتا، پھر نظریں جھکا لیتا۔

پھر میں نے اُسے خط لکھنے کا فیصلہ کیا۔ میں دسویں جماعت میں پڑھ رہی تھی اگرچہ میں نے پہلی بار خط لکھا تھا مگر ایسے محبت بھرے خط دیکھے ضرور تھے جو میری کلاس فیلو لڑکیاں اپنے کزنز یا اپنے محبوب کو چوری چھپے لکھا کرتی تھیں۔

میں نے کاغذ پر اپنا دل نکال کر رکھ دیا۔ اپنی محبت کا اقرار، اُس کا گریز اور بے نیازی کی شکایت بھی لکھی، اور اُسے پانے کی خواہش کا اظہار بھی کیا۔ ٹی وی ڈراموں اور رسائل میں سے دیکھا اور پڑھا بھی تھا کہ محبوب کو رومال کا تحفہ دیا جاتا ہے۔ میں نے سفید رنگ کے خوبصورت سے رومال پر سرخ دھاگے سے اُس کے اور اپنے نام کے پہلے حروف کاڑھے۔ موٹا سا ایک دل بنایا اور اُس میں ایک تیر پیوست کر دیا۔ خط کو رومال میں رکھا اور شام کا انتظار کرنے لگی۔

شام کو کھانا ٹرے میں رکھا۔ رومال کو بہت احتیاط سے روٹی والے رومال میں لپیٹ دیا۔ ٹرے اس کی طرف بڑھاتے ہوئے میں نے کہا۔

''طیب! اِس رومال میں تمہارے لیے ایک امانت ہے۔ وہ دیکھ لینا اور کل مجھے اُس بات کا جواب ضرور دینا، جو میں نے پوچھی ہے۔ اُس نے ایک نظر میری طرف دیکھا اور ٹرے پکڑ کر پلٹ گیا۔ اُس نے ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا۔ مگر مجھے یقین تھا کہ محبت کا جواب صرف محبت ہی ہوسکتا ہے۔ اگر میں نے لڑکی ہو کر پہل کی ہے تو وہ تو مرد ہے۔ پیچھے ہٹ ہی نہیں سکتا۔ میں انتظار کرنے لگی۔ مگر میرا انتظار......انتظار ہی رہا۔

☆......☆......☆

اگلی شام مسجد سے کھانا لینے کوئی نہیں آیا اور اُس دن مولوی صاحب بھی ہمیں پڑھانے نہیں آئے۔ اگرچہ میں قرآن پاک پڑھ چکی تھی پھر بھی وہ روزانہ مجھ سے سنتے تھے۔

ایک دن، دو دن اور پھر پانچ دن گزر گئے۔

طیب اور مولوی صاحب دونوں کا کوئی پتہ نہیں تھا۔ چھٹے روز مولوی صاحب آئے تو امی نے پوچھا۔

''خیریت تھی؟ اتنے دن کہاں رہے؟'' تو انہوں نے بتایا کہ ''میں اپنے بیٹے طیب کو ملتان چھوڑنے گیا ہوا تھا۔ وہ لاہور آیا تو کالج میں داخلہ لینے کے لیے تھا، مگر اچانک واپس جانے کی ضد کرنے لگا، میں مجبوراً اُسے چھوڑ آیا ہوں۔ وہیں پڑھے گا اور ساتھ کوئی کام بھی سیکھ لے گا۔''

مجھ پر تو جیسے بجلی گر پڑی۔ اُس رات مجھے پھونک کر بخار چڑھا۔ اگلے ماہ میرے میٹرک کے سالانہ امتحانات ہونے والے تھے۔ میں اس قدر بیمار ہوگئی کہ مجھے ہاسپٹل داخل کرانا پڑا۔ گھر والے پریشان تھے اور میرا دکھ ہی نہ جاتا تھا۔ میری پہلی پہلی محبت کی اتنی ناقدری؟ میرے دل کی کلی نے کھلنے سے پہلے ہی دم توڑ دیا۔

وہ جو بزدلوں کی طرح بھاگ گیا تھا۔ میرے دل سے نکلتا ہی نہیں تھا۔ جیسے تیسے میں نے امتحان دیا اور بمشکل پاس ہوئی ایک عام سے کالج میں فرسٹ ایئر میں داخلہ لے لیا۔

وقت کچھ آگے بڑھا دل کو رفتہ رفتہ قرار آنے لگا اور پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ میں طیب کو بھول گئی۔ زندگی کے آنے والے رنگ بہت حسین تھے۔ اب تو کبھی ذہن میں خیال بھی آتا تو اپنی بے وقوفی پر ہنسی آتی تھی۔

☆......☆......☆

بی اے کرتے ہی میری شادی ہوگئی اور میں بیاہ کر کراچی آگئی۔ نیا اور روشنیوں سے بھرا شہر اور بے حد محبت کرنے والا ہم سفر، اگلے پانچ سال میں میری گود میں دو بچے بھی آگئے۔ زندگی مکمل ہوگئی۔ سال دو سال بعد لاہور کا چکر لگتا۔ فاصلہ اتنا زیادہ تھا کہ جلدی جلدی جانا ناممکن تھا۔ میرے شوہر بہت اچھے اور خیال رکھنے والے تھے۔ دس سال کا عرصہ گزر گیا۔

میرے ابا سخت بیمار ہوگئے۔ انہیں ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔ میں راشد کے سامنے رو پڑی، بیٹیاں کتنی بھی کوش ہوں، سسرال میں مگر اُن کا دل میکے سے بندھا رہتا ہے۔ بچوں کے سالانہ امتحان ہونے والے تھے۔ راشد نے کہا۔

''میں بچوں کو سنبھال لوں گا۔ تم لاہور چلی جاؤ۔'' اور یوں میں اپنے بیمار باپ کی عیادت کو چلی آئی ایک عرصے بعد میکے کی فضاؤں میں سانس لیا تو روح تک سرشار ہوگئی۔

ابا کی حالت سنبھل رہی تھی۔ ہاسپٹل سے گھر شفٹ کر دیا گیا تھا۔ میں دن رات اُن کی خدمت میں لگی رہتی تھی۔ اُن کے دوست احباب، رشتہ دار اور محلے والے اُن کی عیادت کو آ رہے تھے۔

ایک شام امی مغرب کی نماز کے بعد ابا کے پاس بیٹھی تھیں، میں باورچی خانے میں تھی۔ دروازے پر دستک ہوئی۔

''رابعہ۔'' امی نے آواز دی۔

مسجد سے بچہ آیا ہوگا۔ کھانا دے دو۔ میں نے کھانا ٹرے میں رکھا اور دروازے پر آگئی۔ دروازہ کھولا سامنے ایک اجنبی صورت تھی۔ سیاہ داڑھی اور نورانی چہرہ شاید کوئی نیا مولوی آیا ہے؟'' میں نے سوچا۔

''سلمان صاحب گھر پر ہیں؟'' اُس نے بڑی شائستگی سے پوچھا۔

''جی ہاں۔'' میں نے ٹرے پیچھے کر لی۔

''میں اُن کی عیادت کو حاضر ہوا تھا۔''

''آپ آجائیے۔'' میں نے راستہ دیتے ہوئے کہا اور واپس جانے کے لیے مڑی۔

''رابعہ بی بی! میری بات سُن لیں۔'' میں اُس

کے منہ سے اپنا نام سن کر حیران رہ گئی۔
"یہ آپ کی ایک امانت ہے میرے پاس۔"
اُس نے سفید کپڑا سا میری طرف بڑھایا۔ میں نے پکڑ کر دیکھا۔ وہ ایک رومال تھا۔ رومال کا سفید رنگ مٹیالا اور پیلا سا ہو چکا تھا۔ کونے پر سرخ دھاگے سے کاڑھے گئے حرف T اور R نمایاں تھے اور ساتھ ہی تیر والا دل بھی۔

ادراک کے دَر وَا ہوئے تو مجھے یاد آیا وہ طیب تھا۔ مولوی عبدالعزیز صاحب کا بیٹا، میری کچی عمر کی پہلی محبت، جو میری محبت کے اظہار پر شہر ہی چھوڑ کر بھاگ گیا تھا۔ میں نے اُسے دیکھا اُس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں چند لمحے میری طرف دیکھ کر اُس نے نظریں جھکا لیں۔

"رابعہ بی بی! سالوں سے میں نے آپ کی امانت سنبھال کر رکھی تھی۔ آپ کا خط تو میں نے اُسی دن پھاڑ دیا تھا۔" میں گم صم اُسے دیکھتی رہی۔ یہ بھی نہ پوچھ سکی کہ وہ بزدلوں کی طرح کیوں بھاگا تھا؟

"رابعہ بی بی! ہم آپ کے گھر کا نمک کھاتے تھے اور اب بھی کھاتے ہیں محسن سے دغا کرنا کمینے لوگوں کا کام ہے۔ اور......" وہ اتنا کہہ کر ذرا سا رکا۔
"باقی رہی بات دل کی، تو دل پر بھلا کس کو اختیار ہے؟ وہ تو کسی کی مانتا ہی نہیں۔" اُس کا لہجہ ٹوٹ سا گیا اور وہ میرے قریب سے گزر کر ابا کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

میں رومال ہاتھ میں پکڑے وہیں کھڑی رہ گئی۔
لوگ کہتے ہیں محبت دانت کے درد کی طرح ہوتی ہے۔ مگر میں کہتی ہوں صرف مرد کی محبت دانت کے درد کی طرح ہوتی ہے۔ عورت کی محبت تو سر درد کی طرح ہوتی ہے' آپ کیا کہتے ہیں؟'

☆☆......☆☆

خواہشوں، امیدوں اور ہر پل رنگ بدلتی زندگی سے آباد، ناول کی آخری قسط

خلاصه

رفیق احمد اور نفیس احمد دو بھائی ہیں جن کے درمیان بہت محبت اور رکھ رکھاؤ ہے۔ رفیق احمد کے دو بچے عرفان اور زرقون ہیں، جبکہ نفیس احمد کے دو بیٹے احمد، فراز اور ایک بیٹی مریم ہے۔ مریم ایک سلیقہ شعار اور درمیانی صورت وشکل کی کم پڑھی لکھی لڑکی ہے۔ مریم کی منگنی عرفان سے ہوگئی ہے۔ عرفان سے مریم بے انتہا محبت کرتی ہے، جبکہ زرقون، جو بے حد خوب صورت، خوش اخلاق اور زندہ دل لڑکی ہے، یونیورسٹی سے ماسٹر کر رہی ہے۔ اس کا رشتہ اپنا تایازاد فراز کے ساتھ طے ہے۔ فراز اور زرقون ایک دوسرے کو بے حد چاہتے ہیں۔ رفیق احمد کی بیوی فہمیدہ بیگم ایک سلجھی ہوئی خدمت گزار خاتون ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے میکے پر بے حد جان چھڑکتی ہیں۔ میکے میں اُن کی بھاوج رقیہ بیگم بے حد حسین عورت ہیں۔ رقیہ بیگم کو ہمیشہ سے اپنی نند، فہمیدہ بیگم سے حسد ہے کہ وہ کس قدر آسودہ اور پُرتعیش زندگی بسر کرتی ہیں اور اُن کے میاں انہیں کس قدر چاہتے ہیں لیکن وہ اپنا حسد کبھی ظاہر نہیں کرتیں۔ حالات خراب ہونے کے باعث عرفان چند دن رقیہ بیگم کے گھر میں گزارتا ہے، جہاں وہ ثمینہ (جو اُس کی ماموں زاد ہے) کی محبت میں گرفتار ہو جاتا ہے اور مریم سے منگنی توڑ دیتا ہے۔ مریم کو منگنی ٹوٹنے کا گہرا صدمہ ہوتا ہے اور وہ بیمار ہو جاتی ہے۔ ثمینہ سے شادی کے لیے فہمیدہ بیگم، بیٹے کا ساتھ دیتی ہیں جس کی وجہ سے رفیق احمد کے دل میں بیوی کی طرف سے بال آ جاتا ہے۔ فہمیدہ بیگم کو اُمید ہوتی ہے کہ اُن کی بھتیجی آ کر سب کا دل جیت لے گی۔ فطرتاً وہ دل کی نرم ہوتی ہیں، اس لیے انہیں مریم کی تکلیف کا بھی احساس ہوتا ہے اور وہ دل میں عہد کرتی ہیں کہ وہ مریم کے لیے اچھا سا رشتہ خود تلاش کریں گی۔ جہاں آرا بیگم جو نفیس احمد کی بیوی ہیں، مریم کا رشتہ ٹوٹنے کے بعد رفیق احمد اور اُن کے گھر والوں سے سخت ناراض ہو جاتی ہیں۔ ثمینہ اور عرفان کی شادی ہو جاتی ہے۔ عرفان بہت خوش، فہمیدہ بیگم مطمئن اور رفیق احمد اور زرقون اُداس ہوتے ہیں۔ شادی کے دوسرے دن جب زرقون اپنی کزنز کے ساتھ دلہن کو لینے جاتی ہے تو رقیہ بیگم، ثمینہ کو بھیجنے سے انکار کر دیتی ہیں۔ نفیس احمد اس بات کو سُن کر چراغ پا ہو جاتے ہیں۔ فہمیدہ بیگم چاچی زلیخا کے ساتھ ثمینہ کو لینے جاتی ہیں، جہاں اُن کو رقیہ بیگم ایک دوسرے ہی روپ میں ملتی ہیں۔ چاچی زلیخا یہ خبر جہاں آرا بیگم کو سُنانے پہنچ جاتی ہیں۔ جہاں آرا بیگم ایک رات کی دُلہن کے میکے بیٹھ جانے کا سُن کر دل ہی دل میں خوش ہونے کے ساتھ ساتھ حیران رہ جاتی ہیں۔ زرقون کو اپنی مامی کے رویے کا بہت دُکھ ہوتا ہے۔ اُس کے دُکھ پر فراز محبت کے پھائے رکھتا ہے۔ آفتاب احمد جو ایک بہت بڑی کمپنی کے ایم ڈی ہیں، وہ نرگس جو زرقون کی دوست ہے اور جس کا مڈل کلاس سے تعلق ہے، اُس کو بے حد پسند کرنے لگتے ہیں، لیکن نرگس اُن کی پسندیدگی سے ناواقف ہے۔ عرفان اور ثمینہ کی شادی سے رفیق
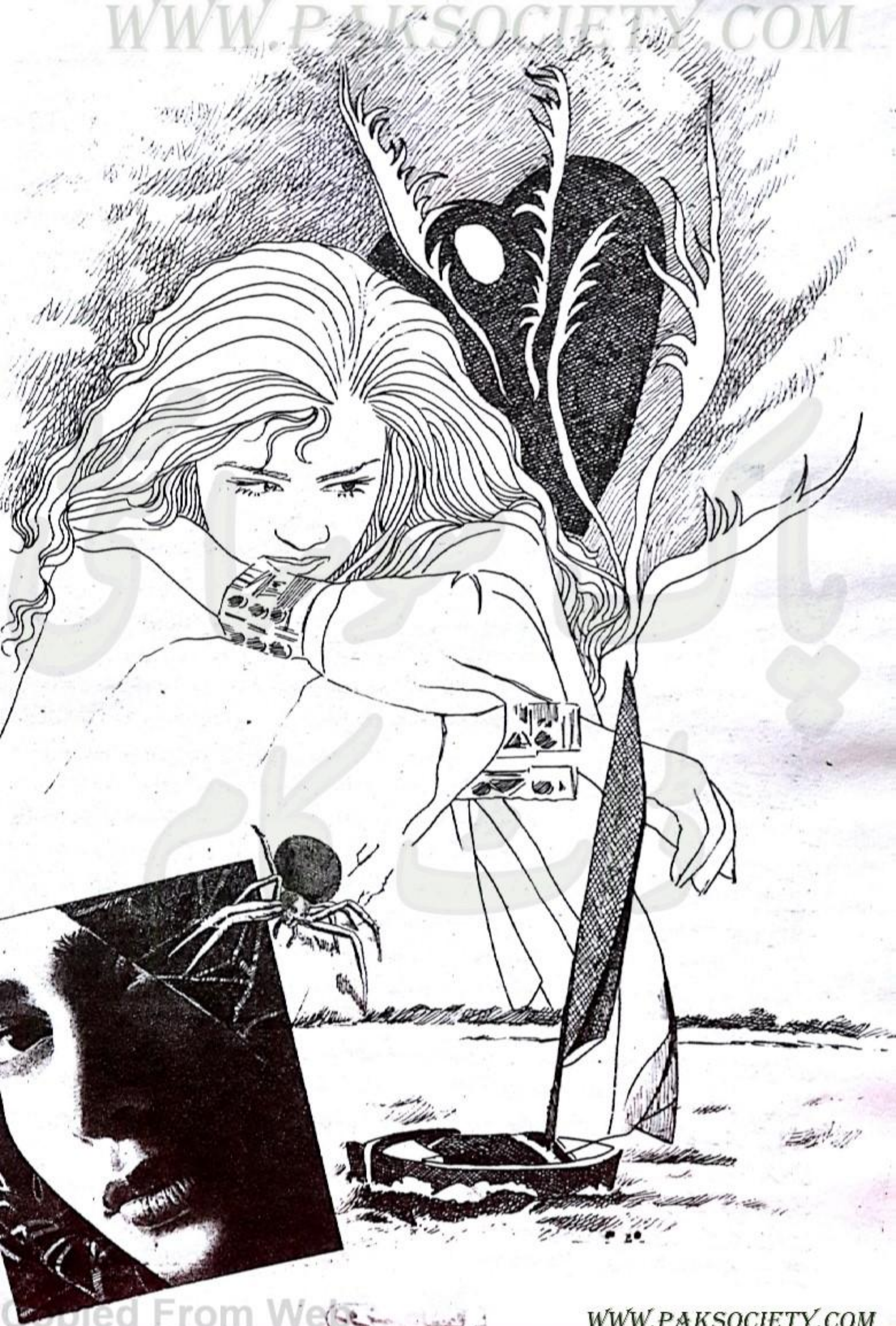
احمد ناخوش ہونے کے باوجود زرقون کو سمجھوتہ کرنے کو کہتے ہیں۔ رفیق احمد ایک رکھ رکھاؤ والے خاندانی آدمی ہیں۔ اُن کے گھر کے کچھ اصول ہیں۔ ثمینہ اُن اُصولوں کی پروا نہیں کرتی۔ جس پر اُن کو اعتراض ہوتا ہے۔ ثمینہ پھوپو کے گھر کو سسرال ہی سمجھتی ہے۔ اور وہ سسرال والوں کو تنگ کرنے کا کوئی موقع نہیں گنواتی۔ مریم روز...... روز کے رد کیے جانے کی وجہ سے چڑچڑی اور بیمار رہنے لگی ہے۔ نفیس احمد اور جہاں آرا بیگم بیٹی کی بدلتی ہوئی کیفیت سے بہت پریشان ہیں۔ نفیس احمد دیکھ رہے ہیں کہ حالات تیزی سے کروٹ بدل رہے ہیں، لہٰذا وہ زرقون کا جلد از جلد فراز کے ساتھ بیاہ کر دینا چاہتے ہیں۔ فراز، زرقون کو بے حد چاہتا ہے۔ رقیہ بیگم چھوٹی چھوٹی باتوں کو بنیاد بنا کر فہمیدہ بیگم سے سوال جواب کرنے کھڑی ہو جاتی ہیں اور ایسے موقعوں پر ثمینہ مظلومیت کی شاندار اداکاری کرتی ہے۔ عرفان، ثمینہ کا دیوانہ ہے۔ اُن دِنوں جب عرفان کے سر پر ثمینہ کی محبت سوار ہوتی ہے، ایک خوب صورت، خوش مزاج لیڈی ڈاکٹر کا عرفان کی دکان پر آنا جانا شروع ہو جاتا ہے۔ ثمینہ نے اپنے رنگ دکھانے شروع کر دیے ہیں۔ اُس کو فراز اور زرقون سے عجیب سا حسد محسوس ہونے لگا ہے۔ جہاں آرا کے مزاج میں رفیق احمد اور اُن کے گھر والوں کے لیے تلخی بڑھ رہی ہے۔ وہ فراز کو اُن کے گھر جانے سے منع کر دیتی ہیں۔ رفیق احمد کی آنکھوں میں کالا پانی اُتر آیا ہے۔ اُن کی آنکھوں کا آپریشن ناکام ہو جاتا ہے۔ عرفان ڈاکٹر تابندہ کو کاروبار کے لیے سونا دے دیتا ہے۔ مریم بہت ساری نفسیاتی اُلجھنوں سے نکل کر آخر زندگی کی طرف قدم بڑھا دیتی ہے۔ زرقون آفتاب کا نمبر حاصل کر کے اُس کو فون کرتی ہے۔ وہ دراصل یہ معلوم کرنا چاہتی ہے کہ آیا وہ نرگس سے محبت کرتا ہے یا نہیں۔ جہاں آرا بیگم نے کھل کر رفیق احمد کے گھرانے، زرقون اور فراز کے رشتے کی مخالفت شروع کر دی ہے۔ اس ساری صورت حال سے فراز بہت پریشان رہنے لگا ہے۔ زرقون سب کچھ سمجھ رہی ہے۔ لیکن اُس کو سوائے اللہ کے آگے گڑگڑانے کے کچھ نظر نہیں آ رہا۔ اِدھر ثمینہ نے ہنگامہ کھڑا کر دیا ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ جلد از جلد الگ ہو جائے۔ مریم کا رشتہ ایک متوسط طبقے سے آتا ہے۔ جہاں آرا بیگم مریم کے رشتے سے بہت خوش ہیں لیکن زرقون اور رفیق احمد کے تمام گھر والوں کے ساتھ اُن کا رویہ بہت سرد ہو جاتا ہے۔ وہ فراز کو رفیق احمد کے گھر جانے سے منع کرتی ہیں۔ فراز بہت پریشان ہے لیکن نفیس احمد اُس کو حالات کو سنبھالنے کی اُمید دلاتے ہیں۔ زرقون جہاں آرا بیگم کے رویہ سے بہت دل برداشتہ ہے۔ ثمینہ ایک بیٹے کو جنم دیتی ہے۔ ثمینہ اور رقیہ بیگم نے سارے خاندان میں بدگمانیاں پھیلا دی ہیں۔ فہمیدہ بیگم کے سارے رشتے دار اُن کی مخالفت کر رہے ہیں، جس کا اُن کو بہت صدمہ ہے۔ عرفان نے ثمینہ کو بہت جلد الگ گھر لینے کی اُمید دلائی ہے۔ مرتضٰی اور شیری کے جھگڑے دن بدن بڑھ رہے ہیں۔ شیری ایک مکمل امریکن عورت کا روپ دھار رہی ہے اور مرتضٰی اس بات سے سخت نالاں ہے۔ وہ چاہتا ہے اللہ اُس کو اولاد دے دے۔ شاید اس طرح شیری کو گھر داری کا شوق پیدا ہو جائے۔ آفتاب اور نرگس کی محبت خوب صورت جذبوں کے ساتھ پروان چڑھ رہی ہے۔ لیکن زرقون اور فراز کی محبت تیز آندھیوں کی زد میں ہے۔ اللہ نے ثمینہ کو بیٹے سے نوازا ہے، فہمیدہ بیگم بہت خوش ہیں لیکن رقیہ بیگم ثمینہ کو اپنے ساتھ گھر لے گئیں اور روک لیا۔ اب ان کا مطالبہ ہے کہ ثمینہ کو الگ گھر لے کر دیا جائے۔ وہ چاہتی ہیں کہ فہمیدہ اپنا برسوں کا بسا بسایا گھر بیچ کر عرفان کو ورثہ دے دیں۔ فہمیدہ بیگم ان کے مطالبے سے بہت پریشان ہیں، رقیہ بیگم نے ان کے اور ان کے تمام گھر والوں کے خلاف پورے خاندان والوں کو بدگمان کر دیا ہے جس کا فہمیدہ بیگم کو بہت صدمہ ہے۔ مریم کا رشتہ طے ہو گیا ہے۔ جہاں آرا بیگم جہاں مریم کے رشتے سے خوش ہیں وہیں پرانے طے کردہ رشتوں کے بارے میں وہ بہت کچھ سوچ چکی ہیں۔ فراز جہاں آرا بیگم کے رویے کے بارے میں پریشان ہے لیکن نفیس احمد اس کو تشفی دیتے ہیں کہ جہاں آرا کا غصہ وقتی ہے۔ لیکن فراز مطمئن نہیں ہے۔ زرقون کے دل کو بھی اپنی تائی اماں کے سرد رویے کی وجہ سے عجیب سی بے چینی ہے۔ وہ فراز سے کہتی ہے، لیکن فراز اُس کو اطمینان دلاتا ہے۔ مریم اب بہت بدل گئی ہے۔ اُس میں ہونے والی ناخوش گوار تبدیلیاں جہاں آرا بیگم کے لیے اطمینان کا باعث ہیں۔ فہمیدہ بیگم اپنے میکے والوں کے رویے پر بہت دلبرداشتہ ہو جاتی ہیں وہ زرقون اور مریم سے اپنے دِل کی حالت بیان کرتی ہیں اُن کی باتوں کا کچھ حصہ رفیق احمد بھی سُن لیتے ہیں۔ اُن کو احساس ہوتا ہے انجانے میں وہ بھی فہمیدہ بیگم کے ساتھ زیادتی کر رہے ہیں وہ دِل ہی دِل میں فہمیدہ بیگم کو معاف کر دیتے ہیں اور عہد کرتے ہیں کہ وہ بھی اُن سے معافی مانگ لیں گے۔ لیکن کسی معافی تلافی کے بغیر فہمیدہ بیگم ایک رات جو سوتی ہیں تو سوتی ہی رہ جاتی ہیں...... وقار...... کو جہاں آرا بیگم کاروبار کے لیے پیسا دیتی ہیں اور سمجھتی ہیں کہ انہوں نے بیٹی کے لیے سکھ خرید لیے، لیکن وقار کا شکی مزاج مریم کو ہر وقت ڈستا رہتا ہے اور مریم کے مزاج میں چڑچڑا پن آ جاتا ہے...... اِدھر آفتاب نرگس کے لیے اپنے والدین سے بات کرتا ہے...... اُس کے والد کہتے ہیں کہ انہوں نے اُس کے رشتے کے لیے اپنے دوست جنید سے اُن کی بیٹی حیا کے لیے بات کر رکھی ہے۔ آفتاب یہ سن کر حیران رہ جاتا ہے...... جہاں آرا بیگم کے ساتھ ساتھ مریم بھی فراز کے ساتھ زرقون کی شادی کے خلاف ہے کیوں کہ مریم کا خیال ہے اگر اس کی شادی عرفان سے ہو جاتی تو اُس کو دِن رات وقار کے طعنے تو سُننے کو نہ ملتے...... زرقون کے لیے فراز کی محبت سے اُس کو حسد ہونے لگتی ہے۔ جہاں آرا بیگم نے زرقون کے خلاف ایک محاذ کھڑا کر رکھا ہے کیونکہ مریم نہیں چاہتی زرقون کی شادی فراز سے ہو۔ زرقون اور فراز بدلتے حالات

کی وجہ سے بہت پریشان ہیں۔ زرقون فراز سے کہتی ہے کہ وہ وعدہ کرے کہ وہ اُس کے علاوہ کسی اور سے شادی نہیں کرے گا۔ تو وہ ساری زندگی اُس کا انتظار کرنے کے لیے تیار ہے۔ رفیق احمد، رقیہ بیگم سمیت فہمیدہ بیگم کے سارے خاندان کو اپنے گھر آنے سے منع کردیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ثمینہ اور عرفان پر کوئی پابندی نہیں وہ جب جس کے گھر جانا چاہیں جاسکتے ہیں، لیکن اُن کے گھر کوئی نہیں آئے گا۔ مرتضیٰ اپنی ماں کے سمجھانے پر شیری سے ایک بار پھر سمجھوتے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ آفتاب حیا کو نرگس کے بارے میں بتاتا ہے وہ چاہتا ہے حیا اِس رشتے سے انکار کردے۔ وہ حیا کو چائے پر لے کر جاتا ہے لیکن حیا کوئی جواب دیے بغیر اُٹھ کر چلی جاتی ہے۔ آفتاب پریشانی سے سر پکڑ کر بیٹھ جاتا ہے۔ ثمینہ کو فہمیدہ بیگم کے بعد بہو ہونے کے ناتے گھر کی ذمے داری سپرد کی جاتی ہے۔ لیکن وہ حد سے زیادہ لاپروائی اور بے حسی کا مظاہرہ کرتی ہے اور یوں اُس کا اور زرقون کا پہلا جھگڑا ہوتا ہے۔ فراز اور زرقون کا رشتہ ختم کرانے کے لیے رقیہ بیگم، بنّو خالہ کے ساتھ مل کر ایسا چکر چلاتی ہیں کہ جہاں آرا بیگم فوری طور پر رفیق احمد کی بیٹی سے فراز کو دور کردیتی ہیں اور فراز کا رشتہ مریم کی پسند سے طے پا جاتا ہے۔ نرگس کی شادی آفتاب احمد سے ہو جاتی ہے اور وہ لندن چلی جاتی ہے۔ مرتضیٰ، شیری کو کسی گورے کے ساتھ رنگ رلیاں مناتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑ لیتا ہے اور اسی وقت اسے طلاق دے دیتا ہے۔ موی کا رشتہ رفیق احمد نے طے کردیا ہے اور اب وہ اس کی شادی کی تیاریوں میں مگن ہے۔ ڈاکٹر تابندہ عرفان کو دوا رب کا چونا لگا کر رفو چکر ہو جاتی ہے اچانک......

(اب آپ آگے پڑھیے)

''بیٹا اچھی طرح گھومی پھریں نا۔'' روحی جنید نے بہت محبت سے زری کی کمر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ممتا بھرے لہجے میں پوچھا۔ زرقون اور مرتضیٰ آج ہی ہنی مون ٹرپ سے واپس آئے تھے۔ مرتضیٰ اُس کی خواہش پر اُس کو اٹلی لے کر گیا تھا۔ اُس نے اپنی زندگی کے حسین محبت بھرے شب و روز، اپنے بہت محبت کرنے والے شوہر کی محبتوں میں ڈوبتے اُبھرتے گزارے تھے۔ زندگی اتنی حسین اور پُر کیف ہوگی یہ تو زرقون نے سوچا بھی نہ تھا۔ زندگی خوبصورت سے خوبصورت ہوتی جارہی تھی۔ واقعی امی صحیح کہتی تھیں کہ نکاح کے دو بول ایک عجیب سی تاثیر رکھتے ہیں۔ دو اجنبی ایک مضبوط ڈوری میں بندھتے ہیں اور پھر اللہ اُن کے دلوں میں غیب سے محبت ڈال دیتا ہے۔

زرقون کو بھی ایسا لگتا کہ جیسے محبت یہ ہوتی ہے۔ اُس کو شاید اب محبت ہوئی ہے۔ فراز! جس فراز کے لیے وہ سجدوں میں روئی، جس فراز کے لیے اُس نے رات، رات بھر نفل پڑھے، وہ فراز...... یقیناً اُس کے حق میں بہتر نہ ہوگا، جو اللہ نے نہ دیا، کہ اُس کی زندگی میں تو بے پناہ محبتیں رقم تھیں۔

کبھی کبھی زری کو لگتا جیسے وہ جنت میں آ گئی ہو کہ ہر نگاہ جو وہ مرتضیٰ کی طرف ڈالتی اُس کے دل میں مرتضیٰ کی محبت بڑھتی چلی جاتی۔ اور یہی حال مرتضیٰ کا تھا کہ ہر لمحے اُس کو زرقون پہلے سے زیادہ حسین اور اپنی اپنی سی لگتی۔ پھر اُس کا دل سرگوشی کرتا۔

'یہ اللہ کا انعام ہے جو تجھے ایک بدزبان اور بدکردار عورت کے ساتھ گھر بسانے کی کوشش کے عوض ملا۔'

''کیا دیکھ رہی ہو۔'' مرتضیٰ نے چہرے پر مدھم سی مسکراہٹ سجائے بیٹھی زری کے کان میں سرگوشی کی، ساتھ ہی اُس کا ہاتھ اُس کی کمر پر رینگنے لگا۔

''کیا کر رہے ہیں۔'' زری نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے شرگیں لہجے میں مرتضیٰ کے ہاتھ اپنی کمر پر لہراتے ہوئے روکنے کی ایسی کوشش کی جو وہ خود بھی روکنا نہیں چاہتی تھی۔

''میری جان! سوال کے بدلے سوال نہیں کرتے اور محبتوں پر بند نہیں باندھتے، محبتوں کو روانی دیتے ہیں، سپردگی دیتے ہیں۔'' مرتضیٰ نے اُس کے کانوں میں سرگوشی کی۔

''لیکن بازاروں میں نہیں ہوتا یہ سب کچھ۔'' زری نے مرتضیٰ کی شریر آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پیار بھری

سرزنش کی۔

''کیا کچھ؟'' مرتضیٰ مجسم سوال تھا۔ زری کچھ نہیں بولی بس مسکرا دی۔ اِس وقت وہ دونوں وینس کے ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھے گرما گرم کوفی کا لطف اُٹھا رہے تھے۔ زری دل ہی دل میں اللہ سے باتیں کر رہی تھی۔ پہلے وہ بہت دُکھی ہوئی تھی جب اُس کو پتا چلا تھا کہ وہ مرتضیٰ کی دوسری بیوی ہے۔ اُس کو نمبر دو بننا کبھی اچھا نہیں لگا۔ وہ ہمیشہ کلاس میں فرسٹ آئی۔ زندگی میں نمبر ایک پر رہنے کے لیے اُس نے بہت محنت کی بہت قربانیاں دیں لیکن زندگی کے اتنے بڑے موڑ پر وہ نمبر دو ٹھہری۔

پہلے وہ قدرت کی اِس ستم ظریفی پر بہت روتی تھی۔ کتنی ہی راتیں اُس نے بھیگے تکیے پر سر رکھے جاگتے گزاریں۔ کتنے ہی دن وہ ملول رہی۔ کتنے ہی دن ہر وصل کی رات اُس کو کانٹے کی طرح چبھی۔ کتنے ہی دن مرتضیٰ کی محبت اُس کو بھیک لگی۔ اور اُس کو محبتوں میں بھیک مانگنا پسند نہیں تھا۔ وہ محبت اعزاز کی طرح وصول کرنا چاہتی تھی۔ اُس کو تمغے کی طرح سینے پر سجانا چاہتی تھی۔ وہ جب دل ٹٹولتی اُس دل میں مرتضیٰ کی محبت تو ہوتی کہ وہ اُس کا مجازی خدا تھا۔ ایک محبت کرنے والا نفیس، دین دار اور مکمل انسان، لیکن اُس کے دل میں کہیں ایک عجیب سی خلش ہوتی اور اُس خلش کو وہ چاہنے کے باوجود کوئی نام نہ دے پاتی۔ وہ اپنے آپ کو ایک مشکل میں محسوس کرتی۔

لیکن وہ بھول رہی تھی کہ اللہ اگر مشکل میں ڈالتا ہے تو پھر مشکل میں اپنے بندوں کو اکیلا نہیں چھوڑتا۔ وہ بھول رہی تھی کہ اللہ کے ہر کام میں حکمت ہوتی ہے۔ اور پھر جب اُس کو اپنے سوالوں کا جواب ملا۔ ایک لمحہ ہی تو تھا کہ دل کی خلش اور سینے کی چبھن ختم ہوئی، کانٹوں کا بستر، پھولوں کی سیج بن گیا۔

''ویسے جانِ مرتضیٰ ذرا ایک بات کی تو وضاحت کریں۔'' مرتضیٰ کی آواز پر وہ چونکی اور پھر سر جھٹک کر مرتضیٰ کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

''کیا دیکھ رہی ہو۔'' مرتضیٰ نے پوچھا۔ اور زرقون باقاعدہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔

''جناب گھوم پھر کر آپ پھر اُس سوال پر آگئے۔'' زری نے بمشکل ہنسی پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''بس بیگم صاحبہ لیکن اِس دفعہ سوال کی نوعیت دوسری ہے۔'' مرتضیٰ نے پیار بھری ڈھٹائی سے کہا۔ ''خیر چھوڑو یہ بتاؤ! یہ رات کو تو بارہ چوڑیاں تھیں، صبح آٹھ کیسے رہ گئیں۔'' مرتضیٰ نے شرارت سے زرقون کی دودھیا کلائی میں پہنی باریک مینے کی آٹھ چوڑیوں کو گنتے شرارتی لہجے میں کہا۔ زری اُس کو گھورتی گئی اور مرتضیٰ نے دنیا بھر کی معصومیت اور حماقت اپنے چہرے پر سجالی۔ اور پھر مرتضیٰ بے ساختہ ہنس دیا اور اُس کے قہقہے میں زرقون کی شرمگیں مسکراہٹ بہت ہی حسین لگنے لگی۔

''جی ممی۔'' روحی بیگم کا سوال نہ جانے زرقون کو کہاں کہاں لے گیا۔

''بس بیٹا خوش رہو۔ میری یا تمہارے ڈیڈی کی تو بس یہی خواہش ہے کہ تم لوگ خوش رہو۔ میرے بیٹے کا اور میرے گھر کا ہمیشہ خیال رکھنا، میری جان کہ تم کو میں بہت مان، محبت اور اپنائیت سے بیاہ کر لائی ہوں۔ تمہیں جب میں نے پہلی دفعہ دیکھا تھا تو اُسی لمحے میرے دل نے کہا تھا یہی ہے وہ لڑکی جس کی میرے مرتضیٰ کو ضرورت ہے اور مجھے اُمید ہے کہ تم میرا مان نہیں توڑو گی۔'' روحی جنید نے بہت محبت اور ممتا بھرے لہجے میں زری کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر کہا۔

اُس لمحے زری کو وہ ایک ایلیٹ کلاس سے تعلق رکھنے والی، ایک این جی اوز کی صدر اور ایک بہت ایکٹو سوشل ورکر کی جگہ صرف ماں لگیں۔ ایک ایسی ماں جس کی زندگی کی اولین خواہش اُس کی اولاد کا سکھ ہوتا ہے۔ وہ ایک ایسی عورت لگیں جس نے تنکا تنکا جمع کر کے یہ آشیانہ بنایا ہو اور اب اُس کو زمانے کی تیز ہواؤں سے ڈر لگ رہا ہو۔ ہلکی سی ہوا اُس کو لرزا رہی ہو۔ کبھی وہ اپنی محبت کو دیکھتی ہو اور کبھی چراغ کی ٹمٹماتی لو کو۔

''آپ بے فکر رہیے ممی...... میں اپنی حتی الامکان کوشش کروں گی کہ آپ کے اعتماد اور بھروسے کو ٹھیس نہ لگے۔ آپ خوش رہیں۔ میری امی اور ابا تو ہیں نہیں بس اب آپ میری ممی ہیں اور ڈیڈی میرے ڈیڈی۔'' زرقون کے لہجے میں سچ تھا، صداقت تھی۔ مسز روحی جنید کو ایسا لگا اُن کے اندر ایک انرجی بھر گئی ہو۔ جیسے وہ ایک بار پھر جوان ہو گئی ہوں۔ اُن کے چہرے پر ایک محبت بھری مسکراہٹ آ کر ٹھہر سی گئی۔

''لیکن بھابی ممی ڈیڈی تھوڑے سے میرے بھی تو ہیں نا۔'' حیا نے بہت معصومیت سے شہادت کی انگلی اور انگوٹھے کے درمیان تھوڑا سا گیپ رکھ کر پوچھا۔ تو سارا گھر قہقہوں سے گونج اُٹھا۔

☆......☆......☆

''یا اللہ! ایسی ذلت!'' فراز کی پیشانی عرق آلود ہو گئی۔

وہ شانزے کے ساتھ اُس کے ڈیفنس والے گھر میں شفٹ ہو گیا تھا۔ کہتے ہیں مرد اگر ایک دفعہ گھر بیٹھ جائے تو اُس کو ایک عجیب سی لت پڑ جاتی ہے۔ ایک ایسا نشہ ہو جاتا ہے کہ پھر وہ کسی کام دھندے کا نہیں رہتا۔ یہی فراز کے ساتھ ہوا۔ اچھا خاصا کاروبار کر رہا تھا لیکن شانزے کی دولت، اور ماں بہن کی پڑھائی ہوئی پٹیوں نے جیسے اُس کو نکمے پن کے ایک ایسے غار میں دھکیل دیا تھا جس سے وہ اگر باہر نکلنا بھی چاہتا تو نہیں نکل سکتا تھا۔ یقیناً فراز نے ایک اچھی زندگی گزاری تھی لیکن شانزے کی بدولت وہ اب ایلیٹ کلاس میں شامل ہو گیا تھا۔ اُس نے ایلیٹ کلاس کی اچھائیاں تو نظر انداز پہلے ہی دن کر دی تھیں لیکن برائیاں اتنی تیزی سے قبول کیں کہ لگتا تھا شاید اُس کے اندر یہی کچھ تھا۔ کیونکہ گندا پانی، گندے نالے میں ہی بہتا ہے۔

اُس نے دیوار پر لگی بڑی سی کلاک کو دیکھا اور پھر جیب سے فون نکال کر ایک نمبر ڈائل کرنے لگا۔

''ہیلو!'' دوسری طرف زرقون تھی۔

''زری میں...... فراز!'' فون میں سرگوشی گونجی اور زرقون سر سے پیر تک لرز کر رہ گئی۔ اُس نے پیچھے مڑ کر آرام سے ٹی وی دیکھتے مرتضیٰ کو دیکھا اور پھر فون کا پاور آف کر دیا۔

''خیریت!'' مرتضیٰ نے چونک کر اُس کی پسینے میں تر پیشانی کو دیکھتے ہوئے فکرمندی سے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔'' زرقون زبردستی مسکرائی جبکہ اِس وقت اُس کا دل دھاڑیں مار مار کر رونے کو چاہ رہا تھا۔

''نہیں زری تم پریشان لگ رہی ہو۔'' مرتضیٰ بضد تھا۔ یا اللہ زندگی میں اب تو اطمینان اور سکون آیا تھا اور خوشیاں ملی تھیں اب ایک اور امتحان، ایک اور آزمائش، اب مرتضیٰ مستقل طور پر پاکستان شفٹ ہو گیا تھا۔ اُس کی پوسٹنگ اسلام آباد میں ہوئی تھی۔ وہ مرتضیٰ کے ساتھ اسلام آباد F-6 میں رہائش پذیر تھی۔ وہ خوش تھی، وہ مطمئن تھی، وہ اکثر تنہائی میں جب اپنے آپ سے بات کرتی تو کہتی۔

''زرقون ایسا کیا کیا تھا، جو اللہ نے ایسا انعام دیا۔'' پھر کوئی اُس کے کانوں میں سرگوشی کرتا۔

''تجھے باپ کی دعا لگی ہے۔ تیری ماں کی نیکیاں مجسم ہو کر تیرے سامنے آ کھڑی ہوئی ہیں۔ تیرا صبر، تیری

برداشت، قابلِ قبول تھی۔ ''لیکن اب یہ فراز، یہ فراز کیوں میرے پیچھے پڑ گیا ہے۔

جہاں آرا بیگم شدید بیمار تھیں۔ وہ اُس کی تائی تھیں۔ وہ تائی اماں جن سے وہ بہت محبت کرتی تھی۔ وہ تائی اماں جن کی ضد اور غصے نے اُس کو ایک وقت بہت رُلایا تھا۔ لیکن آج وہ اُن کی شکر گزار تھی۔ اگر وہ ضد نہ باندھتیں، اگر وہ غصہ نہ کرتیں، تو...... کیا وہ مرتضٰی کو پا سکتی تھی؟ تو کیا ملتا ''فراز'' اُس کے کانوں میں ایک نام گونجا۔

''فراز!'' اُس کے لب کپکپائے۔

''بیٹا تم آئیں۔ مجھے بہت خوش ہوئی۔'' جہاں آرا بیگم نے اُس کو سینے سے لگا کر پچھلے پانچ منٹ میں کوئی دسویں بار یہ جملہ کہا۔ ''میں نے کیا کیا نہیں کیا تمہارے ساتھ، حتیٰ کہ تمہاری شادی میں تمہارے تایا تک کو نہ آنے دیا اور تم میری بیماری کا سُن کر اتنی دور سے آ گئیں۔ کاش بیٹا میں غصے کی پٹی اپنی آنکھوں پر نا باندھتی۔ کاش میں اتنی ظالم نہ ہوتی۔'' جہاں آرا بیگم دوپٹے کا پلو آنکھوں پر رکھے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

''اس طرح مت کہیں تائی اماں۔ مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ بخدا میں آج بھی آپ سے بے حد محبت کرتی ہوں۔ اللہ کے ہر کام میں مصلحت ہوتی ہے۔ یہ دنیا تو شطرنج کی ایک بساط ہے اور ہم...... ہم سب مہرے ہیں۔ اللہ جس مہرے کو جہاں چاہتا ہے، وہاں رکھ دیتا ہے۔ ہمیں اللہ کے فیصلوں کو قبول کر لینا چاہیے۔ ہماری فلاح، ہمارا اطمینان اِسی میں ہے۔ ہوگا تو وہی جو اللہ نے لکھ دیا ہے۔ ہماری ضد، ہمارے انکار کی حیثیت اور حقیقت کیا ہے۔ اور تائی اماں ایک وقت ایسا ضرور آتا ہے جب ہم کو پتا چلتا ہے کہ اللہ کا فیصلہ ہمارے حق میں کتنا بہتر تھا اور پھر ہمیں چاہیے کہ جتنے گلے شکوے اللہ سے کیے ہیں کم از کم اتنے ہی شکرانے کے نفل ادا کریں۔'' زرقون نے بہت محبت سے جہاں آرا بیگم کے دل پر پڑے بوجھ اور ندامت کو کم کرنے کی کوشش کی۔

''تم صحیح کہتی ہو بیٹا! میرا بیٹا پتھر تھا۔ میں نے اُس کو ہیرا سمجھا۔ تم ہیرا تھیں، میں نے تمہاری قدر نہیں کی۔ آج جب فراز کو دیکھتی ہوں تو سوچتی ہوں وہ تمہارے قابل ہی نہیں تھا۔ تم کیا ہو؟ وہ کیا ہے؟ لیکن میں بدنصیب کبھی سمجھ ہی نہیں سکی۔''

میک اپ سے بے نیاز چہرہ، سیدھی مانگ نکال کر بندھی لمبی سی چوٹی، ستواں ناک میں لشکارے مارتی جگمگاتی ہیرے کی لونگ، کانوں میں چھوٹے چھوٹے ہیرے کے ٹاپس، مخروطی سفید انگلیوں میں سجتی ہیرے اور یاقوت کی انگوٹھیاں، گرے رنگ کا قیمتی سوٹ، کندھوں پر پھیلی بلیک شال جس کے کنارے گرے رنگ کی کڑھائی سے سجے تھے۔ پیروں میں نفیس، اونچی ہیل کا بلیک کورٹ شوز، چہرے پر سکون، اطمینان، امارت...... ماشاء اللہ زرقون کتنی حسین ہوگئی اور کتنی بدل گئی ہے۔ آج زرقون، زرقون نہیں لگ رہی۔ لیکن ہاں ایک بڑے آفیسر کی بیگم ضرور لگ رہی ہے۔ زرقون کے اٹھنے بیٹھنے میں کیسی شان اور تمکنت ہے۔ میں نے تو کبھی غور ہی نہیں کیا۔ کیسے غور کرتی، تعصب کی عینک اُتارتی تو بچی کی خوبیاں نظر بھی آتیں۔ آج اگر زری اِس گھر کی بہو ہوتی تو کم از کم فراز کو لے کر الگ تو نہ ہوتی۔ احمد امریکہ جا کر بس گئے۔ فراز بیوی کے غلام ہو گئے اور مریم...... مریم کے تصور سے ہی جہاں آرا بیگم کی آنکھیں بھر آئیں۔

''تائی اماں...... مریم آپا کہاں ہیں؟'' زرقون نے نرم لہجے میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑاتے ہوئے سوال کیا۔

جہاں آرا بیگم کے گردوں میں تکلیف رہنے لگی تھی۔ چند دن پہلے اُن کا آپریشن بھی ہوا تھا اور جب زری کو

پتا چلا۔ تو اُس کو ایسا لگا جیسے اُس کے دل پر گھونسہ پڑا ہو۔ جب جو اُس نے مرتضیٰ سے کہا تو اسی نے اُس وقت اُس کو کراچی بھیج دیا کہ لاڈلی بیوی کو پریشان وہ نہیں دیکھ سکتا تھا۔

''مریم! مریم کا کیا پوچھتی ہو بیٹا۔ باسکٹ لے کر، ہر قیمت پر، بیٹی کے لیے خوشیاں خریدتی پھرتی رہی۔ لیکن اُس کا نصیب تو نہ بدل سکی۔ ایک اپنی بیٹی کے دل کے سکھ اور خوشی کے لیے میں نے کس کس کی خوشیاں نہیں چھینیں لیکن واہ ری قسمت! بیٹی آج پہلے سے بھی زیادہ دکھی اور پریشان ہے۔ دراصل بیٹا ہم زمین پر رہنے والے، زمین والوں کو معاف نہیں کرتے اور آسمان والے سے ہر معافی کے طلب گار ہوتے ہیں۔ ہم یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ اگر آسمان والے نے ہم سے وہی معاملہ کیا جو ہم زمین والوں کے ساتھ کرتے ہیں تو ہم کہاں جائیں گے۔ لیکن ہم سوچتے ہی نہیں ہیں۔ ویسے بھی جب اللہ کسی کے لیے بدبختی لکھتا ہے تو اُس کی زبان بے لگام کر دیتا ہے۔ جیسے میری ہوگئی تھی۔'' جہاں آرا بیگم نے کھلے دل سے اپنی غلطیوں کا اعتراف کیا۔

''چھوڑیے نا...... تائی اماں۔ آپ کی ویسے ہی طبیعت خراب ہے اور آپ اب ایسی باتیں کیے جا رہی ہیں۔ بس ختم کریں۔ مجھے نہ تو تایا ابا نظر آ رہے ہیں اور نہ ہی مریم آپا۔ وہ دراصل مجھے سات بجے کی فلائٹ سے واپس جانا ہے۔ ابھی دو بج رہے ہیں۔ سسرال بھی جانا ہے نا۔'' زرقون نے وال کلاک پر نظر ڈالتے ہوئے رسان سے کہا۔

''ارے کیا اسلام آباد سے سارا دن کے لیے ہی آئی ہو۔ رات بھی نہ ٹھہرو گی۔'' جہاں آرا بیگم کے لہجے میں ممتا گو کی۔ زری خاموش رہی کہ کتنے عرصے بعد جہاں آرا بیگم اُس کو اپنی پرانی والی تائی اماں لگی تھیں، جن سے لپٹ لپٹ کر اُس نے جتنی فرمائشیں کی تھیں۔ اتنی تو اُس نے کبھی اپنی ماں سے بھی نہیں کی تھیں۔

''خیر بیٹا اپنے گھر میں خوش رہو۔ ہمارے لیے یہی کافی ہے۔ تمہارے تایا ابا تو دکان پر گئے ہوئے ہیں کہ فراز تو اب کام پر آتے ہی نہیں ہیں۔ وہ تو بس بیوی کا پرس پکڑے اُس کے پیچھے پیچھے غلاموں کی طرح پھرتا رہتا ہے۔ آج بہت دنوں بعد آیا تھا تو مریم کو لے کر نفسیاتی اسپتال گیا ہے۔ آج مریم کا چیک اپ تھا نا۔''

''نفسیاتی اسپتال! مریم آپا کا چیک اپ!'' زرقون کو شدید دھچکا لگا۔

''ہاں بیٹا! جب سے مریم کو طلاق ہوئی ہے......''

''طلاق! مریم آپا کو طلاق۔'' زرقون کو جیسے سانپ نے ڈنک مار دیا ہو۔ وہ اپنی جگہ سے اُچھل کر کھڑی ہوگئی۔ اُس کی آنکھیں حیرت اور تاسف سے پھٹ سی گئیں۔

''بیٹا تم کو نہیں معلوم کیا۔'' جہاں آرا بیگم نے کہا اور پھر خود ہی بولیں۔ ''ارے ہاں بیٹا تم کو کیسے پتا ہوگا۔ جس وقت تمہاری شادی ہوئی تھی نا اور تم اپنے میاں کے ساتھ باہر گھومنے پھرنے گئی تھیں۔ جب ہوا تھا یہ معاملہ۔''

''لیکن کیوں؟'' زرقون کے حلق سے بہت مصیبت سے نکلا۔

''ارے بیٹا کیا پوچھ رہی ہو کیوں۔'' نفیس احمد جو ابھی گھر میں داخل ہوئے تھے شکست خوردہ لہجے میں کہتے ہوئے آگے بڑھے اور زرقون کے سر پر اپنا کپکپاتا ہوا ہاتھ رکھ دیا۔ زرقون نے ایک نظر اپنے تایا پر ڈالی، اُس کے باپ اور تایا میں زیادہ فرق نہیں تھا۔

''آپ اتنے عرصے بعد آئی ہو بیٹا، ایسا ناراض ہوئیں کہ پلٹ کر دیکھا بھی نہیں کہ ہم زندہ ہیں یا مر گئے۔''

نفیس احمد کے لہجے میں شکوہ تھا۔ زری خاموش رہی۔

''بس بیٹا! میں نے سارے جہان کے صبر سمیٹے، سب کی خوشیاں چھینیں اور بیٹی کی جھولی میں ڈال کر، اُس کو خوش نصیب بنانے کی کوشش کی۔ لیکن وہ لوگ بہت لالچی تھے۔ پہلے اُن کو فراز کا لالچ تھا، تو جب اُن کی بیٹی کوئی اور پھانس گیا تو انہوں نے خود ہی فراز کے لیے انکار کر دیا۔ پھر جو کچھ ہم نے مریم کو دیا۔ فلیٹ، دکان، کیش، زیور سب وقار نے بہلا پھسلا کر اُس سے اپنے نام کروالیا۔ بدقسمتی دیکھو، گود بھرنے سے پہلے اُجڑ گئی اوپر سے ڈاکٹر نے کہہ دیا کہ اب مریم کی کبھی گود نہیں بھر سکتی۔ میری بیٹی کی قربانیاں، محبتیں، کچھ کام نہ آئیں اور وقار نے میری مریم پر بدچلنی کا الزام لگا کر طلاق دے دی۔ میری بچی برباد ہوگئی۔ میری بچی پاگل سی ہوگئی۔'' جہاں آرا بیگم ایک بار پھر آبدیدہ ہوگئیں۔

روکھا، کھردرا، گہرا سانولا رنگ۔ ملگجے سے کپڑے روکھے بے ترتیب بال، ہاتھوں میں دوائیوں کا شاپر۔ زرقون نے کھٹکے کی آواز پر پلٹ کر دیکھا تو دیکھتی رہ گئی۔ یہ اُس کی مریم آپا تھیں۔

''آپا'' اُس کے لہجے میں دکھ تھا اور آنکھیں...... زرقون لپک کر مریم کے گلے سے جالگی۔ مریم کے ہاتھوں سے دوائی کا شاپر زمین پر گر گیا اور اُس نے لڑکھڑاتے لہجے میں کہا۔

''زری مجھے معاف کردو۔ زری اللہ کے واسطے مجھے معاف کردو۔''

لیکن زری کو تو جیسے کچھ سنائی ہی نہیں دے رہا تھا۔ وہ تو بس مریم کے گلے لگ کر روتی جارہی تھی۔ روتی جارہی تھی۔

''ہمارے ہاں کون آیا ہوا ہے۔'' فراز نے دروازے پر مریم کو اُتارتے ہوئے جب بلیک V-8 کے ساتھ کھڑے باوردی ڈرائیور کو دیکھا تو حیران ہوکر سوچا۔ اُس کا دل چاہا وہ اندر جا کر دیکھے لیکن اُس کو دیر ہورہی تھی۔ شانزے خیابانِ شہباز پر واقع ایک ریسٹورنٹ میں اپنی دوستوں کے ساتھ لنچ پر گئی ہوئی تھی۔ وہ فراز کو اپنی دوستوں سے ملوانا چاہتی تھی۔ سو اُس نے بہت مصیبت سے فراز کو گاڑی اور مریم کو لے جانے کی اجازت دی تھی اور فراز کی گاڑی تیزی سے ڈیفنس کی طرف رواں دواں تھی۔ بغیر یہ جانے کہ اندر کون بیٹھا تھا۔

☆......☆......☆

''یا اللہ اب کیا کروں؟'' ثمینہ نے آٹے کے کنستر میں جھانکتے ہوئے جیسے اپنے آپ سے سوال کیا۔ خالی کنستر اُس کا منہ چڑا رہا تھا۔

''عرفان آٹا بھی ختم ہوگیا ہے۔'' اُس نے اندر عبداللہ کے سرہانے خاموش بیٹھے عرفان سے کہا۔

''اچھا...... یہ وقت بھی آنا تھا۔ خیر کچھ کرتا ہوں۔'' عبداللہ کو بلڈ کینسر تھا اور یہی غم رفیق احمد کو ہزار غم برداشت کرنے کے باوجود لے ڈوبا تھا۔ کہتے ہیں اصل سے زیادہ سود پیارا ہوتا ہے۔ سب کچھ کھونے کے بعد وہ عبداللہ کو نہیں کھو سکتے تھے، سو تھک گئے اور اب شاید قبر میں بھی بے چین تھے۔

ماں باپ کتنا گھنا سایہ ہوتے ہیں۔ اُن کی موجودگی کیسی ہمت بندھاتی ہے۔ اگر ماں باپ نہ ہوں تو آدمی کیسے بھری دنیا میں اکیلا رہ جاتا ہے، یہ کوئی عرفان سے پوچھتا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اگر وہ لینے پر آئے تو سات نسلوں تک لیتا ہے اور جو نوازنے پر آئے تو بھی سات نسلوں تک نوازتا چلا جاتا ہے۔ عرفان کو جوڑوں کی تکلیف ہوگئی تھی۔ اُس کے گھٹنے سوجے رہنے لگے تھے۔ اُس کے جسم کا ایک ایک جوڑ دُکھتا تھا۔ زندگی کہاں سے کہاں پر

لے آئی تھی۔ وقت بدلتے دیر نہیں لگتی۔ وقت آدمی کو کیسے کملا دیتا ہے۔ وہ اکثر ثمینہ کے چہرے کو دیکھتے ہوئے سوچتا۔

وقت نے ثمینہ کی کمر پر پے در پے دو ہنٹر مارے تھے۔ وقت کی چابک نے ثمینہ کی کمر کو توڑ دیا تھا۔ اُس کا سرخ وسفید رنگ کملا گیا تھا۔ معمولی کپڑوں میں گھر کا جھاڑو برتن کرتی ثمینہ اُس کو عجیب سی لگتی۔ لیکن ہاں ثمینہ کا مزاج آج بھی وہی تھا۔ زرتون سے پہلے وہ نفرت کرتی تھی اب نفرت کے ساتھ ساتھ حسد بھی کرنے لگی تھی۔ لیکن ہاں اگر کسی نے اُس کے وجود میں دراڑ ڈالی تھی تو وہ عبداللہ کی بیماری تھی۔

وہ اُس کی اولاد تھا۔ اُس کی پہلوٹھی کی اولاد۔ روز بہ روز اُس کی حالت خراب ہوتی چلی جارہی تھی۔ عرفان سے کام نہیں ہوتا تھا لیکن پیٹ روٹی تو مانگتا ہے نا۔

عرفان نے جیب سے مڑے تڑے، مسلے ہوئے نوٹ احتیاط سے دکان دار کی طرف بڑھاتے ہوئے پانچ کلو آٹے کا تھیلا پکڑا۔

''280 روپے کا ہے جناب۔'' دکاندار نے پیسے گنتے ہوئے پلٹ کر جاتے ہوئے عرفان سے کہا۔

''20 روپے اور بڑھ گئے۔'' عرفان نے حیرت سے پوچھا۔

''یہ وہ عرفان تھا جو ہزار دو ہزار تو رکھ کر بھول جایا کرتا تھا۔''

یہ وہ عرفان تھا جو صرف لارنس پور کا کپڑا پہنتا تھا۔

یہ وہ عرفان تھا جس کے کپڑے موسیٰ جی کے ہاں سلتے تھے۔

یہ وہ عرفان تھا جس کی ڈریسنگ مشہور تھی۔ اور آج وہی عرفان......

اُس عرفان کو 20 روپے بہت لگ رہے تھے۔

''یار اب غریب کیا دال روٹی بھی نہیں کھا سکتا۔'' عرفان نے 20 کا نوٹ دکاندار کی طرف بڑھاتے ہوئے عجیب سے شکستہ لہجے میں کہا تھا۔

''ارے جناب کیا بات کررہے ہیں۔ اگر آپ جیسے غریب ہوگئے تو ہمارا کیا ہوگا۔'' دکاندار نے باکس میں نوٹ ڈالتے ہوئے کہا تو عرفان کو ایسا لگا جیسے وہ اُس کا مذاق اُڑا رہا ہو، اُس پر طنز کررہا ہو، ہنس رہا ہو۔ لیکن......

''میں غریب ہوں بہت غریب، تم کیا جانو، دین اور دنیا دونوں کا غریب ہوں۔ میں ماں باپ کا نافرمان، میں ماں باپ کو دکھ دینے والا، ایک بدنصیب اور غریب آدمی ہوں۔ عرفان نے جیسے اپنے آپ سے کہا اور پھر دُکھتی ٹانگوں سے گھر کی طرف چل دیا۔

''ہاں ظاہر ہے علاج تو کروا رہے ہیں۔ اولاد ہے ہماری، لاپروائی کیسے کرسکتے ہیں۔'' گھر میں گھستے ہی عرفان کے کانوں میں ثمینہ کی تیز آواز پڑی تو اُس کے ماتھے کے بل اور دل کے زخم دونوں گہرے ہوگئے۔

''لیکن اِس بیماری کا علاج تو بہت مہنگا ہے۔'' وہ کوئی محلے کی خاتون تھیں جو عبداللہ کی خیریت پوچھنے آئی تھیں۔

''ہاں، کہہ تو رہی ہوں، کروا رہے ہیں علاج۔ آپ کو ہم سے زیادہ ہمارے بچے کی فکر ہے کیا۔ اور یہ بتایئے کہ آپ کو اپنے گھر میں کوئی کام نہیں ہوتا جو ہر دوسرے دن چندیا پر برقعہ رکھے چلی آتی ہیں۔'' ثمینہ نے بدتمیزی کی ساری حدیں عبور کرتے ہوئے انتہائی بدتمیزی سے اُن بوڑھی ہمسائی سے کہا، جو بیچاری صرف یہ سوچ کر چلی

آتی تھیں کہ بیمار بچہ اور اکیلی عورت ہے۔ وہ اُس کا منہ دیکھتی رہ گئیں۔

''چلی گئیں بڑی بی۔'' عرفان نے بڑبڑاتی ثمینہ سے پوچھا۔

''ہاں بھئی چلی گئیں۔ اور آپ کیا گھر کے معاملات میں ٹانگ اڑاتے رہتے ہیں حد ہوتی ہے۔ نکتہ چینی سے جان ہی نہیں چھوٹتی، میں تو پریشان ہوگئی۔'' ثمینہ مسلسل روٹی پکاتے ہوئے بڑبڑا رہی تھی۔

''یہ وہ عورت ہے جس کی محبت میں، میں نے شاید جہنم خرید لیا۔ نہ ماں سے وفا کی اور نہ ہی باپ سے، ایک بہن تھی، اُس کو بھی کبھی نہیں گردانا اور آج جب مجھ پر برا وقت پڑا ہے تو یہ عورت اپنی محبتوں کے سارے دعوے بھول کر صرف طعنہ زنی کر رہی ہے۔ مجھے طعنے دے رہی ہے۔ مجھ جیسے ناعاقبت اندیش انسان کا یہی حال ہونا چاہیے۔ ابا ٹھیک کہتے تھے۔ جب پتا ڈال سے ٹوٹ جاتا ہے تو پھر پیروں تلے کچلا جاتا ہے۔ اُس کی کوئی وقعت اور پہچان نہیں رہتی۔ ثمینہ، ثمینہ ہی رہی۔ ثمینہ کے کئی روپ میرے سامنے اِس برے وقت میں کھلے۔

''زری! زری نہ جانے کیسی ہوگی۔'' عرفان کو اپنی بہت ساری پریشانیوں میں زرقون کا صبیح چہرہ یاد آیا۔

☆......☆......☆

''یا اللہ نرگس تم نے جب میری بھابی سے دوستی بڑھائی تو یقین کرو مجھے ایسا لگتا تھا، جیسے میرا دل بند ہو جائے گا۔ لیکن تم! تم نے تو کمینگی کی انتہا کر دی تھی۔'' زرقون نے محبت سے نرگس سے شکوہ کیا۔

کئی ماہ بعد مومنہ پاکستان آئی تھی۔ اب وہ جب پاکستان آتی تو زری کے گھر ہی رہتی اور زرقون بھی اُس کا اِس طرح خیال رکھتی جیسے ایک ماں اپنی لاڈلی بیٹی کا رکھتی ہے۔

کتنے دنوں بعد نرگس، زرقون اور مومنہ ایک ساتھ بیٹھے تھے۔ مومی کا ننھا سا بیٹا زرقون کی گود میں گہری نیند سو رہا تھا۔ زرقون اور مومی کے چہرے پر وہ اطمینان اور سکون تھا، جو نصیب والوں کو ہی ملتا ہے۔ خانساماں گرم گرم پکوڑے تل رہا تھا اور دوسرے ملازمین لا کر سرو کر رہے تھے۔ زرقون کے لیے قدم قدم پر ملازمین ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔ یہ کیسی زندگی تھی۔

'واقعی زری آپا کو وہ بھی ملا جو انہوں نے سوچا تھا اور وہ بھی ملا جو انہوں نے کبھی نہیں سوچا تھا۔' مومی نے محبت سے شاداب چہرہ لیے ہنستی مسکراتی اپنی ماں جیسی بڑی بہن کو دیکھا۔

''پتا ہے زری جب میں نے مرتضٰی بھائی کے بارے میں سُنا تو میرا دل چاہا اُن سے، تمہاری شادی ہو جائے۔ لیکن میں بس سوچ کر ہی رہ گئی اور جب میں آفتاب کے ساتھ امریکہ گئی اور اُن کے گھر میں ٹھہری تو پھر میں نے فیصلہ کر لیا کہ تمہارے لیے اُن سے بہتر شوہر ہو ہی نہیں سکتا۔ لیکن مسئلہ تھا، تمہاری فیملی!'' وہ ذرا کی ذرا رُکی پھر گویا ہوئی۔ ''مجھے تو اندازہ ہی نہیں تھا کہ فراز بھائی اندر سے اتنے کمزور اور سطحی ذہنیت کے مالک ہوں گے۔ خیر اللہ نے تمہاری جان چھڑائی۔ اگر تمہاری بھابی کو پتا چل جاتا کہ مرتضٰی بھائی کا اسٹیٹس کیا ہے، اُن کا فیملی بیک گراؤنڈ کیا ہے تو وہ خود زہر تو کھا لیتیں لیکن تمہاری شادی کبھی بھی نہ کرتیں۔ آنٹی کو تم بہت پسند تھیں۔ سو انہوں نے مرتضٰی بھائی کو تیار کیا۔ میں نے مرتضٰی بھائی کو تمہارے بارے میں تمہاری مجبوریاں، تمہاری اچھائیاں اور تمہارے ساتھ زمانے کی ناانصافیاں سب بتائیں اور اُن سے درخواست کی کہ نکاح سے پہلے وہ کسی کے سامنے نہ آئیں۔ ایک تو وہ شادی کے لیے راضی نہیں ہو رہے تھے اور دوسرے تمہارے مسئلے کے لیے...... کہتے ہیں نا جو کام اللہ نے لکھ دیا وہ ہو کر رہتا ہے۔ سو وہ مان گئے۔ اُن کا ماننا میرے اور آنٹی کے نزدیک ایک معجزے

سے کم نہیں تھا۔

لیکن آنٹی تم کو بہت ارمانوں، آرزوؤں اور خواہشوں کے ساتھ بیاہ کرلانا چاہتی تھیں ۔ وہ اِس طرح شادی کے لیے تیار ہی نہیں تھیں ۔ اُن کو آفتاب اور حیا نے سمجھایا۔ یوں یہاں سارا معاملہ سیٹ ہونے کے بعد میں نے تمہاری بھابی کو بوتل میں بند کیا اور اُس بھوت نما چڑیل کو بوتل میں بند کرنے کے لیے مجھے اِس پری کو ناراض کرنا پڑا، اگنور کرنا پڑا۔'' نرگس نے محبت سے شہادت اور درمیانی انگلی سے زرقون کی ٹھوڑی کو اونچا کرتے ہوئے کہا۔

''اور ہاں اُس جن کو کس طرح بوتل میں بند کرنا ہے یہ طریقہ مجھے تمہاری خالہ بٹو نے سمجھایا، آیا سمجھ میں۔ اب تم میرے کندھے تھپتھپاؤ کہ میں کتنی سمجھدار ہوں۔'' نرگس نے فرضی کالر اونچے کیے۔

''کوئی کندھے نہیں تھپتھپارہا بلکہ تمہارا تو گلا دبا دینا چاہیے۔ پتا ہے تمہارے رویے کو دیکھ کر میں کتنا روتی تھی۔ میرا دل کتنا دُکھتا تھا۔'' زری نے محبت بھرا شکوہ کیا۔

''تو زری آپا، نرگس باجی نے آپ کا دل دکھا کر مرتضٰی بھائی کا دل آپ کے قدموں میں بھی تو ڈال دیا۔ نرگس باجی واقعی شاباش کی مستحق ہیں۔'' مومی نے منہ بناتی نرگس کا دفاع کیا۔

''اور کیا...... تم کتنی اچھی ہو مومی۔'' نرگس خوش ہوئی۔

''وہ تو میں ہوں، آپ پلیز بار بار مت کہیں۔'' مومی اِترائی اور زری ہنس دی۔ آج کل وہ اتنا خوش رہنے لگی تھی کہ بات بے بات ہنستی مسکراتی رہتی۔ زندگی حسین سے حسین تر ہوتی جارہی تھی۔ اُس کا ہر دن عید اور ہر رات شب برأت تھی اور اب وہ پریگیننٹ تھی، اللہ اُس کو اولاد جیسی نعمت سے نواز رہا تھا۔

مرتضٰی اُس کو پھولوں کی طرح سنبھال کر رکھ رہا تھا۔ وہ جہاں پیر رکھتی، مرتضٰی اپنی ہتھیلی رکھ دیتا۔

''پتا نہیں بھائی کس حال میں ہیں۔ اللہ کرے گھر پر سب خیریت ہو۔'' بہت ساری باتوں کے درمیان زرقون کو بھائی یاد آیا۔

''بس زری آپا، اب آپ اِس حالت میں کوئی فکر مت پالیں۔ سب خیریت ہوگی۔ وہ کون سا ہم کو پوچھتے ہیں۔ یاد نہیں آپ کو کس طرح امی کو بیوی کی حمایت میں ستاتے تھے۔ کیسا ابا کو برباد کیا اور آپ کی رُخصتی کے وقت جب اُن کی بیوی نے ہاتھ اُٹھا کر آپ کو منع کیا تھا کہ اب کبھی ہمارے گھر نہ آنا، تو عرفان بھائی خاموش رہے تھے۔ بس بس آپا بہت ہوگیا۔ اللہ نے بہت دُکھ اور تکلیفوں کے بعد آپ کو اتنے سُکھ دیے ہیں۔ بس آرام سے رہیے اور اِن خوشیوں کو انجوائے کریں اور......''

''ارے...... رے...... ایک بچے کی ماں بننے کے بعد مومی تم تو ہم سب کی اماں بن گئی ہو۔ ہائیں!'' نرگس نے حیرت سے آنکھیں پھاڑیں تو مومی کے ساتھ ساتھ زری بھی ہنس دی۔

''لیکن زری میں چند دن پہلے امی کے گھر گئی تھی امی بتارہی تھیں کہ......''

☆......☆......☆

''ناظرین آج ہم بے سہارا اور ایسی مجبور عورتوں کے درمیان ہیں جن کو اُن کے ہی پیارے یہاں چھوڑ گئے۔ جن کو کوئی ملنے نہیں آتا۔ یہ بے بس، مجبور، پریشان اور بیمار عورتیں حسرت سے درودیواروں کو تکتے ہوئے زندگی کی سانسیں پوری کررہی ہیں۔

''اچھا کیا نام ہے اِن کا۔'' میک اپ زدہ چہرہ لیے چہرہ پر مصنوعی مسکراہٹ سجائے اُس ٹی وی اینکر نے

ہڈیوں کا ڈھانچہ بنی اُس فالج زدہ عورت کی طرف اِشارہ کرتے ہوئے، جس کے منہ سے مسلسل رال بہہ رہی تھی اور بہتی ہوئی رال کی وجہ سے اُس کے سر کے نیچے رکھا میلا کچیلا تکیہ بھیگ رہا تھا۔ اُس کے جسم پر جگہ جگہ زخم پڑ گئے تھے اور زخموں پر مسلسل ہٹانے کے باوجود مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔

یہ ایک خیراتی ادارہ تھا، اور ایک پرائیویٹ چینل کی اینکر صرف ریٹنگ بڑھانے کے چکر میں اِس وقت یہاں موجود تھی۔ اُس کو یہاں پر موجود ہر عورت سے ہمدردی سی محسوس ہو رہی تھی۔ لیکن اِس بیمار اور ڈھانچہ نما مکروہ صورت عورت سے نہ جانے کیوں اُس کو گھن سی آ رہی تھی۔ لیکن وہ اِس عورت کو ہائی لائٹ کرنا چاہتی تھی۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اِس طرح پروگرام کی ریٹنگ بڑھے گی۔ صرف ریٹنگ۔

''دیکھیں جی باجی اِس کو اِس کی بیٹی چھوڑ کر گئی ہے اور جب سے گئی ہے پلٹ کر ہی نہیں آئی۔ اور باجی ہم بھی کیا کریں۔ اِس عورت کا جتنا خیال رکھو، یہ اُتنا ہی بیمار ہو جاتی ہے۔ بول نہیں سکتی، اکثر گندگی میں لتھڑ جاتی ہے۔ بتا تو سکتی نہیں۔ جب بد بو اُٹھتی ہے تو پتا چلتا ہے تو ہم صاف بھی کرتے ہیں۔ اِس وجہ سے سارے جسم پر زخم پڑ گئے ہیں اور نہ جانے روز ہی اِس کا بستر صاف ہوتا ہے روز رات کو نہ جانے کہاں سے سرخ چیونٹیوں کے گچھے کے گچھے آ جاتے ہیں اور وہ اِس بیچاری کو ساری ساری رات کاٹتے ہیں۔ بہت اذیت میں ہے یہ عورت۔ اللہ اِس کی مشکل آسان کرے۔

''یا اللہ!'' وہ عورت بتائے جا رہی تھی لیکن آرام دہ کاؤچ میں بیٹھی، اے سی کی یخ کولنگ کے باوجود زرقون پسینے میں نہا رہی تھی۔ اُس کا دل کانپ رہا تھا۔ اور اُس کے ہاتھوں میں اتنی بھی جان نہیں رہی تھی کہ وہ ریموٹ اُٹھا کر ٹی وی بند کر دے۔

دیکھو مجھے کہ جو دیدۂ عبرت نگاہ ہوں میں

اینکر نے تاسف سے مصرعہ پڑھا تو خالہ بٹو نے چونک کر اسکرین کی طرف دیکھا۔ اپنے جھلنگا پلنگ سے اُٹھ کر وہ ٹی وی اسکرین کے قریب آ گئیں اور پھر اُن کے منہ سے حقارت سے نکلا۔

''رقیہ!'' اور انہوں نے پھر ٹی وی بند کر دیا۔

☆......☆......☆

''ہتھ ہاہ! ہمارے نصیب میں یہ لکھا تھا۔ ثمینہ نے ایک کمرے اور چھوٹے سے صحن والے سیمنٹ کی چھت والے گھر کو دیکھتے ہوئے اپنے آپ سے کہا۔

''تم گھر کو دیکھ کر دُکھی نہ ہو ثمینہ عبداللہ کا آپریشن ضروری تھا۔ اللہ عبداللہ کو زندگی دے دے، ہمارے لیے یہی کافی ہے۔'' شکستہ لہجے والا وہ عرفان تو نہیں تھا۔ لیکن وہ عرفان ہی تھا۔ زندگی بھر غلط فیصلوں اور بددعاؤں کے نیزے پر رہنے والا عرفان۔

وہ عرفان جس کے پاس معاف کرنے والا بھی کوئی نہ تھا۔ وہ عرفان جو اگر اپنے گناہوں پر شرمندہ بھی ہوتو کوئی نہیں تھا جس کے آگے وہ ہاتھ جوڑتا۔ اُس کا معاملہ اللہ سے نہیں تھا۔ اللہ تو اپنے بندوں کو ہر حال میں معاف کر دیتا ہے لیکن اُس کی بھی ایک شرط ہے کہ بندوں کا معاملہ بندوں سے نمٹا کر آؤ۔

عرفان نے خاموشی سے کچن کو صاف کرتی ثمینہ کو دیکھا۔ واقعی اولاد، بہت عجیب چیز ہوتی ہے۔ ثمینہ جیسی فولادی عورت کو توڑ دیا۔ ثمینہ تو سر تا پیر بدل گئی۔ وہ باتیں، وہ غصہ ہوا ہو گیا۔ لیکن......اب کیا ہو سکتا تھا۔

''پتا نہیں زری کس حال میں ہے۔ یقیناً خوش ہوگی۔ اُس نے زندگی بھر صبر کیا اور دعائیں بھی سمیٹی تھیں تو اللہ نے ضرور اُس کی زندگی میں خوشیاں ہی لکھی ہوں گی۔ زری بھی سوچتی ہوگی کہ کیسا بھائی ہے ایک بار بھی پلٹ کر نہیں دیکھا۔ لیکن مجھے اپنی غلطیوں کا احساس ہے اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ زری آج بھی ہر بات بھلا کر میرے لیے، میری مدد کے لیے کھڑی ہو جائے گی لیکن میں نہیں چاہتا۔ میں بالکل نہیں چاہتا اب زری ہمارے لیے کسی آزمائش سے گزرے۔

اُس کا میاں ایک عورت کا ڈسا ہوا مرد ہے اور ایسے مرد بہت جلد بے اعتبار ہو جاتے ہیں۔ زری لاکھ مجھے برا سمجھے، مجھے اِس کی پروا نہیں، لیکن زری کی زندگی میں کوئی زہر نہ گھلے مجھے اِس بات کی پروا ہے۔

عرفان ایک بھائی تھا۔ لاکھ وہ بیوی اور ساس کے بہکاوے میں آ گیا تھا لیکن تھا تو وہ محبت سے گندھی فہمیدہ اور رشتوں کا مان رکھنے والے رفیق احمد کی اولاد، اور خون کا رشتہ بہت گہرا ہوتا ہے۔ یہ بات وہ ثابت کر رہا تھا۔

''بس اللہ میاں میں نے اپنا گھر، وہ گھر جو میری ماں کا تھا۔ وہ گھر جو میری بہن نے مجھے دے دیا تھا۔ وہ میں نے اپنے بچے کے علاج کے لیے بیچ دیا ہے۔ تو اُس کو زندگی اور صحت دے دے۔'' کھلے آسمان تلے صحن میں بچھے پلنگ پر بیٹھا آسمان پر نظریں جمائے عرفان اپنے آپ سے باتیں کر رہا تھا۔

☆......☆......☆

''ارے بس یار! Husband کیا بس پالتو جانور ہے۔ ممی نے بہت سوچ سمجھ کر میری شادی اُس سے کروائی ہے۔ میری ممی سمجھ گئی تھیں کہ وہ لالچی لوگ ہیں۔ اُن لوگوں نے لالچ اور میری شکل دیکھ کر، میری ممی کے قدموں میں لوٹتے ہوئے میرا رشتہ مانگا۔''

''تو کیا تم لوگوں نے اُن کو بہت کچھ دیا ہے۔'' سامنے بیٹھی تراشیدہ بالوں والی انتہائی ماڈرن سی لڑکی نے نخوت سے ناک چڑھاتے ہوئے پوچھا۔

زرقون نے پلٹ کر دیکھا۔ آواز جانی پہچانی تھی لیکن لڑکی کی اُس کی طرف پیٹھ تھی اور سامنے بیٹھی فورک کو نزاکت سے پکڑی لڑکی کو وہ نہیں پہچانتی تھی۔ آج زرقون کی شادی کی سالگرہ تھی اور وہ مرتضٰی کے ساتھ ''دیس پردیس'' میں لنچ کے لیے آئی تھی۔ باہر چھاجوں مینہ برس رہا تھا۔ سیاہ لباس پر سرخ رنگ کی شال اوڑھے، ہلکے ہلکے میک اپ اور ناک میں بڑی سی سرخ رنگ کی لونگ پہنے، زرقون قیامت کی حد تک حسین لگ رہی تھی۔

مرتضٰی کا ایک دوست مل گیا تھا اور مرتضٰی چند لمحوں کے لیے برابر والی میز پر چلا گیا تھا اور اکیلی بیٹھی زرقون کی توجہ اِن دونوں لڑکیوں کی طرف مرکوز ہو گئی تھی۔

''نہیں یار! کچھ نہیں دیا۔ سب کچھ میرے نام ہے۔ تم تو جانتی ہو کہ جب ابارشن والے کیس میں تو ڈاکٹر کی معمولی سی لاپروائی نے مجھے ہمیشہ کے لیے بانجھ کر دیا۔ ممی نے اِس لیے میرے لیے اِن لوگوں کو چنا اور میرا Husband تو پہلے ہی دن سے میری دولت سے متاثر ہو گیا تھا تو میں بھی ہڈی ڈالے رکھتی ہوں۔

سب سے بڑی بات میں اپنی مرضی کی زندگی گزار رہی ہوں۔ اور جو میرا Husband ہے، اُس باؤلے کو میں کہیں اپنے ساتھ لے کر نہیں جاتی اور وہ کبھی اعتراض بھی نہیں کرتا۔ سو زندگی سہولت سے گزر رہی ہے۔ میرے گلے میں شوہر نام کا ڈھول ڈلا ہوا ہے اور وہ بیوقوف مرسڈیز میں گھوم رہا ہے۔ سو

زندگی Give And Take کے درمیان ڈول رہی ہے۔'' لڑکی ہنسی۔

''توبہ کس قدر بے عزتی کی بات ہے۔ شوہر تو مجازی خدا ہوتا ہے اور یہ لڑکی! یا اللہ اِس کا شوہر کتنا بے غیرت آدمی ہے۔ کاش میری موجودگی میں آ جائے تو میں بھی دنیا کے اِس بے غیرت اور بے شرم شوہر کو دیکھ سکوں۔ وہ لڑکیاں ہنس رہی تھیں اور اُن کے قہقہوں کے درمیان خاموش دور بیٹھی زرقون سوچ رہی تھی۔

''ارے فراز!'' زری کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ فراز اُن کی میز پر کب آ کر بیٹھا زرقون کو اندازہ بھی نہیں ہوسکا۔ ''ارے یہ فراز کی بیوی ہے۔'' زری نے اپنے آپ سے کہا۔ اُس کو لگا جیسے ساتوں آسمان اُس کے اوپر دھڑ دھڑ گرتے کرتے چلے جا رہے ہوں۔ وہ دونوں لڑکیاں ایک دوسرے کو آنکھ مارتے ہوئے ہنس رہی تھیں اور زرقون اُن کی ہنسی کے بیک گراؤنڈ میں کھوئی ہوئی ایک ٹک فراز کو دیکھ رہی تھی۔

اُس فراز کو، جس کو اُس نے بے حد اور بے انتہا چاہا تھا۔ اُس فراز کو، جس کو اُس نے اپنے دل کے سب سے اونچے استھان پر بٹھا رکھا تھا۔ اُس فراز کو جس کی وہ دل سے عزت کرتی تھی۔ اُس فراز کو جس کو اُس نے تہجدوں میں رو رو کر اللہ سے مانگا تھا لیکن وہ اُس کو نہیں ملا۔

''کیوں؟'' آج اُس کی سمجھ میں آ گیا تھا۔ اِسرار کھل گئے تھے۔ آنکھوں پر گرا پردہ ایک جھٹکے سے اُتر گیا تھا اور اُس لمحے جب وہ اِسرار کی بھول بھلیوں سے باہر نکل رہی تھی، فراز کی نظر زرقون کی طرف اُٹھ گئی اور جو اُٹھی تو پلٹنا ہی بھول گئی۔

☆......☆......☆

''زری تم کس قدر حسین ہوگئی ہو۔'' مرتضٰی سو رہا تھا اور زری جو حسبِ عادت کتاب پڑھ رہی تھی نے گھبرا کر برابر لیٹے مرتضٰی کو دیکھا۔

''آپ! آپ نے مجھے فون کیوں کیا؟'' زرقون نے دبی ہوئی آواز میں فراز سے کہا۔

''کیوں زری میں تم کو اب فون بھی نہیں کرسکتا۔'' فراز کے لہجے میں شکوہ تھا۔ زری نے ایک نظر مرتضٰی کو دیکھا اور پھر اُس کو اپنے پیٹ میں پرورش پاتے بچے کی ایک بے قراری کسمساہٹ محسوس ہوئی تو اُس کا لہجہ خود بخود مضبوط ہوگیا۔

''نہیں فراز آپ کو مجھے فون نہیں کرنا چاہیے تھا۔ میرا آپ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔'' زرقون نے کہا اور فون کی لائن کاٹ دی۔

''پلیز زری......'' جب زرقون نے دوبارہ مسلسل بجتی بیل پر فون اٹھایا تو فراز کا لہجہ ملتجیانہ ہوا۔

''دیکھیں ایک تو آپ کو مجھے زری کہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ میرا نام مسز زرقون مرتضٰی ہے۔''

''پلیز اِس طرح نہ کہو۔ تم زری ہو۔ صرف میری زری۔ اور زری آج تم کس قدر خوبصورت لگ رہی تھیں۔ میرے وہم و گمان سے زیادہ حسین اور نازک۔ مجھ سے غلطی ہوئی زری جو میں نے تم سے شادی نہیں کی۔ لیکن زری ہم مل تو سکتے ہیں نا۔ اور اِس طرح تو آج کل ہو ہی رہا ہے۔ تم مجھ سے ملو گی نا۔ میں جانتا ہوں تم مجھ سے بہت محبت کرتی ہو۔ تم نے کبھی بھی میری بات نہیں ٹالی تو آج بھی نہیں ٹالو گی۔'' فراز کے لہجے میں یقین تھا۔

''آپ اِس حد تک گر جائیں گے میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ مسٹر فراز آپ ایک شریف عورت سے بات کر رہے ہیں۔ اور شریف عورتیں اپنے شوہروں کے ساتھ بے وفائی نہیں کرتیں۔ اُن کو دھوکہ نہیں دیتیں۔ میں

اونٹ کا گوشت

اس گوشت کی تاثیر گرم وخشک ہے۔ عرب دنیا میں اونٹ کا گوشت عام ہے۔ اسے ذبح کرنے کا سنت طریقہ یہ ہے کہ اسے کھڑا کر کے ذبح کیا جائے تاکہ اس کے جسم کا تمام خون بہہ جائے۔ اگر اس کو لٹا کر ذبح کیا جائے تو اس کے بدن سے مکمل طور پر خون خارج نہیں ہوگا، پھر یہ خون منجمد اور متعفن ہو کر امراض کا باعث بنتا ہے۔ اس سے تپ دق، سل، گٹھیا، جگر، گردہ اور نظام ہضم کی خرابی پیدا ہوتی ہے۔ جب کہ ''آقائے دوجہاں صلی اللہ علیہ وسلم'' کے مطابق اس کا گوشت جگر سمیت دیگر امراض میں مفید ہے۔ اسی طرح اونٹنی کا دودھ تاثیر کے لحاظ سے گرم و خشک، نمکین، ہلکا، زود ہضم، بھوک لگانے کے ساتھ بدن میں چستی پیدا کرتا ہے۔ کھانسی، دمہ، تلی اور بواسیر کے امراض میں مفید ہے۔ جدید تحقیق کے مطابق ہیپا ٹائٹس، شوگر میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ گوشت خالص تریاق ہونے کے ساتھ ساتھ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پسندیدہ خوراک اور مکمل غذائیت وشفا بخش ہے۔

سوچتی تھی کہ آپ مجھے کیوں نہیں ملے۔ میرے اندر یا میری محبت کے اندر کیا کمی تھی لیکن آج آپ کی بیوی کی باتیں سُن کر آپ کی اوقات کا اندازہ ہوگیا۔ شوہر اور پالتو جانور کا فرق سمجھ میں آگیا۔ میرے ساتھ اللہ کی رحمت ہے۔ میرے سر پر میرے ماں باپ کی دعاؤں کا سایہ ہے۔ میں نے کبھی نہ کسی کے ساتھ بُرا کیا اور نہ برا چاہا اور نہ کسی کے لیے برا سوچا۔ تو میرا اللہ میرے ساتھ کیسے برا کرتا۔ میرے لیے اللہ آپ جیسا چھوٹی ذہنیت رکھنے والا اور کم ظرف انسان کیسے منتخب کرتا۔ واقعی اللہ بہترین فیصلہ کرنے والوں میں سے ہے۔ وہ ہمیں اکثر وہ تو نہیں دیتا جو ہم مانگتے ہیں لیکن وہ ضرور دیتا ہے جس کی ہم کو ضرورت ہوتی ہے۔ جو ہمارے حق میں اچھا ہوتا ہے۔

میں اللہ کی احسان مند ہوں کہ اُس نے مجھے ایک غیرت مند اور شریف مرد عطا کیا۔ ایک ایسا مرد جس کے ساتھ چلتے ہوئے مجھے تحفظ کا احساس ہوتا ہے۔ ایک ایسا مرد جس کا ذکر میں فخریہ کرتی ہوں۔ سہیلیوں کے درمیان بیٹھ کر اُس کا نہ مذاق اڑاتی ہوں اور نہ ہی اڑا سکتی ہوں۔'' زرتونن نے تیزی سے اپنی بات مکمل کی اور فون بند کرتے ہی فون کا پاور آف کردیا۔

لیکن پھر ایک سلسلہ تھا جو شروع ہوگیا۔ فراز اُس کو بار بار فون کرتا، وہ بار بار کاٹ دیتی حتیٰ کہ اُس نے اپنی سم ہی بدل ڈالی لیکن فراز نے اُس کا نیا نمبر بھی حاصل کرلیا تھا۔ زری اکثر سوچتی یہ وہ فراز تو نہیں ہے جس سے اُس نے محبت کی تھی۔ یہ تو کوئی تھرڈ کلاس بلیک میلر تھا جو ہر کال پر کہتا تھا۔

''زری مجھ سے ملو۔ ورنہ سوچو میں تمہارے میاں کو بھی بتا سکتا ہوں۔ تم سوچو اگر اُس کو تمہارے میرے ساتھ دھواں دار عشق کا علم ہوجائے تو تمہاری زندگی، زندگی تو نہ رہے گی۔''

''فراز آپ اِس قدر بھی گھٹیا ہو سکتے ہیں۔ یہ بات تو میرے تصور میں بھی نہیں تھی۔ آج میری سمجھ میں آیا ہزار سجدوں کے باوجود آپ سے میری شادی کیوں نہیں ہوئی کیونکہ آپ جیسا مرد میرے لائق ہی نہیں تھا۔ آج میرا دل چاہ رہا ہے کہ سجدۂ شکر ادا کروں اور میں کروں گی بھی۔'' زرقون نے چبا چبا کر کہا۔ وہ فراز سے تنگ آ گئی تھی۔ اُس کی کمر میں شدید درد کی ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔

''زری میں آپ سے پوچھ رہا ہوں کیا بات ہے، کس کا فون تھا؟ آپ اِس قدر پریشان کیوں ہو رہی ہیں۔'' مرتضیٰ نے اُس کے زرد پڑتے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے بے حد ملائمت سے اپنی جان سے زیادہ عزیز بیوی سے پوچھا۔

''یااللہ یہ وقت بھی آنا تھا۔ بس اتنے سے دن کا سکون تھا میری زندگی میں۔'' زرقون کا دل رویا۔

خیر جو ہونا ہے وہ تو ہو کر رہے گا۔ اگر تقدیر میں ہی لکھا ہے اگر اللہ کو یہی منظور ہے تو پھر...... روز کے مرنے سے ایک دفعہ کا مرنا بہتر ہے۔ زرقون نے اپنے آپ کو سمجھایا اور پھر ایک نظر سوال بنے کھڑے اُس شخص کو دیکھا جس کے بغیر اُس کے لیے سانس لینا بھی محال تھا۔ جس کی رفاقت میں اُس نے محبت کا اصل روپ دیکھا تھا اور جس کی محبت نے اُس کو......

زرقون کو پھر اپنے جسم میں مرتضیٰ کی محبت کسمساتی ہوئی محسوس ہوئی تو اُس نے بے ساختہ اپنے پیٹ پر ہاتھ رکھ دیا۔

''ہائے...... میری زندگی!'' اُس کا دل رویا۔

''بولیے زری!'' مرتضیٰ نے دوبارہ محبت بھرے لہجے میں کہا۔

زرقون نے اپنے خشک ہوتے ہونٹوں پر زبان پھیری اور پھر بہت ہمت کر کے اُس سے کہا۔

''مرتضیٰ! میرا ایک کزن تھا فراز......''

☆......☆......☆

''آپ کے شوہر کہاں ہیں اِس وقت۔'' ڈاکٹر نے تابندہ سنبل سے پوچھا۔

ڈاکٹر تابندہ کو کئی دن سے شدید بخار تھا اور ہر طرح کی ٹریٹمنٹ کے باوجود اُس کا ٹمپریچر کم نہیں ہو رہا تھا۔ وہ پریگننٹ تھی۔ اور اس وقت وہ اسپتال میں ایک انڈین ڈاکٹر سے علاج کروا رہی تھی۔ ڈاکٹر لتا ایک اچھی گائنا کالوجسٹ تھی۔ لیکن آج پہلی بار اُس نے جمال کے بارے میں پوچھا تھا۔

''احمد جمال۔'' ڈاکٹر تابندہ سنبل کے ہونٹ کپکپائے۔

''تمہارا بہت شکریہ تابندہ کہ تم اور تمہارے فراڈ کی وجہ سے میں امریکہ جیسے ملک میں آ بسا اور آج جبکہ مجھے یہاں کی شہریت بھی مل گئی ہے تو میرے خیال سے اب مجھے تمہاری بالکل ضرورت نہیں ہے۔ اور ویسے بھی تم اِس قدر چالاک اور مکار عورت ہو کہ تم پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ ماں سے لے کر دنیا کے ہر رشتے کو تم نے اپنے مفاد کے لیے دھوکہ دیا۔ تو پھر میرے اندر کون سے سرخاب کے پر لگے ہوئے ہیں۔ اکثر راتوں کو میری آنکھ کھل جاتی ہے اور میں سوچتا ہوں کہ کبھی تم نے مجھے دھوکہ دیا جو کہ تم ضرور دو گی تو پھر مجھے کیا کرنا ہے۔ تمہارا شکریہ کہ تم نے مجھے ریذیڈینس کروائی۔ تم دعویٰ کرتی ہو کہ تم مجھ سے محبت کرتی ہو، ہو سکتا ہے کرتی بھی ہو لیکن آئی ایم سوری! میں نے تم سے کبھی بھی محبت نہیں کی۔ میں نے تم کو صرف استعمال کیا اور استعمال کیا ہوا ٹشو پیپر میں کب تک اپنے

ساتھ رکھوں۔ سو تم کو پھینک کر میں جا رہا ہوں۔ تمہارا شکریہ کہ تم نے اکاؤنٹ اور گھر میرے نام کر دیا تھا۔ عورت محبت میں اندھی ہو جاتی ہے یہ میں نے سُنا تھا اور تم جیسی عورت، تم جیسی شاطر، چالاک اور مکار عورت بھی...... اندھی ہو جاتی ہے یہ تجربہ میری زندگی کا پہلا تجربہ تھا۔ میں واپس جا رہا ہوں۔ میرے گھر والوں نے ایک معصوم اور شریف لڑکی کے ساتھ میری شادی طے کر دی ہے۔ گو کہ زندگی میں، میں ساری بہت ساری عورتوں کے پاس گیا ہوں۔ لیکن اُس کے باوجود تم مجھے یاد رہو گی۔ کسی خوش فہمی میں نہ رہنا، تم کبھی بھی مجھے اچھے لفظوں میں یاد نہیں رہو گی۔ تم جیسی عورت جس نے ایک مکان بنانے کے لیے نہ جانے کتنے لوگوں کے گھر اُجاڑ دیے، اُس کے ساتھ میں ایک چھت تلے رہنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ گڈ بائے، ہمیشہ کے لیے۔''

''میرے شوہر مر گئے ہیں۔'' ڈاکٹر تابندہ نے ماضی میں ڈوبتے ہوئے شکستہ لہجے میں کہا۔ ''آپ مجھے بتایئے ڈاکٹر لسٹار پورٹس کیا ہیں؟'' تابندہ کے لہجے میں لاکھ چھپانے کے باوجود آنسوؤں کی نمی تھی کہ رونا اب مقدر جو ٹھہرا تھا۔ جس کے لیے بہت کچھ کیا تھا حتیٰ کہ اللہ کے غضب اور بدلے کو بھی بھلا بیٹھی تھی۔ اُس نے اُس کو کس بے دردی سے توڑا تھا۔ واقعی اللہ کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے لیکن جس کی کمر پر پڑتی ہے۔ اُس کی کمر کو توڑ کر رکھ دیتی ہے۔

''مسز تابندہ احمد مجھے آپ کو یہ بتاتے ہوئے شدید دُکھ ہو رہا ہے کہ آپ کی رپورٹس کے مطابق آپ اور آپ کا ہونے والا بچہ دونوں ہی ایڈز کے مریض ہیں۔''

ڈاکٹر کے لفظ تھے یا بارود سے بھرے کنٹینرز، جنہوں نے تابندہ کے وجود کے پرخچے اڑا دیے تھے۔ اُس کو لگ رہا تھا جیسے وہ کچھ سُن ہی نہیں رہی ہو۔ اُس کو اپنا وجود لرزتا سا محسوس ہوا اور پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

☆......☆......☆

''دیکھیے ہم نے بہت کوشش کی۔ لیکن میڈیکل سائنس ایک جگہ پر آ کر جیسے ٹھہر سی جاتی ہے۔'' ڈاکٹر نے کہتے کہتے ایک نظر خاموش سوال بنے بے چین میاں بیوی کو دیکھا۔ ایک لمحے کے لیے اُس کو اُن دونوں پریشان حال لوگوں پر بے تحاشا ترس آیا جنہوں نے اپنی زندگی اور ضرورت کی ہر چیز اپنے بچے کو بچانے کے لیے داؤ پر لگا دی تھی لیکن......

''آپ دونوں ہی ہمیشہ نظر آتے ہیں۔ آپ کے اور گھر والے۔'' نہ جانے کیوں ڈاکٹر نے بات پلٹی۔

''جی ڈاکٹر صاحبہ میری دو بہنیں ہیں لیکن اتفاق سے آج کل دونوں ہی ملک سے باہر ہوتی ہیں۔ ایک تو دبئی میں رہتی ہے اور دوسری چند ماہ سے لندن گئی ہوئی ہے۔'' عرفان نے ڈاکٹر کو بتایا اور نجانے کیوں موی اور زری کا ذکر کرتے ہوئے اُس کو عجیب سی طمانیت کا احساس ہوا۔ یہ رشتے بھی عجیب ہوتے ہیں، لاکھ اِن سے دامن چھڑاؤ، اِن کو توڑ دو، اِن کو دھتکارو لیکن ہمیشہ ضرورت کے وقت، اکیلے پن میں، یہ بہت یاد آتے ہیں۔ رشتے یاد آتے ہیں رشتے بہت رُلاتے ہیں۔ اور اِس وقت عرفان کو اپنے ماں باپ، اپنی بہن بہت یاد آ رہے تھے کس قدر تنہا تھا وہ۔ لیکن تنہا تو وہ خود ہوا تھا نا۔

ثمینہ نے خاموش نظروں سے عرفان کی طرف دیکھا تو اُس کے دل میں بھی عجیب سا احساس پیدا ہوا۔ کاش زرقون ہوتی۔ لگتا ہے پھوپو کا صبر اور زرقون کی بددعا مجھے لگ گئی ہے۔ زندگی سے خوشی، اطمینان اور سکون کیسے ختم ہو گئے۔ میں نے کس قدر زیادتیاں کی ہیں سب کے ساتھ۔ اور اُن سب کا ظرف......

اُن کا ظرف کتنا بلند تھا۔ ہمیشہ میری ہر برائی کو نظر انداز کیا۔ واقعی بندہ لاکھ اپنی چالیں چلے لیکن جب اللہ کا فیصلہ آتا ہے تو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جاتا ہے۔

''یا اللہ میں کتنی گناہ گار ہوں اور میرے گناہ، میرا لالچ، میرا حسد، میرے بچے کے آگے آ رہا ہے۔ یا اللہ!'' ثمینہ کے لب خاموش تھے لیکن آنسو بہت تیزی سے اُس کا چہرہ بھگو رہے تھے۔

ڈاکٹر نے تاسف اور دکھ سے خاموش کھڑے بدحال پریشان میاں بیوی کو دیکھا۔ اور پھر اُس نے بات آگے بڑھائی گو کہ یہ اُس کا پروفیشن تھا۔ وہ تقریباً روز ہی اِس سچویشن سے گزرتا تھا لیکن معصوم سے عبداللہ سے جو روز بروز موت کی طرف بڑھ رہا تھا، اُس کو ایک عجیب سی انسیت سی ہوگئی تھی اور آج جب اُس ننھے سے بچے نے معصومیت سے اُس سے پوچھا۔

''ڈاکٹر انکل میں کب ٹھیک ہوں گا۔'' تو ڈاکٹر التمش کا دل چاہا وہ کہے بہت جلد۔ لیکن وہ کچھ نہ کہہ سکا اور خاموشی سے کمرے سے باہر آ گیا اور اب یہ پریشان ماں باپ...... لیکن اُس کو بتانا تو تھا ہی نا۔

''دیکھیے ہم نے ہر طرح کی کوشش کرلی۔ آئی ایم سوری، ہم مجبور ہیں۔''

''تو ڈاکٹر صاحب......'' ثمینہ تڑپی۔

''کوئی تو رستہ ہوگا۔ کوئی تو راہ ہوگی۔ میرے بچے کے لیے، کچھ تو بتائیں۔'' عرفان خاموش تھا اور ثمینہ بلک رہی تھی۔

''آپ عبداللہ کو بیرون ملک لے جائیں۔ شاید جدید ٹیکنالوجی اس کو زندگی دے دے۔'' ڈاکٹر التمش نے کہا۔

''کیا آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ جدید سائنس، جدید ٹیکنالوجی میرے بچے کو بچالے گی اور اوپر بیٹھا اللہ۔'' ثمینہ نے اُس اللہ کا حوالہ دیا جس کی اُس نے ہمیشہ نافرمانی کی، جس کے قانون اور اصولوں سے ہمیشہ بغاوت کی۔ لیکن وہ کیا کرتی کہ مصیبت میں ہر مسلمان کو اللہ ہی یاد آتا ہے۔

''اللہ میرے بچے کو زندگی دے گا۔'' زندگی بھر پیسے کو اللہ ماننے والی ثمینہ اللہ کی بات کر رہی تھی۔

''جی، بیشک اللہ ہی موت و زندگی کا مالک ہے لیکن دعا کے ساتھ دوا ضروری ہے۔ اللہ زمین پر اُتر کر نہیں آتا، وسیلے پیدا کرتا ہے اور علاج بھی اک وسیلہ ہے۔ انسانی کوشش ہے۔'' ڈاکٹر نے ایک تڑپتی ہوئی ماں کو سمجھایا۔

''تو ڈاکٹر صاحب۔'' عرفان ہکلایا۔

''میری تو یہی رائے ہے کہ آپ اِس بچے کو بیرون ملک لے جائیں اور دعا کریں۔ شاید کوئی راہ نکل آئے، ورنہ......'' ڈاکٹر التمش کہتے کہتے رُک گئے۔ ثمینہ اور عرفان اُن کا جملہ مکمل سننا بھی نہیں چاہتے تھے۔

اُس چھوٹے سے گھر میں، جس کی سیمنٹ کی چادروں والی چھت میں موجود کئی سوراخ گھر والوں کی بے بسی پر افسردہ تھے۔ بستر پر لیٹا، ہڈیوں کا ڈھانچہ بنا عبداللہ، وہ بچہ جس نے زندگی ابھی شروع بھی نہیں کی تھی۔ وہ زندگی کی بازی کسی بھی وقت، کسی بھی لمحہ ہار سکتا تھا۔

عرفان نے اپنی جگہ سے اُٹھ کر بچے کے برابر بیٹھ کر اپنے لاڈلے بیٹے کے ماتھے پر اپنے ہاتھ کی چار انگلیاں رکھیں۔

''عبداللہ۔'' اُس کے عبداللہ کا ماتھا بُری طرح جل رہا تھا۔ اُس کو عبداللہ کے ماتھے کی تپش سے اپنی انگلیاں جلتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ اُس نے بے بسی سے آنکھیں بند کیے نقاہت سے کپکپاتے بیٹے کو دیکھا اور پھر آسمان کی طرف اور آنسو اُس کی پلکوں کی باڑھ توڑتے ہوئے تیزی سے اُس کے رخساروں پر پھیلنے لگے۔

''یا اللہ میں تیری گناہ گار بندی، یا اللہ میں تو اِس قابل بھی نہیں ہوں کہ تیرے آگے ہاتھ پھیلا سکوں، تجھ سے کچھ مانگ سکوں۔ لیکن میرے مالک! میں کیا کروں۔ میرا کون ہے تیرے سوا! میں بدنصیب...... ہاں اللہ میاں! زرقون کو بدنصیب کہنے والی، دراصل میں خود بدنصیب تھی۔ آج جب احساس ہوا تو میرے ہاتھ خالی ہیں۔ میں نے ہمیشہ برائی کی۔ برائی چاہی، تُو ظالموں کی گرفت کرلیتا ہے۔ آج مجھ سمیت ایک ایک کر کے سب ہی تیرے غضب کا شکار ہیں۔ لیکن میرے مالک میں تیری رحمت کا سوال کرتی ہوں۔ میں تجھ سے رحم نہیں مانگوں گی تو کس سے مانگوں گی۔ مجھ پر رحم کردے۔ میرے لیے، میرے گھر کے لیے اور میرے بچے کے لیے غیب سے مدد بھیج۔ میرے مالک! میں دنیا دار، میں گناہ گار، آج تیرے در کو کھٹکھٹانا اُس وقت تک نہیں چھوڑوں گی جب تک تُو مجھے معاف نہیں کرے گا۔

میرا ایمان ہے جب تُو مجھے معاف کردے گا تو ساری دنیا کا دل میری طرف سے نرم ہو جائے گا۔

میں نے پھوپو فہمیدہ کو بہت ستایا۔ یا اللہ اُن کی قبر کو جنت کا باغ بنادے، اُن کو اور پھوپا جان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب ہو۔ میں نے اُن کا بیٹا جیتے جی چھینا اور میرا بیٹا مرکر جدا ہو رہا ہے۔ میرے رویے سے ایک ماں کے دل کو کیسی تکلیف پہنچی، آج مجھے احساس ہوتا ہے۔ میں نے ایک باپ کو ستانے میں، تکلیف دینے میں، اُس کی عزت اُچھالنے میں، کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ آج کیسے ذلیل ہو رہی ہوں۔ مجھے کوئی شکوہ نہیں میرے مالک! میں جانتی ہوں یہ سب میرے اعمال ہیں۔ میں سزا کی مستحق ہوں۔ لیکن میرے مالک اپنے بچے کی تکلیف نہیں دیکھی جاتی۔

اِس معصوم کو لحہ بہ لحہ موت کی طرف بڑھتا ہوا میں نہیں دیکھ سکتی۔

زرقون! اللہ میاں میں نے اپنی دانست میں زری کے ساتھ بہت برا کیا۔ میں ساری زندگی اُس کی حسد کی آگ میں جلی اور اُس نے میرے رویوں پر صبر کیا۔ یا اللہ! کیا مجھے زری کا صبر لے ڈوبا۔ یا اللہ...... مجھے معاف کردے۔ میں نے لوگوں کے لیے اپنی دنیا تو تباہ کی ہی تھی آخرت بھی برباد کرڈالی۔ اللہ مجھے معاف کردے۔ یا اللہ رحم کردے۔ میں اپنے گناہوں پر شرمندہ ہوں۔ صدقِ دل سے توبہ کرتی ہوں۔ یا اللہ میرے گناہ معاف کردینے کے قابل نہیں لیکن تیری رحمت میرے گناہوں سے زیادہ ہے۔ مجھے معاف کردے۔ یا اللہ! گھر گیا، کاروبار تباہ ہوا۔ ایک وقت کھانے کو ہے اور دوسرے وقت فاقہ ہے۔ چھوٹی موٹی موذی بیماریاں جان کو چمٹ گئیں۔

بال...... بال قرضے میں جکڑ گیا ہے۔ لوگ دروازے پر آکر گالیاں دے کر جاتے ہیں۔ کوئی دو روپے کا بھروسہ نہیں کرتا۔ زیور بک گیا، صورت، شکل خاک میں مل گئی۔

میرے مالک! اب نہیں سہا جاتا۔ میں اپنے بچے کے علاج کے لیے لاکھوں روپیہ کہاں سے لاؤں۔ میں اپنے بچے کو مرتا ہوا نہیں دیکھ سکتی۔ میری مدد کر میرے مالک، میری توبہ قبول کر۔ میری غیب سے مدد کر میرے آقا، میرے بچے کو بچالے۔ کوئی وسیلہ بنادے۔ کسی کو بھیج دے، میرے بچے کو بچالے۔ ثمینہ جائے نماز پر

سجدے میں گری رو رو کر ہر خطا معاف کرنے والے مالک سے رحم کی بھیک مانگ رہی تھی۔ تڑپ رہی تھی۔ اور پلنگ پر بیٹھا عرفان بھی سسک رہا تھا۔ ماں باپ کیا ہوتے ہیں۔ اولاد کے لیے اللہ اُن کے دل میں کتنی محبت اور پیار ڈالتا ہے۔ اُس کو آج احساس ہوا تھا جب اُس نے سب کچھ کھو دیا تھا۔ اُس کو رونے کے لیے کندھا چاہیے تھا۔ اُس کو زری کے کندھے کی شدت سے ضرورت تھی، اور زری......

☆......☆......☆

''بیٹا! میرا بچہ بہت تکلیف میں ہے۔ اُس کو تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔''

زرقون جو اسپتال کے بستر پر اپنے شیر خوار بچے کو سینے سے لگائے آنکھیں بند کیے ہی تھی)۔ فہمیدہ بیگم کی مخصوص خوشبو اور لمس کو محسوس کر رہی تھی۔ آج اُس کا بیٹا پیدا ہوا تھا۔ وہ لندن بچے کی پیدائش کے سلسلے میں آئی ہوئی تھی۔ فہمیدہ بیگم کی سرگوشی پر چونک کر پلٹی لیکن وہاں کوئی نہیں تھا لیکن سارے کمرے میں فہمیدہ بیگم کی خوشبو بسی ہوئی تھی۔ زری حیران اور گم صم سی چاروں طرف دیکھتی رہی۔ کوئی نہیں تھا۔ لیکن اُس کا دل کہہ رہا تھا کہ کوئی اُس کے آس پاس موجود ہے لیکن کون؟

''بیٹا اگر اولاد دنیا میں پریشان ہوں، تکلیف میں ہو، بے چین ہو تو ماں باپ کو قبر میں بھی چین نہیں آتا۔ مجھے عرفان کی تکلیفوں پر تکلیف ہوتی ہے۔ میرا دل اُس کے لیے بہت دکھی ہے۔'' نفیس احمد نے چشمہ اُتار کر حسبِ عادت اپنے بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر رکھا اور آنکھوں کے کنارے اٹکا وہ آنسو پونچھا جو اُن کا بھرم توڑنے کے لیے پوری کوشش کر رہا تھا۔

''لیکن ابا آپ جانتے ہیں نا کہ عرفان بھائی اور ثمینہ بھابی نے آپ کے ساتھ، امی کے ساتھ میرے اور موی کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔ ابا ایسے ایسے الزام انہوں نے میرے کردار پر لگائے ہیں۔ وہ سلوک کیا ہے کہ آج بھی جب نرم بستر پر لیٹتی ہوں تو اُن دنوں کی چبھن سونے نہیں دیتی۔ سارے خاندان میں ہماری عزت اُچھال کر رکھ دی۔'' زری نے پہلی دفعہ باپ کی بات سے اختلاف کیا۔

''بیٹا وہ تو اُس کی بیوی اور ساس نے کیا ہے نا۔ دیکھ لو اُس کی ساس کن حالوں میں پڑی ہے۔ بس بیٹا اللہ کافی ہے مظلوموں کی دادرسی کے لیے۔'' نفیس احمد نے غصہ ضبط کرتی، پہلو بدلتی، اپنی لاڈلی کو دیکھا۔

''ابا آپ کہا کرتے تھے جس سے تُو ناراض، اُس سے میں ناراض اور جس سے میں ناراض اُس سے میرا اللہ ناراض، اور آپ یہ بھی کیا کرتے تھے۔ جس سے تُو راضی اُس سے میں راضی اور جس سے میں راضی، اُس سے میرا اللہ راضی۔ میں اُن لوگوں سے سخت ناراض ہوں اور آپ راضی ہوگئے۔'' زرقون نے شفیق باپ سے شکوہ کیا۔

''بیٹا اولاد کے لیے اللہ نے ماں باپ کا دل بہت ہی عجیب مٹی سے بنایا ہے۔ جو ہمیشہ نرم رہتی ہے، گیلی رہتی ہے، نہ کبھی خشک ہوتی ہے اور نہ ہی سوکھتی ہے۔ میں اور تمہاری اماں عرفان کی طرف سے بہت پریشان ہیں۔ عبداللہ بہت بیمار ہے۔ بیٹا اصل سے زیادہ سُود پیارا ہوتا ہے۔ بیٹا مجھ سے اور تمہاری اماں سے عبداللہ کی تکلیف نہیں دیکھی جاتی۔ جب عرفان بچوں کے ساتھ بھوکا سوتا ہے تو تمہاری اماں پوری رات روتی ہیں۔ ہم دونوں نے اُس کو معاف کیا، ہر شخص کو معاف کیا جس نے ہمیں تکلیف دی۔ بیٹا اپنے بچوں کی تکلیف ماں باپ کو قبر میں بھی چین لینے نہیں دیتی۔'' نفیس احمد کی بولتے بولتے آواز بھرا گئی اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رو دیے۔

''ابا......امی!'' زرقون چیخ مار کر اُٹھ بیٹھی۔ اُس کا سانس پھول رہا تھا اور اُس کے آس پاس اُس کے ماں باپ کی مخصوص خوشبو مہک رہی تھی۔

''کیا ہوا میری جان!'' مرتضیٰ نے کپکپاتی زرقون کو بانہوں میں سمیٹتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا ڈر گئیں؟'' مرتضیٰ نے اُس کے صبیح چہرے پر سے بال سمیٹتے ہوئے ملائمت سے پوچھا۔

''مرتضیٰ میں پاکستان جانا چاہتی ہوں۔'' زری کا لہجہ مستحکم تھا۔

☆......☆......☆

''آپ کر چکے بکواس۔'' مرتضیٰ نے ٹیلیفون کو گھورتے ہوئے غراتے لہجے میں کہا۔

''سنیں مسٹر XYZ۔'' مرتضیٰ نے اپنے آپ کو پُرسکون رکھتے ہوئے کہا۔

''فراز!'' دوسری طرف لہجہ دل جلاتا سا تھا۔

''او کے، او کے مسٹر فراز! یہ جتنی بھی آپ نے گھٹیا باتیں کی ہیں نا۔ اُس سے بھی زیادہ مجھ کو پتا ہیں۔ شادی سے پہلے بھی معلوم تھا اور میری بیوی نے خود مجھے بتایا ہے۔ مسٹر فراز ایک بات یاد رکھیے گا کہ زرقون نہ اب اکیلی ہے اور نہ ہی کمزور۔ اور جس بات کو آپ محبت کررہے ہیں، وہ محبت کہاں تھی؟ کیا آپ محبت کے معنیٰ سے واقف ہیں۔ محبت نفع ونقصان سے عاری ہوتی ہے۔ محبت بس محبت ہوتی ہے۔ اور محبت کیا ہوتی ہے وہ آپ جیسے خود غرض، مفاد پرست اور سطحی ذہن رکھنے والے نہ جانتے ہیں اور نہ ہی سمجھ سکتے ہیں۔ بات صرف اتنی ہے کہ آپ جیسے معمولی لڑکے کو کوئی لفٹ نہیں کرواتا تھا تو آپ زری کے اردگرد گندی مکھی کی طرح منڈلاتے رہتے تھے اور جب آپ کو، آپ کی ذہنیت کے مطابق، تھوڑا سا بہتر آپشن نظر آیا تو آپ ایک پالتو کتے کی طرح دم ہلاتے ہوئے اُس طرف چل دیے۔ ارے ہاں یاد آیا۔ مجھے میری بیوی نے بتایا تھا کہ آپ کی بیگم صاحبہ نا صرف یہ کہ آپ کو ایک ملازم اور پالتو جانور سمجھتی ہیں بلکہ اُسی طرح آپ کو رکھتی بھی ہیں۔ آپ صرف دم دہلاتے پھریں۔ یہی آپ جیسے لوگوں کا انجام ہونا چاہیے۔ اور یاد رکھیے زری ایک شریف لڑکی ہے، شریف خاندان کی بیٹی اور ایک بہت شریف خاندان کی بہو ہے۔ اُس کی شادی ایک مرد سے ہوئی ہے، جو اپنی بیوی کا خیال بھی رکھ سکتا ہے اور اُس کی حفاظت بھی کرسکتا ہے اور جو اُس سے، اُس کے کردار سے اُس کی پاکیزگی اور معصومیت سے بہت محبت کرتا ہے۔

آئندہ اگر آپ نے اپنی گندی زبان سے زری کا نام لیا، یا اُس کو فون کیا یا کسی قسم کی بلیک میلنگ کی تو یاد رکھیے آپ کی بیوی تو آپ کو پالتو کہتی ہی ہے میں آپ کو روڈ پر جانور کی طرح ماروں گا۔'' مرتضیٰ نے غراتے ہوئے اپنی بات مکمل کی اور فون بند کردیا۔

''بس میری جان! بس کوئی وضاحت نہیں۔ میچور عمر کی محبت اور کم عمری کی وابستگی کو میں اچھی طرح سمجھتا ہوں۔'' مرتضیٰ نے اپنے مضبوط بازوؤں کے حصار میں ڈری سہمی، زری کو سمیٹتے ہوئے محبت سے کہا اور زری نے مطمئن ہو کر اُس کے سینے میں سر چھپالیا۔

کسی نے کیا خوب کہا ہے۔ بیوقوف عورت اپنے شوہر کو غلام بناتی ہے اور پھر ساری زندگی ایک غلام مرد کی بیوی بن کر گزار دیتی ہے۔ اور عقلمند عورت اپنے شوہر کو بادشاہ بناتی ہے اور پھر ساری زندگی ایک بادشاہ کی ملکہ کی طرح گزارتی ہے۔ اور اِس لمحے زری کو اپنے سر پر ایک اَن دیکھا تاج جگمگاتا ہوا محسوس ہورہا تھا۔

☆......☆......☆

ایسی ذلت، ایسی بے عزتی...... فراز کا پورا وجود پسینے میں بھیگ گیا۔ اُس نے ایک بار پھر فون کو دیکھا، جس کے برقی تاروں کے دوسری طرف وہ مرد تھا، جو زرقون سے واقعی محبت کرتا تھا۔

پھر اُس نے خاموشی سے فون رکھ دیا کہ محبت میں لالچ نہیں ہوتی اور جو لوگ محبت میں خود غرض ہو جاتے ہیں اور لالچ کرتے ہیں اُن کا یہی انجام ہوتا ہے۔

''دھوبی کا کتا نہ گھر کا نہ گھاٹ کا۔'' اُس کے ضمیر نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا اور اُس نے گھبرا کر دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ لیے۔ اور سارے کمرے میں صرف یہی ایک جملہ گونجنے لگا۔

دھوبی کا کتا نہ گھر کا نہ گھاٹ کا، دھوبی کا کتا، دھوبی کا کتا، دھوبی کا......

☆......☆......☆

ایئر پورٹ پر بہت گہما گہمی تھی۔ ہر طرف ایک چہل پہل تھی۔ زری نے بے قراری سے باہر آتے مسافروں کو دیکھا۔ ابھی ابھی سنگاپور سے فلائٹ آئی تھی۔ اُس نے ہاتھ میں پکڑی فائل کو اپنے سینے سے لگایا تو نہ جانے کیوں اُس کو ایک عجیب سا اطمینان اور سکون محسوس ہوا۔ اُس کے ساتھ آج مسز روحی جنید، جنید صاحب، حیا، مرتضیٰ، مومی اور نرگس تھیں۔

''میرا عبداللہ!'' اُس نے آگے بڑھ کر عرفان کی گود میں مسکراتے عبداللہ کو گود میں سمیٹ لیا۔

ثمینہ اور عرفان پُرسکون چہروں کے ساتھ کھڑے تھے۔ ماں باپ کی بے قراری دیکھتے ہوئے زرقون نے اپنے وسائل استعمال کرتے ہوئے عبداللہ کو علاج کے لیے سنگاپور بھیجا تھا اور آج وہ سرخرو ہوگئی تھی۔ اللہ کے فضل وکرم سے عبداللہ صحت یاب ہو گیا تھا۔

زرقون کے اردگرد اُس کے اپنے تھے، اُس کے چاہنے والے تھے اور وہ خود...... عرفان نے اپنے اِردگرد دیکھا۔ کیسا اکیلا تھا۔ اُس کا دل بھر آیا۔ لیکن اِس تنہائی میں کس کا قصور تھا، وہ جانتا تھا۔

''بھائی آپ نے گھر بیچ دیا۔ وہ میری امی کا گھر تھا۔ وہ میرا اور مومی کا میکہ تھا۔ میں نے رُخصتی کے وقت ایک مکان کے کاغذات نہیں بلکہ آپ کو اپنا میکہ تھمایا تھا۔ میں نے وہ گھر دوبارہ خرید لیا ہے۔ آپ میرا میکہ مجھے لوٹا دیں۔'' زرقون نے ساکت کھڑے بھائی کے سینے سے لگ کر کہا۔

''زری تم مجھے معاف کر دو۔ میں نہ اچھا بیٹا بن سکا اور نہ ہی اچھا بھائی، اور تم نے جو کچھ میرے لیے کیا اور میرے بچے کے لیے کیا۔ اگر میں اپنی جان بھی قربان کردوں تو اُس کی قیمت ادا نہیں کر سکتا۔''

عرفان نے سینے سے لگی خاموشی سے آنسو بہاتی زرقون اور بازو سے لپٹی مومی کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے گلوگیر لہجے میں کہا۔

''میں تم سے وعدہ کرتا ہوں میں تمہارا میکہ تم کو لوٹا دوں گا۔ اُسی مان اور احترام کے ساتھ جو ایک بیٹی کی خواہش ہوتی ہے۔'' عرفان کے لہجے میں سچائی تھی۔ روحی جنید نے اپنے آنسو خشک کیے اور حیا نے محبت سے عبداللہ کو گلے لگا لیا۔

''ہمیں معاف کردو زری۔ میں نے تمہارے ساتھ، تمہارے ماں باپ کے ساتھ بہت برا سلوک کیا لیکن آج احساس ہوا، ابا تم کو صحیح گوہر نایاب کہتے تھے۔ اُن کو اپنی تربیت، اپنے خون پر صحیح فخر تھا۔ میں تم کو بدنصیب

کہتی تھی۔ تم کہاں سے بدنصیب تھیں۔ ہم سب تمہارے نصیب کی روٹیاں کھا رہے تھے اور تمہارا میکہ، تمہارا منتظر ہے۔ زری اللہ کے واسطے مجھے معاف کردو۔ جب تک تم مجھے معاف نہیں کروگی، ہم پریشانیوں کی دلدل میں دھنستے چلے جائیں گے۔ دُکھ اور تکلیف کی بیڑیاں ہمارے پیروں سے لپٹی رہیں گی۔ میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ زری کچھ تو بولو۔'' ثمینہ نے روتے ہوئے خاموش کھڑی زری کے آگے ہاتھ جوڑے۔

''معاف کرنا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ انسان دکھوں اور یادوں کو دفن کرتا ہے۔ یادوں کے تابوت میں خون کے آنسوؤں میں ڈوبی کیلیں ٹھونکتا ہے۔ میرے لیے زندگی کی وہ تلخیاں بھلانا مشکل ہی نہیں ناممکن ہیں۔ میری امی، میرے ابا، میرا بھائی، میرا گھر، میرا خاندان، میری اَنا، میری عزت، میری خوشیاں، میری زندگی، کس کس چیز کو بھولوں گی لیکن اللہ معاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔''

''بس تم ہر بات بھول جاؤ۔ بس پہلی والی زری بن جاؤ۔ میری بہن۔'' عرفان نے محبت سے اُس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں کی گرفت میں لیا۔

اُس نے ایک سرد نگاہ اُس بھائی پر ڈالی جس سے وہ بہت محبت کرتی تھی، جو اُس کی امی کا لاڈلا تھا، جس کا تلخ رویہ اُس کے ابا کو رُلا دیتا تھا۔

''آپ بہو بیگم کو سمجھائیں۔'' جنید صاحب نے تذبذب کا شکار بیٹھی زرقون کو دیکھتے ہوئے آہستہ سے روحی کے کان میں کہا۔ اِس وقت وہ سب عرفان کے چھوٹے سے گھر میں بڑا دل لے کر بیٹھے تھے۔

روحی نے آہستہ سے نفی میں سر ہلایا۔ وہ چاہتی تھیں، زری خود فیصلہ کرے۔ اُن کی بہو بہت سمجھدار اور نیک فطرت تھی۔ وہ جانتی تھیں۔ لیکن اُس پر کیا کیا بیتی تھی۔ اِس کا اندازہ اُن کو آج ہو رہا تھا۔

''معاف کردینے سے زیادہ بھول جانا مشکل ہے۔ میں نے آپ کو معاف کیا۔ میرے اللہ نے آپ کو معاف کیا۔ میں نے اپنا فیصلہ اللہ کی رضا کے لیے بدل دیا ہے۔ لیکن بھول جانا بہت مشکل ہے۔ پہلے جیسی ہوجانا اُس سے بھی زیادہ مشکل ہے۔ میں کمپیوٹر نہیں ہوں جس کا آپ سوئچ آف کردیں اور جب دل چاہے سوئچ آن کردیں۔ میں ایک جیتی جاگتی انسان ہوں، گوشت پوست سے بنی، احساسات، محبت اور جذبات سے گندھی، میرے دل کو تھوڑا وقت چاہیے۔ ماں باپ بہت قیمتی ہوتے ہیں۔ بھابی کی امی بہت تکلیف میں ہیں۔ آپ اُن کو واپس لے آیئے گا۔'' کہتے ہوئے زری کھڑی ہوگئی۔ اُس نے روحی کا ہاتھ پکڑا۔ اُس کے ساتھ ساتھ سب لوگ کھڑے ہوگئے، اُس نے نظر اُٹھا کر اوپر کی طرف دیکھا۔ ابا کے کمرے کی کھڑکی صحن میں کھلتی تھی۔ اُس کو ایسا لگا کھڑکی میں کھڑے ابا اور کچن میں کھڑی امی مسکرا رہی ہیں۔ اُس کے دل نے فہمیدہ بیگم کو اُن کا گھر ملنے پر مبارکباد دی اور اُس کے ساتھ ساتھ سب باہر نکل گئے۔

''تم بہت عظیم ہو زری! خدا پر بھروسہ کرنے والوں کو اللہ اتنا ہی سرخرو کرتا ہے۔ میں انشاء اللہ تمہارا دل اور بھروسہ ایک دن ضرور جیت لوں گی۔ اللہ توبہ کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ میں تمہارے احسانوں میں جکڑی ایک حقیر اور معمولی عورت، اپنے اللہ سے وعدہ کرتی ہوں۔'' دروازے پر کھڑی گلی سے باہر نکلتی لینڈ کروزر پر نظریں جمائے ثمینہ نے جیسے اپنے آپ سے عہد کیا۔ اندر سے عبداللہ اور عرفان کی ہنسی کی آواز آرہی تھی۔

زرقون نے بیک مرر میں دروازے پر کھڑی ثمینہ کو دیکھا اور مرتضٰی کے کندھے پر سر رکھ کر آنکھیں موندلیں۔

☆......(ختم شد)......☆

کچھ باتیں آئینہ، عکس اور سمندر کے اختتام پر

محترمہ منزہ سہام صاحبہ، جناب کاشی چوہان اور قابلِ قدر قارئین

السلام علیکم!

الحمداللہ آئینہ، عکس اور سمندر کی آخری قسط آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ یہ میرا پہلا ناول ہے۔ اِس کو لکھوانے کا سہرا ادارہ دوشیزہ اور خاص کر محترم کاشی چوہان کو جاتا ہے۔ جب کاشی نے مجھ سے ناول لکھنے کو کہا تو میں نے کہا بھائی میں نہیں لکھ سکتی۔ انہوں نے کہا، آپی مجھے یقین ہے کہ آپ لکھ سکتی ہیں اور آپ لکھیں۔ کاشی کے بے حد اصرار اور محبت نے مجھ سے ناول لکھوالیا۔ کوئی بھی چیز پرفیکٹ نہیں ہوتی، یقیناً اِس ناول میں بھی بہت سی کمزوریاں اور خامیاں ہوں گی۔ لیکن کمزوریوں اور خامیوں کے باوجود اِس ناول کو میں نے بے حد دل، محنت اور توجہ سے لکھا ہے۔ یہ ناول آپ کو کیسا لگا، میں آپ کی رائے کی منتظر رہوں گی۔

لوگ اکثر کہتے تھے ناول میں تکلیف دہ ذکر بہت ہے تو میں آپ سے کہتی ہوں، زندگی خوشی اور دُکھ کا امتزاج ہے۔ جب لوگ تقدیر کے فیصلے اپنے ہاتھوں میں لینے کی کوشش کرتے ہیں تو اُن کی زندگی کس طرح مسخ ہوجاتی ہے۔ یہ ناول اُن لوگوں کی عکاسی کرنے کے ساتھ، اُن کی زندگی کی بھی ترجمانی کرتا ہے۔ جن کا صبر......اور اللہ پر بھروسہ اُن کی زندگیوں کو پھولوں کی رہگزر بنا دیتا ہے۔ میں آپ سب کا ایک بار پھر شکریہ ادا کرتی ہوں کہ اِن 23 ماہ میں آپ میرے ساتھ رہے۔ آئندہ بھی آپ کے ساتھ اور محبت کی ضرورت رہے گی۔

آپ کی اپنی

عقیلہ حق

بانو قدسیہ

اب تک اسے کبھی کبھی امید سی بندھ جاتی تھی کہ اب نانا نے ہتھیار ڈالے کہ ڈالے لیکن صبح کی گفتگو سن کر وہ بالکل مایوس ہو چکی تھی۔ اب اس کے جی میں اٹیچی کیس کھولنے اور تصویر دیکھنے کی تمنا کے سوا اور کچھ نہ رہا تھا لیکن کبھی اٹیچی کی چابی نہ ملتی اور......

ذخیرہ ادب سے ایک یادگار انتخاب، جو لازوال ہے

یوں تو گھر میں کئی ایسے تالے تھے جن کی چابیاں کھو گئی تھیں اور کچھ چابیاں ایسی بھی تھیں جن کے تالے عرصے سے نہ ملتے تھے لیکن کنجیوں کے چاندی ایسے چمکتے چھلے میں کسی اٹیچی کیس کی ایک
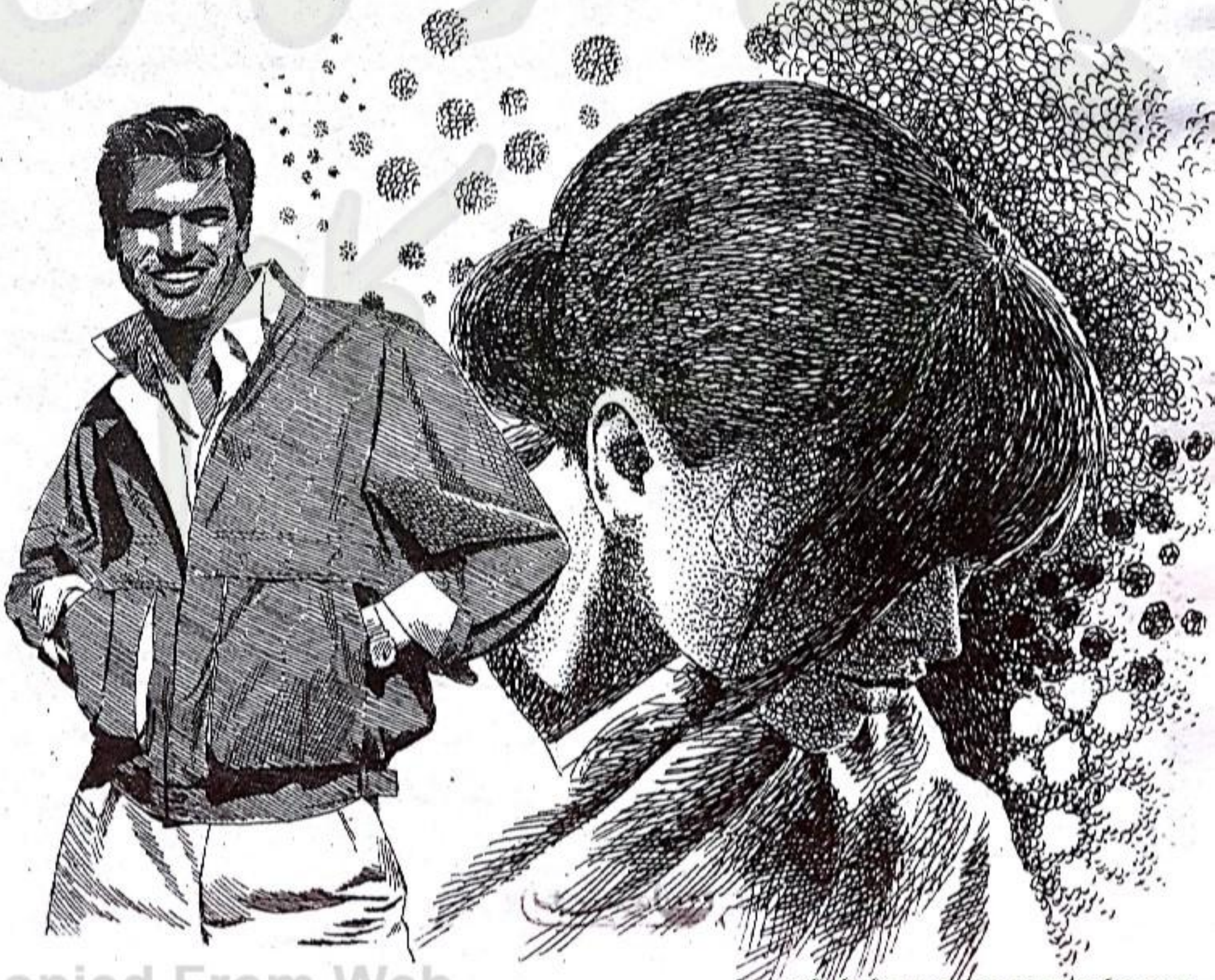
ایسی منہ بند چابی بھی تھی جو بڑی بڑی چابیوں میں کھسکتی، جھولتی، بجتی یونہی چلی آرہی تھی۔ سوائے سلمیٰ کے، کوئی بھی نہ جانتا تھا کہ یہ چھوٹی سی چابی چھلے میں آئی تو کیسے آئی؟

خود سلمیٰ کو ایک عرصے تک علم نہ ہوسکا کہ منظور کی آمد پر سارے گھر کی فضا کیسے تبدیل ہوگئی؟ وہی نصیر بھائی تھے کہ ایسے اسمارٹ، ایسے خوب صورت، ایسے پیارے لگتے تھے اور وہی نصیر بھائی تھے کہ بارش میں بھیگتے ہوئے بازاری کتے کی طرح ان کی ساری شخصیت کان لپیٹے پھرنے لگی تھی اور تو اور، سلمیٰ کو تو یوں محسوس ہوتا تھا کہ ساری دیواریں اور لمبی ہوگئی ہیں، کمرے کچھ پھیل گئے ہیں اور منڈیریں نیچے کو لٹک آئی ہیں۔

منظور کی آمد سے پہلے سلمیٰ اس دومنزلہ مکان کی شہزادی تھی۔ وہ کینگرو کے لاڈلے بچے کی طرح تھی جسے گھر کے تمام افراد حسب توفیق اپنی اپنی پوٹ میں چھپائے پھرتے تھے۔ امی ابا کی تو خیر، وہ لاڈلی تھی ہی لیکن اپنے چچازاد کی آنکھ کا تارا بننا آسان کام نہ تھا۔ نصیر بھائی تو ایسے نقاد واقع ہوئے تھے کہ صاف ستھری پلیٹ میں انگلی پھیر کر کہیں سے مٹی نکال لاتے تھے۔ حیرانی کی بات ہے کہ عمر کے ساتھ ساتھ وہ نصیر بھائی کو بھی عزیز ہوگئی تھی، اب نہ تو انہیں میلے چیکٹ پیروں پر اعتراض رہا تھا اور نہ اونچی ایڑی کی جوتی پہننے پر۔ اتنی بڑی فتح کے بعد منظور صاحب جب اس گھر میں آئے تو سلمیٰ کو محسوس ہوا کہ ساری کائنات گھوم رہی ہے اور گھومتے گھومتے صابن کے بلبلے کی طرح پھوٹ جائے گی۔

منظور صاحب اس گھر میں کیوں آئے، اس کی کئی وجوہات تھیں۔ ایک تو وہ نصیر بھائی کے دوست تھے، دوسرے بڑے شہروں میں آسانی سے رہائش کو جگہ نہ ملتی تھی۔ اس کے علاوہ منظور صاحب امی کے دور کے رشتے دار تھے اور حساب لگانے پر سلمیٰ نے اندازہ لگایا تھا کہ وہ ایک طرح اس کے نانا تھے۔

سلمیٰ کو اس رشتے پر تو کوئی اعتراض نہ تھا لیکن مشکل یہ تھی کہ منظور صاحب اتنی کم عمری میں بالکل ناناؤں کی سی حرکتیں کرتے تھے۔ ان کی آمد سے پہلے سلمیٰ کا خیال تھا کہ اس گھر میں سوائے اس کے، کسی اور کو خود پسند ہونے کا حق نہیں پہنچتا۔ اس کی رائے اٹل ہے، اس کی خواہش حکم لیکن جب منظور صاحب وارد ہوئے تو سلمیٰ کو پتا چلا کہ اس کی چھوٹی سے جھیل میں کہیں سے سمندر کا مینڈک آٹپکا ہے۔ ہر بات پر طنزیہ مسکراہٹ، ہر لمحہ ماتھے پر تیوریاں۔

بھلا یہ بھی کبھی کسی نے سنا تھا کہ سلمیٰ نے نیلا سوٹ پہنا ہو اور گھر کے سارے لوگ ماشاء اللہ، ماشاء اللہ، نہ کرتے پھریں۔ اس روز تو اور بھی قیامت آگئی۔ نیلے سوٹ کے ساتھ اس نے سیاہ چوڑیاں بھی پہن رکھی تھیں لیکن اتنا چھنکانے کے باوجود منظور نے اس کی طرف دیکھا ہی نہ تھا۔ جب کھانے کے بعد وہ ہاتھ دھونے کی لیے سلفچی پر جھکی ہوئی تھی تو منظور پاس کھڑا ہاتھوں پر صابن مل رہا تھا۔ سلمیٰ نے گیلی انگلی سے قمیص کی بانہہ اور اوپر کردی اور چھن چھن کرتی سیاہ چوڑیاں ایک دوسرے کے ساتھ کلائی پر اتر آئی تھیں لیکن نانا تیوری ڈالے صابن کی جھاگ کا گولا بناتا رہا، جیسے گولا بنانا ایسا ہی ضروری ہو اسی لیے تو سلمیٰ ہاتھ دھوتے ہی اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔ اسے احساس ہونے لگا تھا کہ اس گھر کا ماحول یکسر بدل گیا ہے۔

ماحول کے تبدیل ہونے سے وہ اس قدر پریشان نہ تھی، وہ تو صرف یہ چاہتی تھی کہ کسی طرح ایک بار نانا بھی نصیر بھائی بن جائے اور اسی طرح

جھوٹ موٹ کے روٹھوں کو مناتا رہے۔ اس نے ہر ممکن جتن کر دیکھا لیکن نانا اپنی رنگین ٹائیاں اور امریکن بش شرٹ پہنے متواتر تیوری چڑھائے اپنے کام پر جاتا رہا۔ آخر جب سلمٰی کے نیلے پیلے تمام سوٹ اپنی رنگینی کھو چکے اور جھیل کی مچھلی سمندری مینڈک کے سامنے ہار مان گئی تو ایک دن سلمٰی کو اس کی امی نے اوپر والی منزل کی صفائی کرنے بھیجا۔ نصیر بھائی کے کمرے سے آوازیں آ رہی تھیں۔ نانا اور وہ بڑے بجھے ہوئے انداز میں کسی کا ذکر کر رہے تھے۔ سلمٰی دروازے کی آڑ میں کھڑی ہو گئی۔ نصیر بھائی کہہ رہے تھے۔

''تعجب ہے کہ وہ تم سے اس قدر مختلف ہے!''

پھر نانا بولا۔ ''ہاں' سبھی کہتے ہیں' اس کا رنگ بالکل صاف ہے اور میں تمہارے سامنے ہوں' ویسے وہ ذرا موٹی ہے۔''

''کاش' تم مجھے اس کی کوئی فوٹو دکھا سکتے۔'' نصیر نے کہا۔

''میری اٹیچی کیس میں ہے' شام کو دکھاؤں گا۔''

اب نصیر بھائی نے لمبی سانس لی اور بڑے افسوس سے بولے۔ ''میں تو حیران ہوں' تم زندہ کیسے ہو؟''

نانا نے بڑی دیر تک اس بات کا جواب نہ دیا پھر جیسے اپنے آپ سے بولا۔ ''جب پانی سر سے گزر جائے تو انسان زندہ رہنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔''

سلمٰی کو اس بات کی قطعی امید نہ تھی' سارا دن وہ بستر پر پڑی روتی رہی۔ اب تک اسے کبھی کبھی امید سی بندھ جاتی تھی کہ اب نانا نے ہتھیار ڈالے کہ ڈالے لیکن صبح کی گفتگو سن کر وہ بالکل مایوس ہو چکی تھی۔ اب اس کے جی میں اٹیچی کیس کھولنے اور تصویر دیکھنے کی تمنا کے سوا اور کچھ نہ رہا تھا لیکن کبھی اٹیچی کی چابی نہ ملتی اور کبھی منظور کمرے میں موجود ہوتا۔

اس شام بادل چھائے ہوئے تھے نصیر اور منظور سینما دیکھنے جا چکے تھے۔ آج سلمٰی نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ نصیر سے ضرور ملے گی اور اس کی تسلی کر دے گی کہ وہ اس سے شادی کرنے کا فیصلہ کر چکی ہے۔ اتنا بڑا فیصلہ کر چکنے کے باوجود اس کی ساری توجہ اس اٹیچی کیس کی طرف تھی جس میں کسی گوری اور موٹی لڑکی کی تصویر تھی۔ جب اندھیرا خاصا ہو گیا اور چیزوں کے ہیولے دھندلا گئے تو وہ اوپر والی منزل میں گئی۔ اس نے منظور کے سرہانے تلے' کتابوں کی میز پر' سنگھار میز کی درازوں میں غرض کہ ہر جگہ اٹیچی کیس کی چابی تلاش کی لیکن اس نیم اندھیارے میں اسے چابی نہ ملی' ہار کر وہ اٹیچی کیس کے پاس پہنچی تو اسے محسوس ہوا کہ جیسے سارا دن غوطے مارتی رہی ہو اور ایک بھی سیپ ہاتھ نہ آئی اور اب کوئی البیلی موج آپ ہی آپ اس کے قدموں میں سیپیوں کا ڈھیر لگا گئی ہے۔ اٹیچی کیس کے تالے میں ایک منہ بند کلی ایسی چابی لگی ہوئی تھی۔

سلمٰی نے اٹیچی کیس کھولا' اندر کئی الجھی ہوئی ٹائیاں' رنگین ریشمی رومال' رسالے' خط اور الٹی سیدھی چیزیں آپس میں گڈمڈ پڑی تھیں۔ سلمٰی کو اس اٹیچی کیس کی چیزوں کو سنوارنے کا کس قدر ارمان تھا' اس نہ پوری ہونے والی تمنا کو یاد کرتے اس کی آنکھیں بھیگ سی گئیں۔ اس نے اٹیچی کے نیچے بچھائے ہوئے اخبار کو دھندلی نظروں سے دیکھ کر اٹھایا تو ایک تصویر اس کے ہاتھوں میں آ گئی۔ شام کے اندھیرے میں اسے یہ لڑکی اور بھی پراسرار اور خوب صورت نظر آئی۔

ابھی وہ اچھی طرح سے تصویر دیکھ بھی نہ پائی تھی کہ سیڑھیوں پر قدموں کا شور اٹھا۔ اس نے جلدی سے تصویر اخبار تلے رکھی' گڈمڈ ٹائیاں اور رومال اندر

ٹھونسے اور اٹیچی کا ڈھکنا بند کر دیا لیکن اٹیچی کی چابی اس کی بھیگی بھیگی ہتھیلی میں ہی رہ گئی جب منظور اور نصیر اندر آ گئے۔ وہ جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی اور مٹھی بھینچ کر بولی۔ ''جی' آپ نے امی کی چابیاں تو نہیں دیکھیں؟''

منظور نے کمرے کی بتی چٹک سے جلائی اور بولا۔ ''جی' امی کی چابیاں؟''

''شام سے نہیں مل رہی ہیں۔ امی کہتی تھیں کہ صبح وہ ادھر ہی آئی تھیں۔''

''دیکھ لیجیے' شاید یہیں کہیں ہوں۔''

لیکن وہ چابیاں ڈھونڈنے کے بجائے مٹھی میں سیپ کا موتی چھپائے نیچے اتر آئی۔

سلمیٰ کو کبھی بھی یہ خیال نہ آیا تھا کہ عین اُسی دن منظور ان کا گھر چھوڑ کر چلا جائے گا۔ جب وہ اپنے کمرے میں بیٹھی تھی تو منظور بغیر دستک دیے اندر آ گیا' اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور وہ نصیر بھائی کی طرح ہانپ رہا تھا۔

''بہت بہت مبارک ہو سلمیٰ!'' وہ بولا۔ ''افسوس' میں رات کی تقریب پر یہاں نہ ہوں گا ورنہ......''

''آپ جا رہے ہیں؟'' سلمیٰ نے حیران ہو کر پوچھا۔

''جی۔''

''کیوں؟''

''اس لیے بھئی کہ ہم تمہارے نانا ٹھہرے اور نانا ایسی تقریبوں پر آبدیدہ ہو جایا کرتے ہیں اور سلمیٰ، تم نے میری اٹیچی کی چابی تو نہیں دیکھی کہیں؟''

اس کے جی میں آیا کہ تکیے تلے سے چابی نکال کر اس کے سامنے پھینک دے لیکن وہ نفی میں سر ہلا کر بولی۔ ''نہیں' میں نے تو دیکھی نہیں' کھو گئی کیا؟''

منظور کی تمام تیوریاں جیسے آنکھوں میں آنسو بن کر پھیل گئیں اور وہ آہستہ سے بولا۔ ''آپ چابی کو پوچھتی ہیں' یہاں پتا نہیں کیا کیا کھو گیا ہے۔''

سمندری مینڈک کو یوں باتیں کرتا دیکھ کر سلمیٰ کا دل دھک دھک کرنے لگا۔

''اور ہاں' نصیر تو پتا نہیں کب آئے گا' اسے میرا سلام اور مبارک باد دیجیے گا۔ یہ تصویر ہے' اس کے پیچھے میں نے تمام تفصیلات لکھ دی ہیں' نصیر سے تاکید کیجیے گا کہ ضرور اس کا پتا لگوائے۔''

سلمیٰ نے بڑھ کر تصویر ہاتھ میں لے لی اور اس کا چہرہ مجسم سوال بن گیا۔

منظور نے لمبی سانس لی اور آہستہ سے بولا۔ ''ایک یہ دکھ ہی کیا کم تھا کہ اپنی اکلوتی بہن کو فسادات میں کہیں کھو آیا' اب نیلا سوٹ اور کالی چوڑیاں بھی چھوڑنا پڑیں۔''

سلمیٰ کے لبوں کے کنارے کانپنے لگے اور وہ بہ مشکل بولی۔ ''آپ کی بہن کی تصویر ہے؟''

منظور نے کندھے جھٹکے اور آہستہ سے اعتراف کیا۔ ''جی۔'' پھر جیسے اپنے آپ سے کہنے لگا۔ ''پانی سر سے گزر جائے تو انسان زندہ رہنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔''

ایسے کئی واقعات ہر انسان کی زندگی میں ہوتے ہیں' ان ننھی ننھی' موج دار وارداتوں کا گھاؤ آپ ہی آپ مندمل ہو جاتا ہے لیکن یہ کون جانتا ہے کہ چاندی کے چمکتے چھلے میں ایک ایسی منہ بند چابی بھی ہے' جسے گھماتے گھماتے سلمیٰ کبھی بہت دور جا نکلتی ہے اور اس کا چھوٹا سا بچہ اس کی ٹھوڑی پکڑ کر پوچھتا ہے۔

''کیا بات ہے امی؟''

اور وہ چابی کو مٹھی میں بھینچ کر کہتی ہے۔ ''کچھ بھی نہیں...... کچھ بھی تو نہیں...... میرے لال!''

☆☆......☆☆

دوشیزہ میگزین

- رنگِ کائنات
- دوشیزہ گلستاں
- نئے لہجے، نئی آوازیں
- یہ ہوئی نا بات
- لولی وُڈ، بولی وُڈ
- نفسیاتی اُلجھنیں اور اُن کا حل
- کچن کارنر
- حکیم جی!
- بیوٹی گائیڈ

دوشیزہ گلستان

اسماء اعوان

فرمانِ الٰہی

جولوگ ان سے پہلے گزرے ہیں انہوں نے بھی تو (دینِ حق کو) جھٹلایا تھا، پھر دیکھ لو میرا (یعنی اللہ تعالیٰ کا) عذاب کیسا رہا۔ کیا یہ لوگ اپنے اوپر اڑنے والے پرندوں کے پر پھیلائے ہوئے (اڑتے پھرتے) اور (اسی حالت میں پروں کو) سمیٹتے ہوئے نہیں دیکھتے؟ اللہ کے سوا کوئی اور نہیں جو انہیں تھامے ہوئے ہو، بے شک وہ ہر چیز کو دیکھ رہا ہے۔

سورۃ الملک 67 ترجمہ آیات 18 تا 19

حدیثِ نبوی

حضرت سراقہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ان سے فرمایا۔ ''سراقہ! کیا میں تمہیں اہل جنت اور اہل جہنم کے بارے میں نہ بتاؤں؟ عرض کیا۔ کیوں نہیں، یا رسول اللہ (ﷺ)۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا جہنمی تو وہ ہر شخص ہوگا جو سخت دل، تند خو اور متکبر ہوا اور جنتی وہ لوگ ہوں گے جو کمزور اور مغلوب ہوں گے۔

(مسند احمد بن حنبل)

فرمانِ قائد

قدرت نے آپ کو ہر چیز عطا کی ہے۔ آپ کے پاس لامحدود وسائل ہیں آپ کی مملکت کی بنیاد پڑ چکی ہے۔ اب یہ آپ کا کام ہے کہ اسے تعمیر کریں اور جلد از جلد تعمیر کریں۔ سو آگے بڑھیے۔ میں دعا کرتا ہوں کہ خدا آپ کو کامیابی عطا فرمائے۔ (پاکستان کی پہلی سال گرہ کا پیغام...... 14 اگست 1948ء)

کیسے کیسے لوگ

☆ کچھ لوگ دعاوں کی طرح ہوتے ہیں۔ ابھی ہم سجدے میں سر جھکاتے ہی ہیں کہ آنسوؤں کی طرح آنکھوں سے ٹپک پڑتے ہیں۔

☆ کچھ لوگ آنکھوں کی طرح ہوتے ہیں۔ وہ ساتھ ہوں تو اندھیروں میں بھی روشنی ہونے لگتی ہے۔

☆ کچھ لوگ گھروں کی طرح ہوتے ہیں۔ ہم کہیں بھی ہوں دل ان کی روح میں سمٹ جانے کو بے چین رہتا ہے۔

☆ کچھ لوگ گھروں کی طرح ہوتے ہیں۔ ہم کہیں بھی ہوں، دل ان کی روح میں سمٹ جانے کو بے چین رہتا ہے۔

☆ کچھ لوگ خطوں کی طرح ہوتے ہیں جن کو بار بار بھی پڑھ کر دل نہیں بھرتا۔

حسنِ خیال: راحت وفا راجپوت۔ لاہور

احسان دانش

پاکستانی شعرائے کرام کی صف میں احسان دانش ایک منفرد خصوصیات کی حامل شخصیت ہیں۔ انہیں بجا طور پر ''شاعر مزدور'' کا نام دیا گیا ہے۔ 1994 میں یوپی کے شہر کاندھلہ، مظفر نگر کے ایک

انتہائی غریب گھرانے میں انہوں نے آنکھیں کھولیں تو والدین نے ان کا نام احسان الحق رکھا تھا۔ غربت کے باعث وہ صرف چوتھی جماعت تک تعلیم حاصل کر سکے۔ پھر تلاش روزگار میں ہندوستان کے مختلف شہروں کی خاک چھانتے رہے۔ اس دوران انہوں نے قلی، مزدور، مالی اور خوانچہ فروش کی حیثیت سے بھی کام کیا۔ فکر معاش 1928 میں انہیں لاہور لے آئی۔ اپنی زندگی کے کڑے دنوں کا ذکر انہوں نے اپنی خود نوشت ''جہانِ دانش'' میں بہت خوبصورت انداز میں کیا ہے۔ اپنی کتاب میں دیگر واقعات کے ساتھ یہ واقعہ خاص طور پر لکھا ہے کہ جس پنجاب یونیورسٹی کی ایک دیوار کی تعمیر میں انہوں نے راج مزدور کی حیثیت سے کام کیا تھا بعد میں اسی یونیورسٹی کی ایک تقریب میں انہیں خصوصی مہمان کا اعزاز دیا گیا تھا۔ احسان دانش نے شاعری، نثر، لسانیات، خودنوشت اور غالب کے اشعار کی تشریح پر 80 سے زائد کتابیں اور مضامین لکھے ہیں، تاہم ان کی تحاریر میں سے صرف پانچ فیصد ہی کتابی شکل میں سامنے آسکی ہیں۔ یہ شاعر مزدور 1982ء میں لاہور میں آسودہ خاک ہوا۔

مرسلہ: فاریہ انعم۔ کراچی

دعا

آؤ نئے سال کی صبح امید سے
پھر آس کی لو لگائیں ہم
ہر دکھ کا درد مٹا کر
پھر سے شمع محبت جلائیں ہم
صبح نو سے پہلے
شب بھر اپنی جھولی پھیلائیں
قوم کی بقاء کے لیے، امن کی فضا کے لیے
اپنا اپنا خستہ دامن پھیلائیں ہم
میری دعا ہے
ہر لمحہ! ہر پل!
خدا کرے اب کہیں کوئی آہ و فغاں نہ ہو
ہر بشر کی زندگی سکون سے گزرے
کبھی کوئی امتحان نہ ہو
میرے وطن پر بہار آئے
خدا کرے میری یہ دعا قبول ہو جائے۔

شاعرہ: نسیم نیازی

انمول موتی

☆ انسان کا دل توڑنے والا شخص اللہ کو تلاش نہیں کر سکتا۔

☆ حضور اکرمؐ کی بات پر کسی اور بات کو فوقیت دینا ایسے ہے جیسے شرک۔

☆ انسان جتنی محنت خامی چھپانے میں کرتا ہے اتنی محنت سے خامی دور کی جاسکتی ہے۔

☆ بہترین کلام وہ ہے جس میں الفاظ کم اور معنی زیادہ ہوں۔

☆ عروج اُس وقت کو کہتے ہیں جس کے بعد زوال شروع ہوتا ہے۔

☆ بچہ بیمار ہو تو ماں کو دعا مانگنے کا سلیقہ خود بخود آجاتا ہے۔

مرسلہ: شمیم بانو۔ بدین

یادداشت

ایک پروفیسر صاحب اپنے ایک ڈاکٹر دوست کے گھر پہنچے اور کافی دیر تک اس کے ساتھ گپ شپ لگاتے رہے۔ کھانے کا وقت ہوا تو انہوں نے وہیں کھانا بھی ایک ساتھ کھالیا۔ پھر شطرنج کی بساط بچھ گئی۔ کئی گھنٹے بعد جب پروفیسر رخصت ہونے لگے تو ڈاکٹر دوست نے رسماً پوچھا۔

''گھر پر تو سب خیریت ہے ناں؟''

پروفیسر نے چونک کر جواب دیا۔ ''خوب یاد دلایا تم نے۔ دراصل میں تمہارے پاس اس لیے آیا تھا کہ میری بیوی کو دل کا دورہ پڑ گیا ہے۔''

مرسلہ: عرفانہ نور۔ ماتلی

شناخت

ایک تربیتی سیمینار میں ''خود حفاظتی'' کا درس دیا جارہا تھا۔ کورس کے دوران ایک عملی مظاہرے کا اہتمام کیا گیا۔ چنانچہ اسٹیج پر سیاہ کپڑوں میں ملبوس ایک نقاب پوش نمودار ہوا اور راہ چلتی خاتون کے ہاتھ سے پرس چھین کر فرار ہوگیا۔ انسٹرکٹر نے حاضرین سے پوچھا۔

''کیا آپ میں سے کوئی اس نقاب پوش کا حلیہ بیان کرسکتا ہے؟''

ہال کی عقبی قطاروں سے ایک خاتون نے کھڑے ہوتے ہوئے جواب دیا۔

''جی ہاں! اس کا قد پانچ فٹ آٹھ انچ' وزن ایک سو پچاسی پونڈ' بال بھورے' آنکھیں نیلی اور چہرے پر مونچھیں ہیں۔''

انسٹرکٹر نے حیران ہوکر پوچھا۔

''آپ نے اتنی تفصیلات کس طرح جان لیں؟''

''بڑی آسانی سے۔'' خاتون نے جواب دیا۔

''کیونکہ وہ میرا شوہر ہے۔''

مرسلہ: عائشہ ناز۔ کوٹلی

بہترین ملازمت

مدت سے بے کار' آرام طلب شوہر نے گھر آکر نعرہ لگایا۔

''بہترین ملازمت' معقول تنخواہ مفت علاج آنے جانے کے لیے مفت سواری' رات کے اوور ٹائم کا ڈبل معاوضہ۔'' بیوی بھی عرصے کے بعد خوشگوار موڈ میں بولی۔

''واقعی یہ تو بڑی اچھی ملازمت ہے۔''

شوہر نے کہا۔ ''پھر تم تیار رہنا' تمہیں کل سے کام پر جانا ہے۔''

مرسلہ: فروا علی۔ لاہور

موتی مالا

☆ سب سے بڑی خواہش ہر انسان کو خوش کرنے اور اسے متاثر کرنے کی خواہش ہے اور اس کی سزا یہ ہے کہ انسان نہ متاثر ہوں گے اور نہ خوش۔

☆ دنیا کو جب رات کی تاریکی کے بعد روشنی میسر آتی ہے تو اس کی نظریں خود بخود آسمان کی طرف اُٹھ جاتی ہیں۔

☆ حقیقت آئینے کے عکس کی طرح ہے۔ آپ قریب ہو جاؤ' وہ قریب ہوتا ہے۔ آپ دُور ہو جاؤ' وہ دُور ہو جاتا ہے۔ آپ سامنے سے ہٹ جاؤ' وہ بھی ہٹ جاتا ہے۔

☆ ہم پرانے لوگوں کو یاد کرتے ہیں اور نئے لوگوں میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ ہم ماضی کو معیار بنا لیتے ہیں اور حال کی زندگی کو اس معیار پر لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہمیں سکون کیسے مل سکتا ہے؟ وہ لوگ چلے گئے' وہ زمانہ بیت گیا۔ اس کی یاد حال کو بدحال کردے گی۔

☆ جب انسان کے دل میں روشنی نہ ہو' وہ چراغوں کے میلے سے کیا حاصل کرے گا۔

واصف علی واصف کی نگارشات سے کشید کردہ

مرسلہ: حسنہ سلیم۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ

ٹین ایجر

وہ عورت تھی اور میں لڑکا
جب بھی میں نے اس کو دیکھا
قدرت کا شاہکار لگی وہ
لمبے کالے بالوں والی، لمبے اونچے قد کی مالک
اس کی ناک کا کچھ مت پوچھو
لمبی ستواں ناک میں اس کی
ہیرے کی ایک لونگ جڑی تھی
شاعر نے کیا خوب کہا تھا
چہرہ اس کا چاند کا ہالہ
سیاہ گھنیری پلکوں نیچے
آنکھوں میں وحشت کی ڈوری
جھرنوں جیسی لہجے والی
مخروطی انگلی میں اس کی جانے کس کے نام کا چھلا دمک رہا ہے
میں نے اس کو غور سے دیکھا...... پھر میں بولا
''غزلوں، نظموں، گیتوں جیسی سندر لڑکی
دل پہ مدھم مدھم دستک دینے والی کوئی رباعی'
ٹھہر گئی وہ
رک کر مڑ کر مجھ کو دیکھا

جھرنوں سی آواز میں بولی
''اوئین ایجر
مجھ سے آدھی عمر تمہاری
جا کر ڈھنگ کا کام کرو کچھ۔!!''

شاعرہ: ناہید فاطمہ حسنین

تبدیلی

ایک صاحب ایک ہوٹل میں کھانا کھایا کرتے تھے۔ ایک بار کہیں باہر چلے گئے۔ کئی دن بعد آئے اور اسی ہوٹل میں گئے اور کھانا کھاتے ہوئے بیرے کو بلایا اور پوچھا۔

''بھئی ہوٹل کا باورچی بدل گیا ہے کیا؟ کوئی بوڑھا ہے۔''

بیرے نے کہا۔''جی ہاں! بدل گیا ہے آپ کو کس نے بتایا؟''

''کسی نے نہیں۔'' انہوں ے جواب دیا۔''سالن سے پہلے کالے بال نکلا کرتے تھے۔ اب سفید بال نکلا ہے۔''

مرسلہ: ارما ثانی۔ کہوٹہ

برائے مہربانی

مشہور ارب پتی راک فیلر ایک دن اپنے دفتر سے اُٹھے تو انہیں ایک اجنبی نے روک کر اپنی دُکھ بھری داستان سنائی اور امداد کرنے کی درخواست کرتے ہوئے کہا۔

''مسٹر راک فیلر! میں بیس میل پیدل چل کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ راستے میں مجھے جتنے بھی لوگ ملے سب نے بتایا نیویارک میں آپ سے رحم دل کوئی نہیں۔''

راک فیلر نے پوچھا۔''کیا آپ اسی راستے سے واپس جائیں گے؟''

''اجنبی نے کہا۔''ہاں۔''

راک فیلر نے کہا۔''تو میرا ایک کام کردیجیے۔ براہِ مہربانی واپسی پر اس افواہ کی تردید کرتے جائیے۔''

اقبال حسین۔ کراچی

جواب آں غزل

ایک ڈاکٹر کی گاڑی خراب ہوگئی۔ وہ اسے گیراج میں لے گیا۔ مکینک نے کہا۔

''گاڑی کو نئے پرزوں کی ضرورت ہے۔''

اس نے پُرزے بدل دیے۔ گھر واپس آتے ہوئے ڈاکٹر نے گاڑی میں ایک اور خرابی محسوس کی۔ واپس گیراج میں گیا اور بڑے غصے میں مکینک سے کہا۔

''تم نے ہر چیز ٹھیک کیے بغیر آخر پیسے کیوں لیے ہیں؟''

''آپ ایسا کیجیے۔'' مکینک نے نہایت اطمینان سے جواب دیا۔''اپنے اسپتال جائیے اور دیکھیے کہ کیا ڈاکٹر مریض کو صحت یاب کرنے کے بعد فیس لے رہے ہیں۔''

مرسلہ: واجد ساجد۔ کراچی

بڑے لوگوں کی بڑی باتیں

- جب محبت کامل ہوجاتی ہے تو ادب کی شرط ختم ہوجاتی ہے۔ (حضرت جنید بغدادیؒ)
- نہ جھوٹی قسم کھاؤ' نہ اللہ تعالیٰ کے نام کو قسموں کے لیے تختہ مشق بناؤ۔ (حضرت ادریسؑ)
- سچی محبت ایک نایاب شے ہے لیکن سچی دوستی اس سے بھی نایاب ہے۔ (لارڈ کنوکا)
- اطمینان سب سے بڑا سکھ ہے اور بے اطمینانی سب سے بڑا دُکھ ہے۔ (ارسطو)
- اکثر لوگ اپنے بہترین دوستوں کی کمتری سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ (چیرفیلڈ)
- تکلف کی زیادتی محبت کی کمی کا باعث بنتی ہے۔ (امام غزالیؒ)
- ایک لمحے کی نفرت سال ہا سال کی محبت کو بُھلا دیتی ہے۔

مرسلہ: مہک مجید۔ ٹنڈو آدم

☆☆.....☆☆

نئے لہجے نئی آوازیں

غزل

تمہاری یاد میں جاناں زمانہ بھول جانا ہے
مجھے ہر موڑ پر اپنی محبت کو نبھانا ہے
جہاں ہم تم خوشی سے مسکراتے ساتھ رہتے ہوں
محبت کے لیے ایسا مجھے اک گھر بنانا ہے
تمہیں معلوم ہے ہم سے رہا اک پل نہیں جاتا
خفا ہو کر تمہیں ہم سے ہمارا دل جلانا ہے
مرے دکھ سے کسی کی آنکھ میں آنسو نہیں آئیں
زمانے کے لیے مجھ کو ہمیشہ مسکرانا ہے
ہمارے پاس بیٹھو تو تمہیں جی بھر کے دیکھیں گے
مری خواہش فقط تم کو نگاہوں میں بسانا ہے
خدا توفیق دے مجھ کو ہمیشہ خوش تمہیں رکھوں
تمہارے واسطے عادل مجھے مر کر دکھانا ہے
عادل حسین۔کراچی

لڑکیاں

یہ نادان لڑکیاں
کیوں گھر کے سپنے دیکھتی ہیں
اکثر گھر گھر کھیلتی ہیں
جانتی ہیں ٹوٹے ہوئے گھروں کے دکھ
پھر بھی خواب بنتی ہیں
اکثر ریت سمیٹ کے
تاج محل بناتی ہیں
اور اک دن
اک لہر کے آنے سے
ان محلوں کے ساتھ ساتھ
خود بھی ٹوٹ جاتی ہیں
پھر بھی آس لگاتی ہیں
یہ نادان لڑکیاں
یہ معصوم لڑکیاں

میرے جیسی لڑکیاں
سیدہ نور العین زاہرہ۔تلمبہ، چیچہ وطنی

سناٹا

جب ہر سُو چھا جاتا ہے مہیب، اندھیرا سناٹا
تب بج اٹھتی ہے تنہائی، گونج اٹھتا ہے سناٹا
دل کی نگری خالی خالی وحشت بھری ان آنکھوں میں
یاد نگر سے آتا ہے بن کر معمہ سناٹا
سورج کی ڈوبتی کرنوں سے اک درد نمایاں ہوتا ہے
تب چپکے سے بن جاتا ہے درد کا درماں سناٹا
جب یاد کے سونے آنگن میں دوری کا سورج جھلسائے
تب میرے لیے بن جاتا ہے ابر مہرباں سناٹا
تنہائی کے موسم میں یادوں کے پھول مہکتے ہیں
پھر مثلِ صبا روتا ہے درد بیکراں سناٹا
مومینہ بتول۔کراچی

ذلت وعزت

ذلت وعزت کا
اختیار تو
صرف خدا کے ہاتھ میں ہے
لیکن اس کی رعیت جو
خود محتاج ہے
اپنے مالک کی
اپنے ہی جیسے انسانوں سے
وہ!
یوں سلوک روا رکھتی ہے
جیسے وہ حاکم ہوں
اور دوسرے محکوم

ثمینہ عرفان۔کراچی

نیند نہیں آرہی!

رات آنکھوں میں کٹتی جارہی ہے اور نیند نہیں آرہی
چاند کی چاندنی گھٹتی جارہی ہے اور نیند نہیں آرہی
یہ کس کی یاد آئی کہ حوصلے ہی پست ہو گئے
شب آنسوؤں میں ڈھلتی جارہی ہے اور نیند نہیں آرہی
دربدر پھرنے کا شوق لے ڈوبے گا اک دن
زیست یوں ہی مٹتی جارہی ہے اور نیند نہیں آرہی
گزرے لمحوں کا حساب مانگیں تو کس سے مانگیں
اداسی آرزو سے الجھتی جارہی ہے اور نیند نہیں آرہی
اے چاند تارو! اب تو ابھرنے کو ہے آفتاب بھی
رات کروٹیں بدلتی جارہی ہے اور نیند نہیں آرہی
یہ منتظر نگاہیں اور ساتھ کرب شبِ غم
آس ہاتھ سے نکلتی جارہی ہے اور نیند نہیں آرہی
تجھے بھولنے کے سارے وعدے بیکار ہی نکلے
یاد تیری جانب پلٹتی جارہی ہے اور نیند نہیں آرہی
فصیحہ آصف خان۔ ملتان

ذرا موسم بدلنے دو

تجھے ہم بھول جائیں گے، ذرا موسم بدلنے دو
ابھی تو زخم گہرے ہیں
ابھی تو تیری یادوں کے بہت ہی سخت پہرے ہیں
ابھی تو میرے کانوں میں تری باتوں کی گونجیں ہیں
ابھی تو چھینتی ہیں چین میرا چاندنی راتیں
ابھی تو رنگ مجھ کو زندگی کا بور کرتا ہے
ابھی تو پیار تیرا دھڑکنوں میں شور کرتا ہے
ابھی تو آنکھ سے میری بہت ساون برستا ہے
ابھی تو فون کی ہر بیل پر یہ دل دھڑکتا ہے
ابھی تک یہ نہیں معلوم جیون کیوں ہوا گم صم
ابھی تو دل یہ کہتا ہے کہ شاید لوٹ آؤ تم
یہ سب خوش فہمیاں جاناں مرے دل سے نکلنے دو
تجھے ہم بھول جائیں گے، ذرا موسم بدلنے دو
کنیز فاطمہ مقدس۔ فیصل آباد

غزل

وہ صحن گلستاں کا منظر، پھولوں کی لطافت کیا کہیے
کلیوں کی صباحت کیا کہیے، شبنم کی تراوٹ کیا کہیے
اک حادثہ ایسا گزرا ہے جو اپنے تھے بیگانے بنے
جو ہونا تھا وہ ہو بھی چکا اب حرف شکایت کیا کہیے
وہ تیری اشھی وہ تری تنہائی وہ دردِ جگر وہ یورشِ غم
بے جان سی جاں پر بارِ گراں اب دل کی حالت کیا کہیے
صحرا کی جھلستی ریت پہ چل کر پاؤں کے چھالے پھوٹے ہیں
تھک ہار کے ہم تو بیٹھ گئے یہ طولِ مسافت کیا کہیے
آہوں کا دھواں سینے میں لیے، چپ چاپ جہاں سے چلتے بنے
کھولی نہ کبھی شکوے کی زباں معیارِ امانت کیا کہیے
سچ بات کا جو اعلان کریں، سولی پہ چڑھائے جاتے ہیں
حق کا یہ صلہ ملتا ہے یہاں لوگوں کی عنایت کیا کہیے
ہر بار وہ بس تجدید وفا عنبر سے فقط کرتے ہی رہے
وہ وعدہ فقط وعدہ ہی رہا یہ حسنِ عداوت کیا کہیے
معاویہ عنبر وٹو۔ ہڑپہ، ساہی

غزل

وہ فاصلوں کو فریب دیتا دل ونظر میں اُتر رہا ہے
وہ سوچ کے زاویوں کو اپنی پیمائشوں میں بدل رہا ہے
میں اس کے رنگوں میں ڈھل رہی ہوں، نکھر رہی ہوں سنور رہی ہوں
اور مختصر سی ساعتوں کا وہ مجھ پہ احسان کر رہا ہے
اسیر کرتی میری نگاہیں اثر بھی رکھتی ہیں جسم و جاں پہ
نظر میں پوشیدہ بے قراری وہ رکھ کے مجھ سے مکر رہا ہے
مری ادائیں، مری وفائیں اسی کی خاطر مری دعائیں
وہ مری حدِ نظر ہے مجھ سے نظر بچا کے چل رہا ہے
میں جس کی خاطر لڑ پڑی ہوں مسافتوں سے ساعتوں سے
وہ قرب کی ساعتوں میں دامن بچا کے مجھ سے نکل رہا ہے
قطار باندھے ہر اک خواہش اپنی تکمیل چاہتی ہے
خلش کا دن رات اک الاؤ بھری سی برسات میں جل رہا ہے
خولہ عرفان۔ کراچی

یہ ہوئی نا بات

سوال آپ کے......
جواب زین العابدین کے!!

اِس ماہ شمع خالق۔اسلام آباد کا سوال انعام کا حق دار ٹھہرا۔انہیں اعزازی طور پر دوشیزہ گفٹ ہیمپر روانہ کیا جارہا ہے (ادارہ)

نرگس اشرف۔کراچی

☺:بھیا اگر کوئی نئے سال پر چنری گفٹ کرے تو اس کا مطلب کیا ہے؟

✍:So Simple کوئی آپ کو اپنی بہن بنانا چاہتا ہے۔

گڑیا۔حیدر آباد

☺:زین بھائی! آپ کو پتا ہے یہ میرا دوسرا جنم ہے ۔بتایئے میں پہلے جنم میں کیا تھی؟

✍:پہلے جنم میں بڑھیا اور اس جنم میں گڑیا۔

عندلیب۔لاہور

☺:بھیا جی! اکثر لوگ سال گرہ کے موقع پر روٹھ کیوں جاتے ہیں؟

✍:لوگ روٹھ اس لیے جاتے ہیں تاکہ تحفہ دینے سے جان چھوٹ جائے۔

مبشرہ لیاقت۔کوئٹہ

☺:زین بھائی! نہ جانے کیوں وہ آج کل اپنے گال پہ کالا تل لگانے لگے ہیں؟

✍:سرکس میں نوکری پکی ہونے کی نشانی ہے یہ۔

مریم شاہ۔جھنگ

☺:بھیا جی! اگر جھولا جھولتے ہوئے ٹوٹ جائے تو؟

✍:ارے ارے مریم جی آپ کا وزن زیادہ تھوڑی ہے۔

شرمین۔جہلم

☺:زین بھائی! بتایئے کہ اس کی ہنسی اتنی خوفناک کیوں ہے؟

✍:ہنسی......ارے وہ تو پورے کا پورا ہی خوفناک ہے بی بی۔

عتیق احمد۔چیچہ وطنی

☺:زین جی! قسمت کا مارا قابل رحم ہوتا ہے اور محبت کا مارا کیا ہوتا ہے؟

✍:وہ قابل شرم ہوتا ہے بھائی۔

شاہدہ فضل۔سرگودھا

☺:بھیا! میں بہت پریشان ہوں اگر میں میک اپ کرنے کے بعد بھی ان کو اچھی نہ لگی تو......؟

✍:فوری طور پر ان کا چشمہ تبدیل کرادیں۔

اروشے۔گھوٹکی

☺:زین بھائی! ایک ساس اپنی بہو کا ستیاناس کب کرتی ہے؟

✍:ساس والا معاملہ تو ابھی بڑی دور ہے ہاہاہاہا ۔ساس انگارے چبا کر بولتی ہے اور بہو بھسم ہوجاتی ہے۔

نائلہ فہیم۔ مائلی

☺: بھیا! یہ بتایئے کہ آج کے شوہر کی سب سے پہلی خواہش کیا ہے؟

✎: بیوی کماؤ ہو۔

دردانہ۔ نوشین

☺: زین جی میں انہیں بہت چاہتی ہوں مگر وہ نہیں چاہتے......کیوں؟

✎: یہ کیوں کو چھوڑیں......دفع کریں انہیں ،نہیں

چاہتے تو۔

اشوک کمار......گگری گراؤنڈ۔ کراچی

☺: عورت کا سنگھار کب غضب ڈھاتا ہے

✎: ولیمے کے روز میرے بھائی۔

شہزادی کنول۔ سکھر

☺: زین جی! یہ دل دکھانے والے اتنے پیارے کیوں لگتے ہیں؟

✎: پیارے لگتے ہیں ،ہمیں تو بالکل پیارے نہیں لگتے۔

ثروت شان۔ آزاد کشمیر

☺: زین جی! گھر کے چور کو ڈنڈے مار کر نکالا جاتا ہے دل کے چور کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں؟

✎: بی بی دل کے چور کو قید کیا جاتا ہے عمر بھر کے لیے۔

شمع خالق۔ اسلام آباد

☺: زین بھائی! ہوا کھاتے ہوئے اگر ہوا گلے میں پھنس جائے تو کیا کیا جائے؟

✎: واؤ......کیا سین ہے۔ مگر فکر نہیں آپ فوراً ایک گلاس آکسیجن پی لیں۔

انجم وہاب۔ کوٹری

☺: زین جی Help Me۔ بس یہ بتا دیں کہ فریبی انسان کے ساتھ زندگی نبھانے کا طریقہ کیا ہے؟

✎: ارے ارے......ایسی کون سی آفت نازل ہوگئی ہے۔ جو آپ فریبی کو گلے لگا رہی ہیں۔

عجیب خان۔تلمبہ

☺:زین بھائی! دل کی آگ اور چولہے کی آگ میں کیا فرق ہے؟

✍:بتا کہے Gass غائب۔ CNG کی چھٹی...... دل بھی آج کل CNG پر ہی چل رہے ہیں۔ ہے نا عجیب بات۔

معمر خان۔بالاکوٹ

☺:زین جی دوشیزہ کی سالگرہ پر ہم کو کیا تحفہ ملے گا؟

✍:آپ کے لیے ڈھیروں دعائیں۔

سوہنی۔کیماڑی۔کراچی

☺:زین بھائی! میری سالگرہ پر سارا کیک پڑوسن کی بلی کھا گئی۔ہائے اب کیا کروں؟

✍:So Sad۔مگر سوہنی جی! اگر آپ مچھلی کا کیک بنائیں گی تو یہی ہوگا۔اب پچھتا کیوں رہی ہیں۔

عارفین علی۔ملتان

☺:زین بھائی! قدرت کی خوبصورتی کے لیے غزل لکھی ہوئی ہے اور ان کی خوبصورتی کے لیے کیا لکھوں؟

✍:فی الحال تو قصیدہ ہی لکھ لیں۔

زیبا حق۔علی پور چٹھاں

☺: بھیا جی! جلدی بتائیں طوطوں میں اور مردوں میں کیا فرق ہے؟

✍:کوئی خاص نہیں، مگر آپ کی خوشی کے لیے بتا دیتا ہوں۔ کان قریب لائیں (دونوں ٹیں ٹیں کرتے ہیں اور بس)۔

راشدہ اعجاز......کراچی

☺: بھیا جی! سنا ہے پیار میں بھی رشوت چلتی ہے۔نئے سال میں کیا تبدیلی آئے گی؟

✍:کوئی خاص نہیں ہاں مگر تحفے تحائف کا وزن اور حجم بڑھ جائے گا۔

نوری بلاول......اسلام آباد

☺: زین بھائی! وہ ڈاکٹر ہیں کیا میں انہیں نبض دکھاؤں؟

✍:کوئی ضرورت نہیں ہے۔نبض کے بعد وہ کلائی پکڑ لیتے ہیں۔

صالحہ بانو۔کراچی

☺:زین بھائی آج کل مجھے کچھ کچھ ہوتا ہے بتائیے کیا ہوتا ہے؟

✍:آج کل سردی ہو رہی ہے نا۔تو یقیناً آپ کو نزلہ زکام بخار ہو رہا ہوگا۔

عصمتی عزیز۔بہاول پور

☺:زین بھائی! نئے سال پر مجھے کیا گفٹ دیں گے؟

✍:2015 کا نیا کیلنڈر۔

حنین احمد......لانڈھی، کراچی

☺:میرا پائے کھانے کو دل نہیں چاہتا کیوں؟

✍:ارے بھائی گائے اور بھینس کے جوتے (پائے) کوئی کھانے کی چیز ہیں کیا۔

☆☆......☆☆

"یہ ہوئی نا بات" کے لیے میرا سوال یہ ہے...

کوپن برائے فروری 2015ء

نام: ________

پتا: ________

کنوارا

دفتروں میں بھی اس سماجی اچھوت کا حشر گھر سے کچھ مختلف نہیں ہوتا۔ دفتروں میں یہ لوگ اکثر اوقات دیر سے پہنچتے ہیں کیونکہ غسل اور شیو سے لے کر چولہا جلانے تک کی ساری کاروائی اس ننھی، معصوم اور اکیلی جان کو کرنی پڑتی ہے۔ کنوارے کی صحیح غم خوار......

ذاتی تجربات و مشاہدات کے حوالے سے کنوار پنے پر ایک دلچسپ تحریر

زبان سے اس لفظ کے نکلتے ہی معاذ ہن میں مسالے دار پاپڑوں جیسا کرار اور گلاب اچھڑ کی ریوڑیوں جیسا کڑا کے دار تصور اُبھرتا ہے۔ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ پاپڑوں اور ریوڑیوں کے باہم ملنے سے یا ملا کر کھانے سے جو لطف مل سکتا ہے، اس سے ملتی جلتی کیفیت زندگی کے اس خاص دور کی ہوتی ہے جسے عرف عام میں کنوار پن کہا جاتا ہے، لیکن مجھے اس نام سے اختلاف ہے۔ صنف لطیف کی حد تک کنواری کہنا اور کہلانا سراسر ذوق وشوق کا خوبصورت اظہار ہے لیکن مردوں کے لیے......؟ خیر جانے دیجئے نام میں کیا دھرا ہے۔ لوگ تو اندھوں، کانوں کے نام بدر منیر اور روشن دین رکھ دیتے ہیں۔ ہمیں تو زندگی کے اس عہد آفریں یادگار عہد سے غرض ہے، جس کی عملی تصویر دیکھ کر جہاں ایک سمت دل میں میٹھا میٹھا درد اٹھنے لگتا ہے، وہاں دل کے ہی ایک گوشے میں مندر کی سندر گھنٹیوں کے ہلکے پھلکے سُروں کا جل ترنگ بج اٹھتا ہے۔ یہ مت پوچھیے کہ درد کے ساتھ آنکھوں میں آنسو پیاز کاٹتے وقت آتے ہیں یا چولہا جھونکتے وقت۔ ہوسکتا ہے کہ یہ جلترنگ مسالے کے سل بٹے کا ہو یا ''دکھڑے'' میں رات کے برتن مانجھنے کا......! کنوارا ہونا رحمت بھی ہے اور زحمت بھی۔ رحمت اس لحاظ سے کہ بے چارے نا تو بچوں میں شمار کیے جا سکتے ہیں نہ بچوں والوں میں۔ کنوارے بوڑھے بھی ہو جائیں تو ان سے دو سال بڑے ان بیچاروں کو بدستور کل کے نو آموز اور نا تجربہ کار سمجھیں گے، اور بچے تو ہمیشہ انہیں بھائی جان ہی کہیں گے لیکن خیال رہے کہ اس قدر گیا گزرا ثابت ہوتے ہوئے بھی توقیر کا پہلو نکل آتا ہے۔ آخر یہ سدا بہار جوانی کسے نصیب ہوسکتی ہے۔ سوائے اُس جوان کے جو عین عالم شباب میں اس دارفانی سے کوچ کر جائے اور ہمیشہ جوان رہے کیوں کہ اسے ہمیشہ جوان تصور کیا جائے گا۔ بس یہی حال کنواروں کا بھی ہوتا ہے۔

معاشرے کا یہ مظلوم اور مجبور طبقہ کسی محلے میں مکان لینا چاہے تو صاحب مکان اور اردگرد کے رہنے

والے اس سے یوں بھاگتے ہیں جیسے امریکی سرخوں سے یا بھارتی سورما چینیوں سے۔ صبح شام محلے سے گزرتے وقت سر جھکا کر بزرگوں کو سلام کر کے اور مسجد میں حاضری دے کر دن پورے کیے جائیں تو کام بن سکتا ہے۔ لیکن خطرہ یہاں بھی پیچھا نہیں چھوڑتا۔ آپ کسی ایسے بزرگ کو سلام نہیں کر سکتے جن کے پاس آپ کے 'مرض' کا مداوا ہے اور نہ ہی آپ چھوٹے بچوں سے بلا وجہ یارانہ گانٹھ سکتے ہیں۔ کیا بھروسا ان کنوارے فصلی بٹیروں کا کہ بچوں سے پیار پہلی سیڑھی ہو کسی خاص بلندی تک پہنچنے کی۔ آخر کنوارے بھی انسان ہیں، کب تک اپنی نازک گردن کو خم دیے رکھیں۔ غلطی سے کسی چھٹی کے دن اپنے دوستوں کی محفل گرم کر بیٹھتے ہیں۔ ظاہر ہے جب مظلوم جاگتا ہے تو ظالم کو سلا کر ہی دم لیتا ہے۔ چھت پھاڑ کر قہقہوں، برتن ٹوٹنے کی آوازوں، تاش کھیلنے، مغلظات بکنے اور با آواز بلند گپیں ہانکنے کے دوران پہلے تو ارد گرد کے مکانوں کی کھڑکیاں کھلتی ہیں، چلمنیں ہلتی ہیں اور پھر اگلی صبح شرفائے محلہ کا ایک وفد کنوارے صاحب کے دروازے پر زور زور سے دستک دے رہا ہوتا ہے چونکہ دوست جا چکے ہوتے ہیں، اس لیے اکیلے میں رات کا نشہ بہت جلد ہرن ہو جاتا ہے اور مظلوم پھر ظالم کی اکثریت کی چکی میں پس جاتا ہے۔

یہ تھی تو باہر کی حالت، اگر آپ کو معلوم ہو جائے کہ اس ذات شریف کی درگت گھر میں کیا بنتی ہے تو زیادہ افسوس نہ ہو کہ گھر بھر کے افراد جمع ہو کر گپیں ہانک رہے ہیں۔ بیچارا کنوارا کپڑوں کے رنگ، بچوں کی عادات، موسم کی حالت مکانوں کے کرایوں اور مہنگائی، غرض کسی بھی چیز کے بارے میں اس انداز سے بولے کہ وہ شادی شدہ اکثریت کی حمایت ہی کیوں نہ کر رہا ہو، اس کی مداخلت بے جا پر فوراً ٹوک دیا جاتا ہے "بس بس رہنے دیجئے اپنی معلومات کا خزانہ۔ آپ کو کیا معلوم گھر اور بچوں کے مسائل کس جانور کا نام ہے۔" لیجیے بیٹھے بٹھائے اچھی خاصی سبکی ہو گئی۔ آپ کسی ہوٹل، ریسٹوران فلم یا کتاب کے بارے میں کسی دوسرے انداز میں بات کریں تو جواب ملے گا۔ "جی ہاں صاحب! عیاشی اور آرام طلبی آپ جیسے فارغ لوگوں کو ہی زیب دیتی ہے۔" یعنی ہر حال میں زبردست کا جوتا کنوارے کی ٹانٹ پر۔ نفرت، دوری، حقارت اور بے بسی پر ہنسی کی دودھاری تلوار ہے جو خربوزے اور قیمے کی طرح ہر حال میں کنوارے کے درپے ہوتی ہے۔ دفتروں میں بھی اس سماجی اچھوت کا حشر گھر سے کچھ مختلف نہیں ہوتا۔ دفتروں میں یہ لوگ اکثر اوقات دیر سے پہنچتے ہیں کیوں کہ غسل اور شیو سے لے کر چولہا جلانے تک کی ساری کاروائی اس ننھی، معصوم اور اکیلی جان کو کرنی پڑتی ہے۔ کنوارے کی صحیح غم خوار پنجابی زبان ہے۔ "رناں والیاں دے پکن پروٹھے تے چھڑیاں دی اگ نہ بلے!" تیل کے چولہوں پر آگ تو "جل ہی" جاتی ہے لیکن پراٹھے ان کی قسمت میں کہاں؟ یہی وجہ ہے کہ معیاری ناشتہ نہ ہونے کی وجہ سے کنواروں کا کام معیاری نہیں ہوتا۔ سرکار کا خزانہ بھی انہیں شادی شدگان کی مراعات سے محروم رکھتا ہے۔ محرومی کی اس لرزہ خیز داستان کے باوجود کنوارے بچوں کی ریں ریں، باورچی خانے کی فکر، بیوی کے کپڑوں، میک اپ کے سامان اور اس کے رشتہ داروں کے لیے رسموں اور اس نوع کی دوسری، بہت سی چیزوں سے محفوظ رہتے ہیں۔

لیکن تصویر کا رخ صرف یہی نہیں، ایک اور بھی ہے، اور وہ ہے کنوارے پنے کی برکات۔ خدا بھلا کرے، میرے ایک کرم فرما ہیں جو شادی شدہ ہونے کے باوجود مجھ سے بے تکلف ہیں۔ ایک روز بڑے رازدارانہ لہجے میں کہنے لگے، "عزیز! میرے نزدیک

زندگی کا سب سے سہانا، دلکش، خوبصورت اور نہ بھولنے والا وقت کنوارا پن ہے۔''

''وہ کیسے پیرومرشد؟'' میں نے بڑے اشتیاق اور حسرت سے پوچھا۔

''وہ یوں...... '' کہنے لگے ''بالخصوص جب برسر روزگار یا روشن مستقبل والے از قسمے طبیب اور ڈاکٹر کنوارے کسی ایسے گھر میں جاتے ہیں جہاں رشتے کا سامان وامکان موجود ہو، تو وہاں ان کی خوب پذیرائی ہوتی ہے۔ چھوٹے بڑے آؤ بھگت کرتے ہیں۔ دیوان خانے کے پٹ بار بار کھلتے اور چلمنیں ہلتی جلتی رہتی ہیں۔ مختلف قسم کے کھانے، رنگارنگ تکلفات، ننھے بچوں کا اپنی باجیوں کی تعریف کرنا اور گھر کے بزرگوں کا نہ صرف آپ کی تعلیم اور مستقبل میں دلچسپی اور لگاؤ ظاہر کرنا بلکہ سات پردوں میں مستور مشک کی تعریف میں زمین وآسمان کے قلابے ملا دینا اور پوری کوشش کرنا کہ دونوں کی قدر مشترک کو ڈھونڈا جائے اور پھر اسے خوب اچھالا جائے۔ انہی دنوں وہ رسالے اور کاپیاں عام نظر آتی ہیں جن پر پورا نام مندرج ہوتا ہے لیکن میرے عزیز شادی کے بعد یہ سب کچھ گدھے کے سینگوں کی طرح غائب ہو جاتا ہے۔ بالکل جیٹ طیارے کی طرح جو خود تو آن کی آن میں نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے لیکن دھوئیں کی لکیریں دیت تک آسمان پر لڑھکتی پھرتی ہیں۔ اب اگر شادی کے بعد تم کہیں جاؤ گے تو فضا میں انجانی گھٹن محسوس ہوگی۔ صاحب خانہ سرد مہری اور ترشروئی سے خیر خبر پوچھ کر جلد ہی اپنے کسی ضروری کام کو یاد کر بیٹھیں گے۔ زنان خانے کی طرف سخت پردہ ہوگا۔ بچے دندناتے گزر جائیں گے اور تم جیسے ہونق پر نظر ڈالنا بھی گوارا نہ کریں گے۔ سو عزیز! جو لطف، جو حسن ذوق اور جو کیف اب ہے وہ تب نہیں ہوگا۔ صاحب دل طبیب کی حکیمانہ باتیں سن کر طبیعت پھڑک اٹھی بلکہ معجون دل کشا بن گئی۔ کتنی سچائی تھی ان کی رمز آگاہی اور نبض شناسی میں۔

کنواری مخلوق دنیا کے ہر کونے میں پائی جاتی ہے۔ پرندوں میں ایک ''کاگ'' کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ خط استواء پر بھی پایا جاتا ہے اور قطب شمالی پر بھی۔ یہ جزیروں میں بھی ملتا ہے اور براعظموں میں بھی۔ کچھ یہی حال کنواروں کا ہے۔ شادی شدہ جوڑوں کا سکون خراب کرنے کے لیے یہ لوگ ہر جگہ جا دھمکتے ہیں۔ پھر ان کی کئی قسمیں بھی ہیں۔ اور ہر عمر، ہر جگہ اور ہر رنگ ونسل سے عشق جتانا ان کا پیدائشی حق ہے۔ سدا بہار خالص کنوارے وہ لوگ ہوتے ہیں جنہیں کوئی عارضہ لاحق ہوتا ہے۔ اسی لیے یہ لوگ شادی کے نام سے جی چراتے ہیں یا پھر عشق خانہ خراب کے چکر میں ذہنی عارضوں کا شکار بن جاتے ہیں۔ موسمیاتی کنوارے سفر کے دوران مخلوط ڈبے، شادیوں، مخلوط پارٹیوں اور نوجوانوں کی محفلوں میں کچھ ایسا طرز عمل اختیار کرتے ہیں کہ ان پر سو فیصد کنوارے ہونے کا شک گزرتا ہے حالانکہ دیوار کے اس طرف آپ کے ڈیڑھ درجن بچے منمنا رہے ہوتے ہیں اور کریم شحیم بیگم کی بھنبھناہٹ اس کے سوا ہوتی ہے۔

اگلے روز دوستوں کے حلقے میں بات ہو رہی تھی کہ شادی کی جائے یا کنوارا رہا جائے۔ ہم کنواروں نے یہ باتیں تو شادی شدہ لوگوں کی نسبت زیادہ محنت اور محبت سے تیار کر رکھی تھیں، کہ شادی کب ہو، کس سے ہو اور کیسے ہو؟ لیکن مصیبت یہی ہے کہ تمام فائدوں اور منافعوں کے باوجود ایک انجانی اور...... ان دیکھی روح کے لیے کنوارے پنے کا پلڑا اوپر اٹھ جاتا ہے۔ وہ نہ ہو تو کنوارے پنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مگر بے چارا کنوارا اپنی شادی پر زور دے بھی تو کیسے؟ اب قارئین با تمکین آپ ہی فیصلہ کر ڈالیں کہ اونٹ کس کروٹ بیٹھے لیکن معاف کیجیے گا، آپ بھی تو کنوارے ہیں۔ اچھا تو پھر فیصلہ بزرگوں پر رہنے دیجیے۔

☆☆......☆☆

ڈی۔ خان

ماہرہ خان، شاہ رخ کے ساتھ

بولی وڈ میں کنگ خان کی آنے والی فلم 'رئیس' کی دھوم مچی ہے اور ہمارے لیے اہم بات یہ ہے کہ 'رئیس' کی رئیسانی اپنی ماہرہ خان ہیں۔ راہول ڈھولکیا کی ہدایت کاری میں بننے والی اس فلم میں
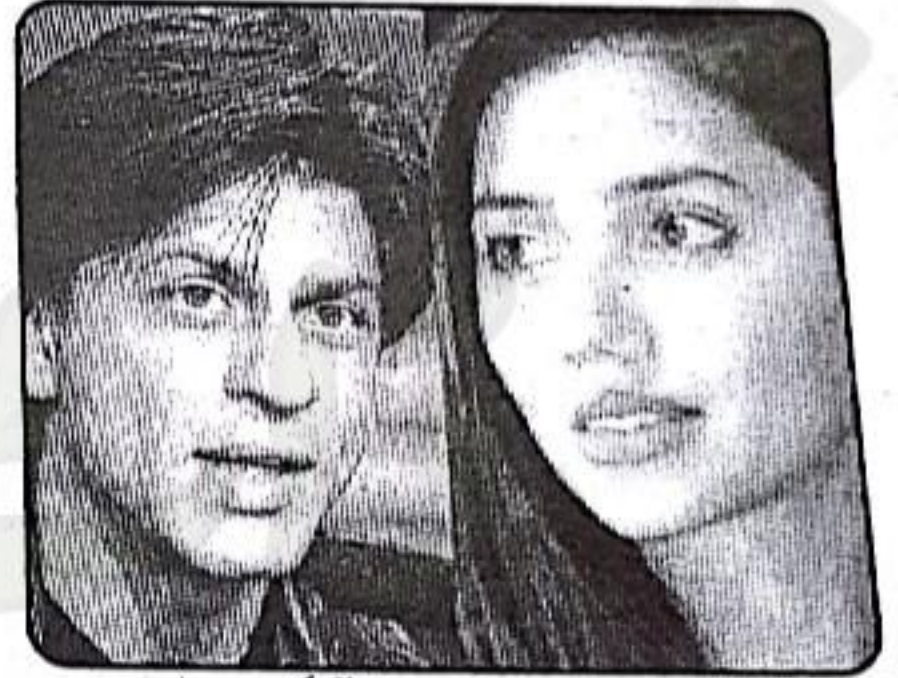
فرحان اختر اور نواز الدین صدیقی بھی شامل ہیں۔ گڈ لک بے بی!

ایک بار پھر شادی......

بہت جلد شہرت کی بلندیوں پر پہنچنے والی عینی نے جتنی جلدی مقبولیت حاصل کی اس سے کہیں زیادہ جلدی وہ سسرال کی سیڑھیاں چڑھ گئیں (اور منہ کے بل گر پڑیں) مگر یہ نشہ، یہ سرور کسی عفریت کی طرح ہوتا ہے۔ پہلے شادی کی ناکامی کے بعد اب عینی

دوبارہ سے رشتہ ازدواج میں بندھ گئی ہیں۔ عینی کے ہی سعد خان ہیں جو ایک برطانوی نژاد بزنس مین ہیں۔ نیک خواہشات کے ساتھ اس نئے جوڑے کو مبارکباد، یاد رہے اس شادی کی تقریب میں شوبز کی شخصیات کا داخلہ ممنوع تھا۔

PK، صدی کی بہترین فلم

پرفیکٹ خان کا نیا شاہکار 'پی کے' اس وقت پوری دنیا کو چکا چوند کرچکا ہے۔ دسمبر ہی میں ایک ہفتے کے دوران اس فلم نے 300 کروڑ کا بزنس کر کے آمدنی کا نیا ریکارڈ بنالیا ہے۔ بہت جلد 500 کروڑ آرام سے کما لینے والی یہ فلم انڈین سنیما

کی بزنس کے لحاظ سے سب سے بڑی فلم میں شمار ہوگی۔ اس فلم کا موضوع سارے عالم کی بولتی بند

کر دینے والا ہے۔ ہنسی ہنسی میں ہدایت کار نے عامر خان کی پرفیکشن کے ذریعے اپنا Msg ایک عام ویور تک پہنچا دیا ہے۔ انوشکا شرما کے کیرئیر کی یہ سب سے بڑی فلم ہے۔ انوشکا شرما نے عامر خان کے سامنے جم کر اداکاری کی ہے۔

سوہا علی خان کی شادی

شرمیلا ٹیگور اور نواب پٹودی کی بیٹی اور چھوٹے نواب سیف خان کی بہن بولی وڈ کی نامور ہیروئن

سوہا علی خان جنہوں نے کئی فلموں میں یادگار اداکاری کی۔ 25 جنوری 2015ء کو شادی کے بندھن میں بندھ رہی ہیں۔ اُمید ہے یہ شادی شرمیلا ٹیگور کی شادی کی طرح ہی کامیاب رہے گی۔

سوناکشی امرتا پریتم کے روپ میں

بولی وڈ کی خوش قسمت اداکارہ سوناکشی سنہا نے بھارت کی عالمی شہرت یافتہ مصنفہ امرتا پریتم کی سوانح حیات پر بننے والی فلم میں مرکزی کردار ادا

کرنے کی حامی بھرلی ہے۔ سوناکشی کا کہنا ہے کہ یہ فلم ان کے لیے کسی چیلنج سے کم نہیں۔ اس فلم کے ہدایت کار جسمیت رین ہیں۔

بپاشا Alone

بپاشا اور Alone ناممکن سی بات ہے۔ حسینۂ بنگال Alone لفظ کے معنی تک سے ناواقف ہیں۔

(آہم) Alone نام ہے بپاشا کی آنے والی نئی سنسنی خیز فلم کا...... بپاشا کی یہ فلم اس وقت بولی وڈ

میں بہت چرچا میں ہے۔ بپاشا کا کہنا ہے کہ یہ فلم صرف ہارر نہیں بلکہ یہ محبت بھرے جذبے پر مبنی لواسٹوری ہے۔ فلم میں ہم نے اپنے کرداروں کے ذریعے ایک حقیقی محبت پر مبنی کہانی دکھادی ہے۔ یاد رہے اس ہارر فلم سے پہلے بپاشا ہمارے عمران عباس کے ساتھ 'کریچر' میں آ کر بری طرح فلاپ رہی ہیں۔

ودیا بالن کی ادھوری کہانی

منفرد کردار ادا کرنے میں بولی وڈ اداکارہ ودیا بالن کا جواب نہیں۔ مہیش بھٹ کی پروڈیوسڈ اور لکھی اس فلم کے ڈائریکٹر مہیت سوری ہیں۔ ودیا اس فلم میں ایک گل فروش خاتون کا کردار نبھائیں گی۔

اس فلم میں ان کے ساتھ عمران ہاشمی اور راج کمار راؤ مرکزی کردار نبھائیں گے۔ فلم 2015ء کے جون میں ریلیز ہوگی۔ یاد رہے ودیا اس سے پہلے 'ڈرٹی پکچر' 'کہانی' 'بھول بھلیاں' 'ہائے بے بی' اور 'بوبی جاسوس' 'عشقیہ' وغیرہ میں اپنے کردار یادگار بنا چکی ہیں۔

سنجو بابا کا نیا روپ

سنجے دت جیل میں جا کر رائٹر بن گئے ہیں۔ پونا کی جیل سے 14 دن کی چھٹی پر سنجو بابا گھر پہنچے تو انکشاف ہوا کہ انہوں نے جیل میں اب تک دس فلموں کے اسکرپٹ لکھ ڈالے ہیں۔ سنجو بابا کو بطور اداکار 'اگنی پتھ' سے ایک اعلیٰ پائے کا کردار ادا کر کے ہم عصروں میں سب سے بڑے اداکار کا خطاب

پہلے ہی مل چکا ہے اور سنجے کی کامیابی کی اس سے بڑی دلیل کیا ہوگی کہ پی کے میں سنجے کو پیرول پر رہا کرا کے ایک خصوصی کردار عامر خان کے مقابل ادا کرایا گیا اور سنجے نے ثابت کردیا کہ آج بھی اُن سے بڑا اداکار کوئی نہیں ہے۔

ہوائی زادہ تیار

بولی وڈ کی نئی فلم 'ہوائی زادہ' بھارتی سائنسدان شیوکار باپو چٹر جی کی زندگی پر مبنی ہے۔ جنہوں نے بھارت میں پہلا ہوائی جہاز تیار کیا تھا۔ وکی ڈونر فیم

ایوشمان کھرانا، متھن چکرورتی اور پلوی شردھا کاسٹ

میں نمایاں ہیں۔ ہوائی زادہ 30 جنوری کو سینماؤں کی رونق بنے گی۔

دل دھڑکنے دو

فرحان اختر اور پریانکا چوپڑا زویا اختر کی آنے والی فلم میں بطور گلوکار بھی انٹری دے رہے ہیں۔

سو فیصد اُمید ہے کہ فلم بین اس جوڑی کے اس نئے رنگ کو ضرور پسند کریں گے۔

نکول کڈمین، اجے دیوگن کے ساتھ

اجے دیوگن نے 2015ء میں ہائی جمپ لگانے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ اجے کی آنے والی ہوم
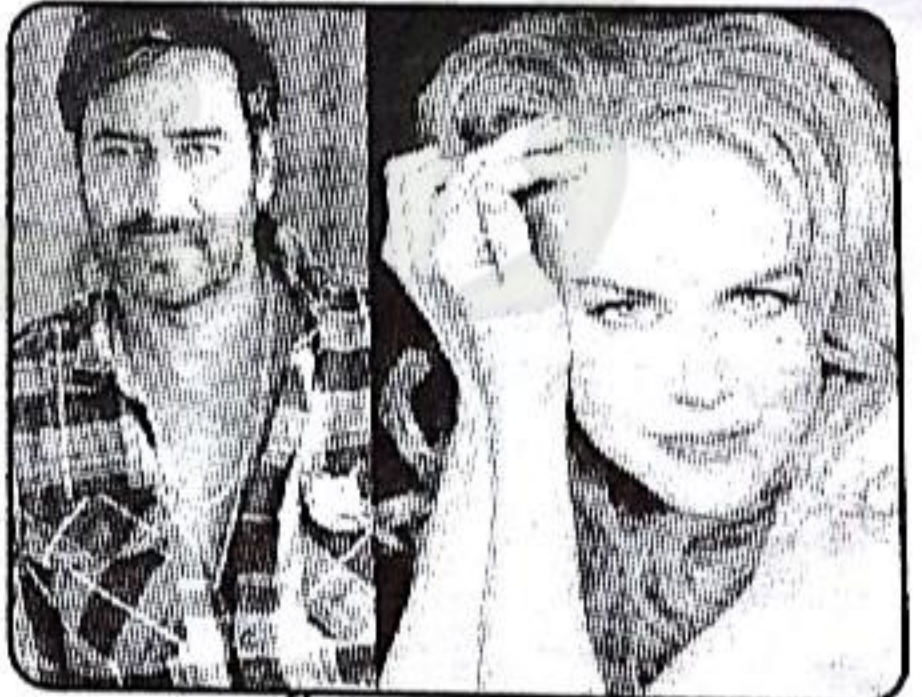
پروڈکشن 'Shivay' میں اجے دیوگن نے ہولی وڈ سپر اسٹار نکول کڈمین کو کاسٹ کرلیا ہے۔ اب دیکھنا ہے کہ اس پراجیکٹ میں نکول کڈمین اجے دیوگن کی کامیابی میں کس حد تک اپنا کردار ادا کرپاتی ہیں کیونکہ شاید یہ فلم روہیت شیٹھی ڈائریکٹ نہ کریں۔

جو اس وقت اجے کا Luck بنے ہوئے ہیں۔

یُو یُو ہنی سنگھ پریشر میں

ہنی سنگھ اپنی صحت کے حوالے سے پہلے ہی چرچا میں تھے۔ اب نیا مسئلہ ان کے میوزیشنز نے پیدا کردیا ہے۔ ہنی سنگھ لگاتار ہٹ نمبرز دے رہے تھے۔

مگر اس تناؤ میں ان کا کیریئر بری طرح متاثر ہو رہا ہے۔ اب دیکھنا ہے ہنی سنگھ اپنے کیریئر کو کس طرح اس صورت حال سے نکالتے ہیں۔

کمل ہاسن 17 سال بعد

کمل ہاسن کا وہ خواب جو انہوں نے 1997ء میں دیکھا تھا۔ 'مرو تھنیاگم' کی صورت اب پورا ہونے جارہا ہے۔ اس برس اُتم ولن، وشواروپ II

اور پاپناسم کی ریلیز کے بعد کمل فوری طور پر اپنا یادگار پروجیکٹ مکمل کریں گے۔

☆☆......☆☆

نفسیاتی اُلجھنیں اور اُن کا حل

مختار بانو طاہرہ

زندگی اپنے ساتھ جہاں بہت ساری خوشیاں لے کر آتی ہے وہیں بہت سارے ایسے مسائل بھی جنم لیتے ہیں جو اس زندگی کو مشکلات کے شکنجے میں جکڑ لیتے ہیں اِن میں سے بیشتر اُلجھنیں انسان کی نفسیات سے جڑی ہوتی ہیں اور انہیں انسان از خود حل کر سکتا ہے۔ یہ سلسلہ بھی اُن ہی الجھنوں کو سلجھانے کی ایک کڑی ہے۔ اپنے مسائل لکھ بھیجیں، ہماری کوشش ہوگی کہ آپ ان مسائل سے چھٹکارہ پالیں۔

ماہی۔ لاڑکانہ

✿: میرے سر میں آج کل بہت درد ہوتا ہے۔ امی قریبی ڈاکٹر کے پاس لے گئیں۔ اس نے امی کو دوا لینے بھیج دیا اور مجھ سے بہت عجیب طرح کی باتیں کیں۔ اب میں دوبارہ اس ڈاکٹر کو نہیں دکھانا چاہتی۔ درد ہوتا ہے تو ہو، مگر امی ڈانٹتی ہیں کہ تم ضدی ہو۔ میں بہت جھجکتی ہوں، انہیں کوئی بات نہیں بتاتی۔ نہ ہی میری کوئی دوست ہے جس سے کوئی بات کہہ سکوں۔

☆: دوست کی کمی محسوس نہ کریں، آپ کی امی جو ہیں ان کو ہر بات بتادیں۔ تاکہ وہ دوبارہ وہاں جانے کے لیے نہ کہیں۔ سر کے درد کی تکلیف قابلِ علاج ہے۔ اس لیے برداشت کرنے کی ضرورت نہیں۔ کسی اور ڈاکٹر سے مشورہ کیا جاسکتا ہے۔ لیڈی ڈاکٹر ہوں تو زیادہ اچھا ہے۔

حارث۔ حیدر آباد

✿: میری دو بیٹیاں ہیں جن کی ابھی تک شادی نہیں ہوئی۔ کئی ملنے والوں سے رشتے کی بات کی ہے۔ بات نہیں بنتی۔ بیٹیوں کو پتا چلتا ہے تو ناراض ہوتی ہیں۔ میں دل کا مریض ہوں۔ چاہتا ہوں میری زندگی میں یہ اپنے گھر کی ہو جائیں۔ ان کی ماں کو تو فکر ہے نہیں، پہلے مجھے بھی زیادہ خیال نہ تھا مگر جب سے ریٹائر ہوا ہوں تو طرح طرح فکریں لگ گئی ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے اب زندگی کے دن بہت تھوڑے رہ گئے ہیں۔

☆: فکر کرنے سے پریشانیاں یا مسائل حل ہوتے تو آج کوئی بے فکر نہ نظر آتا۔ کسی بھی پریشانی یا فکر کو غیر معمولی حد تک دماغ پر مسلط کرنے سے اصل پریشانی تو اپنی جگہ برقرار رہتی ہے۔ اس کے ساتھ ذہنی بے سکونی میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ آپ نے بتایا کہ ملازمت سے فارغ ہونے کے بعد سے پریشانی بڑھ گئی ہے، اس کا سبب فرصت کا وقت مل جانا بھی ہوسکتا ہے۔ زندگی کے دن کتنے باقی ہیں، یہ تو کسی کو نہیں معلوم لہٰذا اس حوالے سے مایوسی بے کار ہے۔ دل کے مریضوں کو ذہنی دباؤ سے بچنا چاہیے تاکہ جسم کا مدافعتی عمل بہتر کام کرتا رہے۔

آمنہ۔ کراچی

✿: میرا ایک کزن جاپان سے آیا، میں اس سے متاثر ہوگئی۔ وہ میرے گھر والوں کو بھی پسند تھا۔ اس نے مجھ سے وعدے کیے کہ میں تمہیں بھی جاپان بلالوں گا۔ تمہاری مشکلات ختم ہو جائیں گی۔ دراصل میرے والد نہیں ہیں۔ گھر کی ذمہ داریاں مجھ پر ہیں۔ مجھے آس ہوگئی۔ چند ماہ ہی گزرے تھے اسے

واپس گئے ہوئے، اس نے وہاں شادی کرلی۔ مجھے اس پر بھی اعتراض نہیں، میں تو اسے یاددلانا چاہتی ہوں کہ اس نے جو مجھ سے کہا تھا پورا نہ کیا۔ بڑی مشکل سے اس سے ایک روز میری بات ہوئی تو کہنے لگا کیسے وعدے؟ یہ سننا تھا کہ میری طبیعت بگڑنے لگی۔ پھر میں نے بھی اس سے بات نہ کی۔ اب مجھے بہت اداسی ہوتی ہے اور رونا بھی بہت آتا ہے کہ بظاہر کیسے معصوم لوگ دھوکہ دے دیتے ہیں۔

☆: دھوکہ دینے والے معصوم نہیں ہوتے بلکہ دھوکے میں آنے والے معصوم ضرور ہوتے ہیں۔ وعدہ خلافی کے برے نتائج ان کے لیے عارضی ثابت ہوں گے لیکن جس سے وعدہ خلافی کی، اُس کے لیے تکلیف دہ نتائج دیرپا ہوں گے۔ بہرحال اب آپ کا اس سے کوئی تعلق نہیں لہٰذا خیال بھی نہ آئے تو زیادہ بہتر ہے۔ آپ کی زندگی بہت قیمتی ہے، اچھا ہوا جو مایوس کرنے والوں کا مستقل ساتھ نہ ہوا۔ آپ کو اپنے ساتھ مہربان ہونا چاہیے۔ دوسروں کی باتوں پر خود کو نہ رلائیں۔ آپ بہت نیک اور اچھی لڑکی ہیں۔ آپ کی قسمت میں بھی ایسا ہی نیک انسان ہوگا۔

شہزاد۔ لاہور

۞: میری منگیتر خالہ کی بیٹی ہے۔ آج کل وہ ہمارے گھر رہنے کے لیے آئی ہوئی ہے۔ میں شروع سے زیادہ وقت باہر گزارنے کا عادی ہوں۔ امی ناراض ہوں یا کوئی کچھ کہے، میں اپنے دوستوں میں 3 گھنٹے یا اس سے بھی زیادہ گزار کر گھر آتا ہوں۔ اس طرح رات کا ایک بھی بج جاتا ہے۔ مجھے بہت عجیب لگا جب میری منگیتر نے میرے اس طرح گھر آنے پر اعتراض کیا اور میری امی نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ میرے دوست کہتے ہیں کہ بعد میں تو یہ مجھ پر حاوی ہو جائے گی لہٰذا اس کے کہنے پر ابھی سے روش نہ بدلو۔ ایک طرف دوستوں میں وقت گزارنے کی عادت ہے تو دوسری طرف منگیتر کی ناراضگی۔

☆: دوست ناراض ہو جائیں تو کوئی حرج نہیں، اتنی دیر گھر سے باہر رہنا اور وہ بھی بلا سبب وقت ضائع کرنا...... اس عادت کو ترک کرنا چاہیے۔ آپ کی والدہ اور منگیتر دونوں مخلص ہیں، ان کی بات پر توجہ دیں۔ دیر سے گھر آنے کا رجحان ترک کرنے کے لیے اس کے تمام منفی پہلوؤں پر غور کریں۔ اس طرح جلد گھر آنے کی رغبت پیدا ہوگی۔ دوستوں کو بھی بتا دیں کہ یہ روش تو بدلنی ہوگی۔

علی احمد۔ ملتان

۞: میرے دونوں بیٹے بہت ذہین ہیں۔ جب وہ اچھے نمبر لاتے ہیں تو میں ان کو کوئی نا کوئی بڑا نوٹ ضرور دیتا ہوں۔ مجھے دکھ ہوتا ہے کہ وہ اتنا خوش نہیں ہوتے جتنا خوش ہونا چاہیے۔ وہ اکثر آپس میں لڑ پڑتے ہیں۔ مجھے اپنی بیوی کے ساتھ شام کو ضروری میٹنگ میں شرکت کرنی ہوتی ہے۔ وہاں آفس کے لوگ اور ان کی بیگمات ہوتی ہیں، بچوں کو نہیں لے جایا جا سکتا۔ لیکن ان کی لڑائیوں کی وجہ سے مجھے گھر سے باہر بھی پریشانی لگی رہتی ہے۔ اس قدر خیال رکھنے کے باوجود بھی وہ آپس میں محبت سے نہیں رہ سکتے۔

☆ بڑی رقم سے زیادہ بچوں کے لیے والدین کی قربت زیادہ اہم ہوتی ہے۔ عام طور پر وہی بچے زیادہ لڑتے جھگڑتے ہیں جو اپنے بڑوں سے دور ہوتے ہیں۔ والدین کا رویہ اور طرز زندگی بچوں کی شخصیت بنانے میں مددگار رہتا ہے۔

☆☆......☆☆

نوٹ: اپنا مسئلہ بھیجتے ہوئے لفافے کے ایک کونے پر ''نفسیاتی مسائل'' ضرور لکھیں تا کہ آپ کے خطوط براہِ راست متعلقہ شعبے تک پہنچائے جا سکیں۔
خط و کتابت کے لیے:
88-C II۔ خیابانِ جامی۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7۔ کراچی

کچن کارنر

نادیہ طارق

قارئین! اس ماہ نئے سال کی آمد پر ہمیشہ کی طرح سردیوں کا راج ہوگا۔ اس ٹھنڈے موسم میں جہاں کچن میں جا کر کام کرنا خواتین کے لیے ایک امتحان ہوتا ہے، وہیں کھانوں کا انتخاب اس سے بھی بڑا امتحان۔ ہم اس ماہ آپ کے اس امتحان کے لیے موسم کی مناسبت سے کچھ منفرد اور آسان ڈشز کی تراکیب لائے ہیں۔ آزمائیے اور داد پایئے۔

ناریل قیمہ

اجزاء

قیمہ	ایک کلو
پیاز	چار عدد
ادرک لہسن	دو چمچے
ہلدی	ایک چمچہ
پسی مرچیں	ایک چمچہ
کالی مرچیں	تین یا چار عدد
الائچی	دو عدد
لونگیں	چار عدد
دار چینی	ایک عدد
نمک	حسب ذائقہ
تیل	ایک پیالی
ناریل	آدھا پاؤ

ترکیب:

ایک دیگچی میں تیل ڈالیں پھر اس میں کڑھی پتہ ڈال کر میتھی دانہ، سونف، پسی مرچیں، ہلدی شامل کرلیں پھر اس میں تمام کٹی ہوئی سبزیوں کو ڈال کر اچھی طرح بھونیں اور ٹماٹر بھی ساتھ میں شامل کرنے کے ساتھ ساتھ تھوڑا سا پانی بھی ڈالیں اور پھر نمک شامل کر کے 15 منٹ تک اچھی طرح بھونیں اور پھر 10 منٹ کے لیے ڈھکن ڈھک دیں اور دس منٹ کے بعد چولہا بند کر کے اتار لیں اور سجانے کے لیے اوپر سے ہرا دھنیا اور ہری مرچیں ڈال کر پیش کریں۔

قیمہ بھری شملہ مرچ

اجزاء

قیمہ	آدھا کلو
پیاز	دو عدد درمیانی
ادرک لہسن	ڈیڑھ چائے کا چمچہ
شملہ مرچ	آدھا کلو
ہری مرچیں	تین چار عدد
ہرا دھنیا	ایک گڈی
ٹماٹر	تین عدد
نمک	حسب ضرورت
پسی لال مرچ	ڈیڑھ چائے کا چمچہ
تیل	دو کپ
پسا گرم مسالا	آدھا چمچہ
دہی	آدھا کلو
ہلدی	آدھی چمچی

ترکیب:

سب سے پہلے قیمہ دھو کر رکھ لیں۔ پھر ایک دیگچی میں تیل ڈال کر اس میں پیاز شامل کر دیں۔ اور اس میں پسا ہوا ادرک لہسن شامل کر کے اچھی طرح بھونیں اور تھوڑا سا پانی ڈال کر اچھی طرح ڈھک کر گلنے دیں۔ مزید

پندرہ منٹ کے بعد ڈھکن ہٹا کر پھر بھونیں۔ جب یہ روغن چھوڑ دیں تو اُتار لیں۔ اب دوسری طرف شملہ مرچ کی اوپر کی سطح الگ کرلیں تا کہ اس میں قیمہ بھرا جا سکے۔ تمام شملہ مرچ میں قیمہ بھر دیں پھر جو قیمہ باقی رہ جائے گا اس کو شملہ مرچ کے اوپر سے ڈال کر دم پر رکھ دیں اور پندرہ سے بیس منٹ بعد چولہا بند کر کے اتار کر اس میں ہری مرچیں اور دھنیا سجاوٹ کے طور پر ڈال دیں اور کسی ڈش میں نکال کر پیش کریں۔

چکن شعلہ

اجزاء

چکن بون لیس	ایک کلو
ثابت گرم مسالا	ایک چمچہ
ادرک لہسن	دو یا تین چائے کے چمچے
کُٹی مرچ	ایک چائے کا چمچہ
دھنیا	آدھا چائے کا چمچہ
ہری مرچ	چھ سے سات عدد
ہرا دھنیا	ایک گڈی
دال ماش	ایک کپ
پیاز	دو عدد
چاول	ایک کپ
ہلدی	آدھا چمچہ
دلیہ	آدھا کپ
تیل	ایک کپ

ترکیب:

ایک دیگچی میں تیل ڈال کر پیاز کو فرائی کرلیں۔ اب اس میں ادرک لہسن ڈال کر اور اس میں تمام مسالے شامل کر دیں اور پھر چکن کو بھی اس کے ساتھ ملا کر اچھی طرح بھونیں۔ اس میں ماش کی ابلی ہوئی دال، چاول اور دلیہ بھی شامل کر کے مکس کرلیں اور چھ سے سات گلاس پانی ڈال کر ہلکی آنچ پر پکنے دیں۔ پھر کم از کم آدھے گھنٹے کے بعد ڈھکن کھول کر تمام چیزوں کو اچھی طرح مکس کرلیں۔ جب یہ مکمل طور پر تیار ہو جائے تو ہرا دھنیا، پودینہ اور ہری مرچ ڈال کر پیش کریں۔

تواشامی کباب

اجزاء

قیمہ	آدھا کلو
چنے کی دال	ایک کپ
تیزپات	دو عدد
دارچینی	دو عدد
لونگ	12 سے 14 عدد
کُٹی ہوئی کالی مرچ	12 سے 15 عدد
ثابت سرخ مرچ	دس عدد
لہسن کے جوئے	بیس عدد
باریک کٹی ہوئی ادرک	دو کھانے کے چمچے
براؤن پیاز	چار کھانے کے چمچے
بڑی الائچی	سات عدد
زعفران	ایک چٹکی
کدوکش کیا ہوا کھویا	تین کھانے کے چمچے
کیوڑا	چند قطرے
تیل	حسبِ ضرورت

ترکیب:

دال کو صاف کر کے تیس منٹ کے لیے پانی میں بھگو دیں، ایک دیگچی میں ڈیڑھ کھانے کا چمچہ تیل گرم کرنے کے بعد ثابت گرم مسالا ڈالیں۔ مسالے کی خوشبو آنے کے بعد ادرک، لہسن ڈال کر بھون کر اتنا پانی ڈالیں کہ دال بالکل گل جائے، پانی خشک ہونے کے بعد اسے بھونیں۔ قیمے کو ٹھنڈا کر کے پیس لیں۔ اب اس میں کھویا، انڈا، کیوڑا، اور زعفران گھول کر ملائیں اور ان کی گول ٹکیاں بنالیں، توے پر تھوڑا سا تیل گرم کر کے اس میں کباب تلیں۔ چٹنی، سلاد، لیموں اور نان کے ساتھ پیش کریں۔

سیخ کے چٹ پٹے کباب

اجزاء

قیمہ	ایک کلو
سونٹھ	چھ گرام
سونف (بھنی ہوئی)	چھ گرام

سفید زیرہ (بھنا ہوا)	چھ گرام
سرخ مرچ	چار گرام
دار چینی	تین گرام
بڑی الائچی	چار گرام
کالی مرچ	دو گرام
پیاز	پچاس گرام
انجیریا کچری	چار گرام
گھی	100 گرام
نمک	حسب ضرورت

ترکیب:

تمام مسالا پیاز کے علاوہ سوکھا پیس لیں اور قیمے میں ملا دیں۔ بعدازاں قیمے میں ایک جلتا ہوا کوئلہ رکھ کر اور کوئلہ پر ایک چمچہ گھی ڈال کر پتیلی کا ڈھکن بند کردیں تاکہ دھواں باہر نہ نکلے۔ دو گھنٹے بند رہنے کے بعد قیمے میں پیاز، گھی میں سرخ کر کے سیخوں پر چڑھا کر کوئلوں کی آنچ پر سینک لیں۔ کباب سینکتے وقت سیخوں پر تھوڑا تھوڑا سا گھی ڈالتے رہیں۔ جب کباب سرخ ہو جائیں تو سیخوں سے نکال کر گارنش کے لیے پیاز کے باریک لچھے اور کھٹائی کی چٹنی چھڑک دیں۔

تل اور آلو کے بالز

اجزاء

آلو (ابال کر بھرتہ بنالیں)	دو پیالی
مرغی (ابلی اور ریشہ کی ہوئی)	ایک پیالی
سفید تل	چوتھائی پیالی
نمک	ایک چائے کا چمچہ
کالی مرچ (پسی ہوئی)	ایک چائے کا چمچہ
انڈے کی زردی	ایک عدد
ہرا دھنیا (چوپ کیا ہوا)	چوتھائی گڈی
ڈبل روٹی کا چورا	حسب ضرورت
میدا	حسب ضرورت
انڈا	ایک عدد

ترکیب:

ایک پیالے میں آلو، مرغی، کالی مرچ، انڈے کی زردی اور ہرا دھنیا ڈال کر ہاتھوں کی مدد سے یکجان کر لیں۔ ایک پلیٹ میں ڈبل روٹی کا چورا لے کر اس میں سفید تل ڈال دیں۔ ایک علیحدہ پلیٹ میں میدا لے لیں اور پیالے میں انڈا پھینٹ لیں۔ آلو کے آمیزے کی چھوٹی چھوٹی بالز بنالیں۔ ان بالز کو سب سے پہلے میدے، پھر انڈے اور اس کے بعد ڈبل روٹی کے چورے میں لپیٹ لیں۔ فرائنگ پین میں تیل گرم کریں اور ایک، ایک کر کے تل والی بالز اس میں ڈال کر سنہری رنگ آنے تک تلیں۔ ان بالز کو چٹنی کے ہمراہ گرما گرم پیش کریں۔

قیمے کا سینڈوچ

اجزاء

ڈبل روٹی کے سلائسز (بڑے)	چار عدد
قیمہ (بھنا ہوا)	آدھا کپ
پنیر	ایک سلائس
میونیز (چکن سپریڈ)	دو چائے کے چمچے

ترکیب:

ڈبل روٹی کے کنارے کاٹ لیں۔ ایک سلائس پر پنیر رکھ دیں۔ اس پر دوسرا سلائس رکھیں اور اس پر قیمہ پھیلا دیں۔ قیمے پر ایک اور سلائس رکھیں اور چکن اسپریڈ اچھی طرح پھیلا دیں۔ اس پر سلائس رکھ کر بند کردیں اور سینڈوچ میکر میں رکھ کر بیک کر لیں۔ کیچپ کے ساتھ یا چٹنی کے ساتھ سرو کیا جا سکتا ہے۔

میٹھے سموسے

اجزاء

تیل	تلنے کے لیے
سوجی	چار کھانے کے چمچ
کھوپرا (پسا ہوا)	چار کھانے کے چمچ
بادام (پسا ہوا)	12 عدد
پستے	12 عدد
چینی	حسب ضرورت
سموسوں کی پٹیاں (مانڈے)	ایک درجن

ترکیب:

سب سے پہلے تمام اجزاء کو ایک پیالے میں اچھی طرح مکس کر لیں۔ اب پٹیوں میں تیار کیا ہوا مکسچر ڈال کر اچھی طرح سموسوں کی شکل میں باندھ لیں اور پھر تیل میں فرائی کریں۔ گرم گرم میٹھے سموسے تیار ہیں۔ ☆☆☆

حکیم جی!

محمد رضوان حکیم

ساتھیو! اکثر ہمیں کسی ایسی بیماری سے سامنا کرنا پڑتا ہے جس کے لیے ہمیں سمندر کی تہہ یا آسمان کی بلندیوں، جنگل بیابانوں یا پہاڑوں تک پر جانا پڑ جاتا ہے مگر...... جان ہے تو جہان ہے۔ خدا اگر بیماری دیتا ہے تو اُس نے شفاء بھی دی ہے۔ قدرت کے طریقۂ علاج کا آج بھی کوئی مول نہیں۔ حکمت کو آج بھی روزِ اول کی طرح عروج حاصل ہے۔ اسی لیے طبیب اور حکیم صاحبان کو خدائی تحفہ کہا جاتا ہے۔ آپ کی صحت اور تندرستی کے لیے ہم نے یہ سلسلہ بعنوان 'حکیم جی' شروع کیا ہے۔ اُمید ہے ہمارے مستند اور تجربہ کار حکیم صاحب آپ کی جملہ بیماریوں کے خاتمے کے لیے اہم کردار ادا کریں گے۔ نیا سلسلہ حکیم جی! آپ کو کیسا لگا؟ اپنی آراء سے ضرور آگاہ کیجیے گا۔

نزلہ زکام:

اس مرض میں ناک کی اندرونی لعاب دار جھلی متورم ہو جاتی ہے اور ناک بہنا شروع ہو جاتی ہے ۔یہ ایک چھوت دار مرض بھی ہے اس مرض کے ابتداء میں طبیعت سست رہتی ہے پیشانی پر جکڑن اور بوجھ محسوس ہوتا ہے۔ سر میں بھی کم اور بھی زیادہ درد ہوتا ہے۔ چھینکیں آتی ہیں حلق میں درد ہوتا ہے ۔حلق کے اندر سے سورخ ختم ہو جاتی ہے پیاس بہت لگتی ہے بھوک کم ہو جاتی ہے دو یا تین دن کے بعد رطوبت گاڑھی ہو جاتی ہے یہ ایک معتدی

مرض ہے جب کہ بعض خاندانوں میں یہ مرض موروثی بھی ہوتا ہے۔

کھانسی:

کھانسی کی کوئی ایک مخصوص وجہ نہیں ہوتی اور نہ ہی کوئی مخصوص موسم ہوتا ہے جب کہ عام طور پر سردی کے موسم میں بوڑھے اشخاص اس مرض میں زیادہ مبتلا ہوتے ہیں کھانسی کا مرض پیدا کرنے میں عام طور پر گردوغبار، دھواں، زیادہ ترش غذا کا استعمال، زیادہ ٹھنڈا پانی پینا وغیرہ معاون ہوتا ہے۔

ٹھنڈ:

ٹھنڈ کا لگنا عام طور پر انسان کو سینے کے امراض میں مبتلا کر دیتا ہے جس کے باعث نزلہ زکام اور کھانسی جیسے امراض پیدا ہو جاتے ہیں ٹھنڈ لگنے کی وجوہات میں عام طور پر سردی کے موسم میں احتیاط نہ کرنا، سرد ہوا میں چلنا پھرنا، گیلی زمین پر بیٹھنا، پانی میں بھیگ جانا رات کو دیر تک سردی میں رہنا، گرم گرم کھانا کھا کر ٹھنڈا پانی پینا وغیرہ شامل ہیں۔

اگر مذکورہ بالا ان جملہ امراض کا بروقت اور مناسب علاج نہ کیا جائے تو مریض کے اندرونی اعضاء شدید متاثر ہو جاتے ہیں اسمرض میں سب سے پہلے پھیپھڑے اور گردے شدید متاثر ہوتے ہیں مریض سانس کی تکلیف میں مبتلا ہو جاتا ہے جو اس کے لیے شدید تکلیف کا باعث بن جاتا ہے۔

نسخہ:

ملیٹھی لکڑی	10 گرام
بی دانہ	10 گرام
پرسیاؤشاں	10 گرام
تخم خبازی	10 گرام
تخم خطمی	10 گرام
سپستاں (لسوڑہ)	10 گرام
عناب	10 گرام
پوست خشخاش	10 گرام
رب السوس	10 گرام
کتیرا	10 گرام
کیکر کا گوند	10 گرام
مغز بادام شیریں	10 گرام
فلفل سفید	10 گرام
فلفل دراز	10 گرام
دار چینی	10 گرام

ترکیب:

تمام چیزیں پیس کر ہم وزن شہد ملا کر معجون تیار کریں۔ ایک ایک چائے کا چمچہ صبح و شام پانی سے کھائیں۔

☆☆......☆☆

ادارک کے خواص:

ادرک کے بہت سے معالجاتی استعمالات ہیں۔ یہ نظام تنفس کو مستحکم کرنے اور اس کی خرابیوں کو دور کرنے کے لیے استعمال کی جانے والی ایک شاندار بوٹی ہے۔ علاوہ ازیں یہ نزلہ زکام، نظام ہضم کی خرابی اور عمومی گراوٹ کے علاج کے لیے مفید ہے۔ اسے عورتوں کے اندرونی مسائل اور کیموتھراپی کے نتیجے میں پیدا ہونے والی گراوٹ کو دور کرنے کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

ادرک میں جو اجزا شامل ہوتے ہیں وہ Congestation کو دور کرتے ہیں، گلے کی خراش کو ٹھیک کرتے ہیں اور سر کے درد نیز جسم کے درد کو آرام پہنچاتے ہیں۔ ادرک کو اگر دوسری بوٹیوں کے ساتھ شامل کیا جائے تو یہ ان کی اثر انگیزی میں اضافہ کر دیتی ہے۔ ادرک کو دورانِ حمل صبح کے وقت گراوٹ اور ہاضمے کی تکالیف کے علاج کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ دورانِ حمل نزلہ زکام اور گلے کی خراشوں کے لیے بھی ادرک مفید ہے۔

آپ کے جانے پہچانے اسکن اسپیشلسٹ **ڈاکٹر خرم مشیر**

ہر ماہ آپ کی بیوٹی سے متعلقہ مسائل کے حل کے ساتھ

سب سے پہلے آپ کو نیا سال مبارک۔ اس سال کی شروعات میں ہم قارئین بہنوں کے ایک بہت اہم مسئلے پر روشنی ڈالیں گے اور وہ ہے ویکس۔

چہرے کے بدنما روئیں کو ختم کروانے کے ویسے تو بہت سے طریقے سامنے آچکے ہیں لیکن آج بھی زیادہ تر خواتین بلیچ یا ویکس پر زیادہ بھروسہ کرتی ہیں۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ طریقے سستے بھی ہیں اور آزمودہ بھی لیکن ان طریقوں کے بارے میں عام غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں، جنہیں دور کرنا ضروری ہے۔ سب سے بڑی غلط فہمی یہ ہے کہ بلیچ کرنے سے چہرے کا روّاں بڑھ جاتا ہے۔ یہ خیال بالکل غلط ہے۔ دراصل روّاں بلیچ سے نہیں بلکہ گھٹیا قسم کی بلیچ کے استعمال سے بڑھ سکتا ہے۔ اچھی اور معیاری کریمیں نہ صرف روئیں کی Growth میں کسی قسم کا فرق نہیں ڈالتی ہیں بلکہ آپ کی جلد پر بھی اِن کے استعمال سے کوئی منفی اثر دکھائی نہیں دیتا۔ جس کے برعکس گھٹیا کوالٹی کی بلیچ کریم کا استعمال چہرے پر فاضل روؤیں کی تہہ کو رنگت کی بدنما تبدیلی سے واضح کر دیتا ہے اور سانولی رنگت دھبے دار دکھائی دیتی ہے جب کہ گوری رنگت سانولی ہو جاتی ہے۔

بلیچ کریم کے استعمال سے قبل کسی چکنی چیز (مثلاً لوشن یا کریم) کے استعمال سے جلد بلیچ کے منفی اثرات سے بڑی حد تک بچ سکتی ہے۔

بلیچ کے لیے پاؤڈر کی مقدار روویں کے رنگ اور Thickness کی مناسبت سے ڈالی جاتی ہے۔ اگر آپ کے چہرے پر زیادہ روّواں ہے تو ایک حصہ پاؤڈر اور تین حصے کریم ملا کر پندرہ منٹ کے لیے لگانا کافی ہوگا۔ کم رووئیں کی صورت میں پاؤڈر کی مقدار کم کر دیں اور کریم کی مقدار وہی رکھیں۔ چہرے کے جن حصوں پر رووّاں بالکل موجود نہیں، وہاں صرف کریم استعمال کی جائے پاؤڈر شامل کرنے سے دھبے پڑنے کا خطرہ ہے۔ ویکس کا استعمال عموماً ہاتھوں اور پیروں پر سے رووئیں اتارنے

کے لیے کیا جاتا ہے۔

ویکس تین کی اقسام ہوتی ہیں:

☆کولڈ ویکس Cold Wax

☆ہاٹ ویکس Hot Wax

☆اسٹرپ ویکس Strip Wax

عام ویکس:

عام ویکس (جسے کولڈ ویکس کہتے ہیں) کا طریقہ استعمال یہ ہے کہ کسی چھوٹے سخت کپڑے کے ٹکڑے (مثلاً جینز یا اسی قسم کا کپڑا) پر ویکس لگا کر بالوں کی سمت میں ہاتھوں کو دباتے ہوئے کپڑا ہاتھ پر چپکا دیں۔ پھر جس جگہ سے روواں نکالنا ہو صرف اسی حصے کی جلد کو اچھی طرح کھینچ لیں اور مضبوطی سے دباتے ہوئے کپڑے کو مخالف سمت میں تیزی سے اتار لیں۔ جلد کو کھینچنا بہت ضروری ہے۔ ورنہ جلد کے پھٹنے یا نیل پڑنے کا خطرہ ہے۔ کولڈ ویکس روواں صاف کرنے کا آسان طریقہ ہے لیکن غلط سمت میں بال اکھڑنے سے یا زیادہ مقدار میں ویکس لگ جانے کی صورت میں آپ نقصان اٹھا سکتی ہیں۔

ہاٹ ویکس:

ہاٹ ویکس عموماً چہرے کے روویں کو صاف کرنے کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ یہ ویکس کیمیکل کی ٹکیوں کی شکل میں دستیاب ہوتی ہے۔ جسے ہم ''ویکس ٹیبلٹ'' کہتے ہیں۔ ان ٹیبلیٹس کو کسی برتن میں گرم کر کے پگھلا لیا جاتا ہے اور لکڑی کی مدد سے پگھلائی ہوئی ویکس روویں پر لگا کر ایک منٹ کے اندر اندر جمنے پر فوراً اتار لی جاتی ہے۔ اس طریقے میں کپڑے یا کاغذ کا استعمال نہیں کیا جاتا۔ ہاٹ ویکس دیرپا ہوتی ہے اور اس طریقے سے بال نکلواتے ہوئے تکلیف بھی کم محسوس ہوتی ہے۔ لیکن یہ کیمیکل گرم استعمال کیا جاتا ہے اس لیے اس کے استعمال کے لیے صرف پروفیشنل بیوٹیشن (جو اس کام میں ماہر ہو) کی مدد لی جائے۔ خود اس طریقے سے ویکس کرنے سے کھال ادھڑنے کا بھی خطرہ ہے اور جلد کے جلنے کا بھی امکان ہے۔

بڑے پارلرز میں اس قسم کے ویکس کے استعمال کا خاص آلہ استعمال کیا جاتا ہے، جس کے ذریعے ویکس گرم بھی کی جاتی ہے اور صاف بھی ہو سکتی ہے۔ پتیلی یا پین میں گرم کی جانے والی ویکس کی صفائی ممکن نہیں ہوتی جس کی وجہ سے جلد کی بیماریوں کے پھیلنے کا امکان رہتا ہے۔

اسٹرپ ویکس:

یہ ویکس صرف ایسی جلد پر استعمال کی جاتی ہے جو انتہائی حساس ہو یا پھر اسے چھوٹی بچیوں کے چہرے پر استعمال کیا جاتا ہے جن کی جلد پر عام ویکس کا استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ویکس با آسانی دستیاب نہیں اور اگر بازار سے مل بھی جائے تو بہت مہنگی ہونے کی وجہ سے ہاتھوں یا پیروں پر استعمال نہیں کی جاتی۔

اس ویکس کا طریقہ استعمال بہت سادہ ہے۔ روویں کے رخ پر آپ اس کی پٹیاں رکھیں اور مخالف سمت کھینچ لیں۔

☆☆......☆☆